اسلامی اور بین الاقوامی قانون کا تقابلی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی

ترجمہ

مولانا حکیم اللہ

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

بین الاقوامی تعلقات

اِسلامی اور بین الاقوامی قانون کا تقابلی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی

ترجمہ

مولانا حکیم اللہ

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

نام کتاب: بین الاقوامی تعلقات
اسلامی اور بین الاقوامی قانون کا تقابلی مطالعہ
مصنف: ڈاکٹر وہبہ زحیلی
اردو ترجمہ: مولانا حکیم اللہ
نظر ثانی: ڈاکٹر غلام مرتضٰی آزاد
سرورق: محمد طارق اعظم
مطبع: ادارہ تحقیقات اسلامی
ناشر: بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد
نگران منشورات: ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین
کمپوزنگ: عمران کمپوزنگ سنٹر، اسلام آباد
طبع: اوّل
سال اشاعت: ۲۰۱۰ء
تعداد اشاعت: ۱۰۰۰ء

ISBN 978-969-8263-60-7

فہرستِ مضامین

پیش لفظ

دور جدید کے قانونی حلقوں میں یہ تصور عام ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کے قواعد وضوابط کی تشکیل و تدوین یورپ کا کارنامہ ہے مشہور آسٹریلوی محقق و قانون دان ڈی ڈبلیو گریگ (D.W.Greig) کے خیال میں یورپی جاگیرداری نظام کے بعد جب قومی سطح پر طاقت کے تصور نے زور پکڑا تو اس کے بعد بین الاقوامی تعلقات کی ضرورت پیش آئی۔ اس میں حالت جنگ اور حالت امن دونوں قسم کے تعلقات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ نپولین کی جنگوں کے بعد سب سے پہلا جو باقاعدہ ضابطہ تشکیل دیا گیا وہ ۱۸۱۵ء میں میثاق ویانا تھا یہ ایک ابتدا تھی اس کے بعد یورپی ممالک کے درمیان معاہدات ایک تسلسل سے جاری رہے ۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۴۹ء میں جینوا کے معاہدے سامنے آئے۔ انہیں معاہدات کی روشنی میں انجمن بین الاقوام اور بعد میں اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ادارہ بین الاقوامی قانون (International Law Commission) کا قیام بھی تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کی دیگر اقوام کے ساتھ جو تعلقات کا نظام جاری فرمایا وہ آج تک دنیا بھر کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس کتاب میں بین الاقوامی قوانین کی تاریخ پر بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ نظام اسلام کی روشنی میں ان کے اصول وضوابط اور پیرائے کا تعارف مقصود ہے۔ اسی تعارف میں اسلام کے بین الاقوامی تعلقات کے نظام کا جدید بین الاقوامی قانون سے موازنہ بھی شامل ہے ۔

حال ہی میں دنیا میں جو نئے جغرافیائی، فکری اور سیاسی تغیرات وقوع پذیر ہو رہے ہیں ان کے اثرات دنیا کے مختلف ممالک و اقوام پر پڑ رہے ہیں۔ انہی اثرات کے تحت بعض نئی اصطلاحات بھی متعارف ہو رہی ہیں۔ ان میں ایک نمایاں اصطلاح

عالمی گاؤں (گلوبل ولیج) ہے۔ ان اصطلاحات کی بھرپور تشہیر اور تعارف کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات کا نظام ایک نئی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس بارے میں قوانین، ضابطے اور عرف نئے نئے مفاہیم کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں۔ یہ تو ایک فطری بات ہے کہ مختلف مزاج اور مختلف پس منظر رکھنے والے لوگوں کے مختلف گروہ اپنے اپنے عرف و عادات اور اپنے اپنے رسم و رواج میں رہنے کو ہر حال میں ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی بھی قوم دیگر اقوام کے ساتھ باہمی تعلقات کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اپنے اور پرائے کا احساس بھی کسی نہ کسی صورت میں ہر معاشرے میں موجود رہتا ہے۔ بین الاقوامی طور پر بھی دنیا کی ہر قوم اور ہر نظام کے ماننے والوں کا یہ حق ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے کہ جب وہ اپنے لیے بین الاقوامی تعلقات کا نظام تشکیل دیں یا بین الاقوامی لین دین کے لیے قواعد وضوابط مرتب کریں تو اپنے اور پرائے کا فرق ملحوظ رکھیں۔ یہ بات انسان کے مزاج میں شامل ہے کہ وہ اپنے اور پرائے میں بہرحال فرق رکھتا ہے۔ جو تعلقات اپنوں سے رکھے جاتے ہیں بالکل وہی پرایوں سے نہیں رکھے جا سکتے۔ اسلام چوں کہ دینِ فطرت ہے اور اس کا پیغام بھی ایک عالمی پیغام ہے، اس مناسبت سے اسلام میں بھی بین الاقوامی تعلقات پر مشتمل ہدایات، قواعد وضوابط اور صدیوں کے تجربات پر مشتمل ایک اچھا اور قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔ یوں تو اسلام کے نظام بین الاقوامی تعلقات کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ اس نے انسانوں کے درمیان پریشان کن نسلی، لسانی اور فرقہ وارانہ امتیازات کی حتی الامکان حوصلہ شکنی کی ہے۔ مگر جہاں فطرت ایسے کسی فرق کی متقاضی تھی وہاں اسلام نے اس فرق کو باقی رکھتے ہوئے معاشرے کے لیے اس کے فائدے کو بیان کر دیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ (اے لوگو! ہم نے

تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ خوب علم رکھنے والا اور خوب خبر رکھنے والا ہے۔

جدید دنیا میں بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد کا تعین اور اس کے قواعد وضوابط کی تشکیل تو کچھ ہی عرصہ پہلے ہوئی مگر اسلام نے قرآن مجید میں جگہ جگہ یاایھاالناس کے خطاب سے آج سے پندرہ صدیاں قبل ہی اس کی طرح ڈال دی تھی۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کے ساتھ ہی اسلام کے نظام بین الاقوامی تعلقات کے خدوخال واضح ہوتے چلے گئے۔ یہ بات وہاں بھی ملحوظ خاطر رہی کہ اپنے اور پرائے میں فطری فرق نمایاں رہے مگر اس فرق کا مطلب ظلم، نا انصافی اور دھوکا فریب ہرگز نہ تھا۔ قرآن مجید میں یاایھاالناس (اے لوگو) اور یاایھاالذین اٰمنو ا (اے ایمان والو) کے خطاب میں اس کی واضح مثال ملتی ہے۔ گویا اقوام کی تقسیم اسلام کی نظر میں رنگ نسل یا رسم و رواج کی بنیاد پرنہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی جانے والی ہدایت کو اپنانے یا نہ اپنانے کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ ہدایت ربانی کی آمد کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک تسلسل سے جاری رہا جس کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجتے وقت یہ ارشاد فرما کر رکھی گئی: ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [البقرة ۲:۳۸] (ہم نے کہا: تم سب اس سے نیچے اتر جاؤ، پھر جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے گی تو جس کسی نے میری ہدایت کی پیروی کی تو ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا، نہ ہی وہ غمگین ہوں گے)۔ یہ سلسلہ تمام انبیاء اور رسل کے توسط سے چلتا رہا اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے پر ختم ہوا۔ چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [۵:۳] (آج کے دن

میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا ہے) اسی اصول کو اسلام نے امت کی بنیاد قرار دیا مگر چوں کہ اسلام کے مقابلے میں متعدد افکار، نظریات اور عقائد پر مشتمل دینی نظام دنیا میں رائج تھے اس لیے کمال حکمت کے تحت ان اقوام عالم کے ساتھ تعلقات کے تفصیلی اصول وضوابط مقرر کیے گئے۔ ان اصول وضوابط کی بنیاد یہ تھی کہ پوری دنیا کے انسانوں میں تعلقات کی اصل بنیاد حالت امن ہے مگر اختلاف، کشمکش اور جنگ کی صورت میں ان کے روابط میں کشیدگی اور عداوت کو کم سے کم کرنے اور حالت امن کو بحال کرنے کے لیے ضروری اصول وقواعد متعارف کرائے جائیں۔ چناں چہ ہجرت مدینہ کے فوراً بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل حالت امن کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلی مملکت کا جو پہلا دستور دیا اس میں دو چیزیں نمایاں تھیں۔ ان میں سے ایک کو مؤاخات مدینہ اور دوسری کو میثاق مدینہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دونوں کی تفصیلات آج تک لفظ بلفظ محفوظ ہیں۔ مؤاخات میں بحیثیت قوم مسلمانوں کے آپس کے تعلقات کا نظام وضع کیا گیا اور میثاق میں مدینہ اور اردگرد کے یہودیوں اور دیگر اقوام کے ساتھ تعلقات کے اصول مرتب کیے گئے، جس میں ان تمام اقوام کو مکمل طور پر مذہبی اور معاشی خودمختاری دی گئی، مگر دفاع اور ریاست کے تحفظ کے معاملات کو وفاقی نظام کے تحت مربوط کیا گیا۔ پھر جب اہل مکہ کی طرف سے جارحیت اور مدینہ کی کچھ اقوام کی طرف سے ان کے ساتھ خفیہ ساز باز کے معاملات پیش آئے تو اسلام کے بین الاقوامی تعلقات کے اصول وضوابط مزید نکھرتے چلے گئے۔ یہ اسلام کی انسان دوستی کا بے مثال ثبوت ہے کہ اس نے ہر حال میں امن قائم رکھنے کے لیے ظلم و جبر کی بنیاد پر نہیں صلح وآشتی اور عدل وانصاف کے ذریعے لوگوں کو ایک دوسرے سے مربوط رکھنے کا نظام دیا۔ چناں چہ اسلام میں حالت امن اور حالت جنگ دونوں میں بین الاقوامی تعلقات کے الگ الگ اصول موجود ہیں جو صدیوں تک عملی تجربے

سے گزر کر اپنی کامیابی اور انسان پروری کا سکہ منوا چکے ہیں۔ البتہ آج کے قانون بین الممالک میں بھی دائرہ کار یا دائرہ اختیار (Jurisdiction) کی بحث بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام نے اس کو اپنے پر امن مزاج کی روشنی میں مرتب کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں دارالاسلام، دارالحرب، دارالکفر، دارالصلح اور دارالعہد وغیرہ کی اصطلاحات جا بجا ملتی ہیں۔

اسلام کا نظام بین الاقوامی تعلقات زبانی جمع خرچ کی بجائے ٹھوس حقائق، صدیوں کے تجربات اور عملی کامیابی کے ساتھ نمایاں اور ممتاز رہا ہے۔ اس موضوع پر ایک وسیع اور ضخیم لٹریچر اس کا دستاویزی سرمایہ ہے۔ میثاق مدینہ لفظ بلفظ کتب تاریخ و سیر کی زینت ہے جسے دور حاضر کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے دفعہ وار انگریزی ترجمے کے ساتھ (The First Written Constitution in the World) کے عنوان سے بڑی علمی تحقیق کے ساتھ شائع کرایا جو کتب خانوں اور بازارِ کتب میں موجود ہے۔ پھر سیر کے نام سے علامہ واقدی کی کتاب سے لے کر امام ابو حنیفہؒ، امام زید بن علی بن سیدنا حسینؓ سے ہوتے ہوئے سیر اوزاعی، سیر امام محمد اور امام سرخسیؒ کی شرح السیر الکبیر اس سلسلے میں بڑے بڑے نام ہیں، جنھوں نے علمی انداز میں اس فن کو ترقی دی۔ پھر جب دور جدید میں بین الاقوامی قانون کی اصطلاح متعارف ہوئی اس پر بھی مسلم مفکرین نے خوب کام کیا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عامر الزمانی، شریف باسیولی، سہیل ہاشمی، ابراہیم کلین، خالد ابوالفضل، یوسف القرضاوی، مولانا مودودی، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان اور ڈاکٹر وہبہ زحیلی کے نام اس سلسلے میں نمایاں ہیں۔ اگر دور جدید کے قانون بین الممالک پر تصنیفات و تالیفات کا تفصیلی تذکرہ چھیڑ دیا جائے تو مسلم اور غیر مسلم مفکرین کی ایک طویل فہرست تیار ہو جائے گی۔

شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد چوں کہ اسلامی قانون

کے تعارف، آگہی اور اس کے بارے میں تربیت کا ایک متخصص ادارہ ہے، اس لیے دور جدید میں اسلام کے بین الاقوامی قانون پر ڈاکٹر محمود احمد غازی کے خطبات پر مشتمل اسلام کے قانون بین الممالک کی اشاعت اور مقبولیت کے بعد عالم اسلام کے مشہور مفکر اور محقق ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی کتاب العلاقات الدولیة فی الاسلام (مقارنة القانون الدولی الحدیث) کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اکیڈمی کی درخواست پر یہ ترجمہ مولانا حکیم اللہ مرحوم نے کیا، اس کی نظر ثانی ڈاکٹر غلام مرتضیٰ آزاد نے کی اور اس کی حتمی تدوین وتنقیح کا کام اکیڈمی کے رفیق کار ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین نے کیا۔ انہوں نے بڑی محنت سے اس میں بعض ضروری حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اس کام میں اکیڈمی کے معاون تحقیق شمس الحق صاحب کی محنت و کاوش بھی شامل رہی۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی یہ کتاب اسلام کے بین الاقوامی تعلقات کے نظام پر ایک قابل قدر کاوش ہے جس میں اسلامی قواعد وضوابط کا جدید بین الاقوامی قانون کے ساتھ موازنہ بھی شامل ہے۔ یہ بنیادی طور پر ایک تمہید اور دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں حالت جنگ میں بین الاقوامی تعلقات کا تذکرہ ہے۔ اس میں پانچ مباحث کے تحت جنگ کے حالات، اس کی ابتداء اور انتہاء اور قواعد وضوابط کا بیان ہے جبکہ دوسرا باب حالت امن میں بین الاقوامی تعلقات کے اصول وضوابط پر مشتمل ہے۔ اس میں چار مباحث کے تحت اسلام کے مزاج امن، دارالاسلام اور دارالحرب کی تقسیم کی منطق، داخلی اور خارجی خود مختاری اور معاہدوں کے ذریعے بین الاقوامی تعلقات کے قیام کے اصول وضوابط اور عالم اسلام کے عملی تجربات کی تفصیل موجود ہے۔ امید ہے کہ جدید بین الاقوامی قانون کے طلبہ، اساتذہ اور محققین کے لیے اس کتاب کی اردو میں اشاعت بہت مفید ثابت ہوگی۔ وما توفیقی الاّ باللہ۔

محمد یوسف فاروقی

ڈائریکٹر

دسمبر ۲۰۰۹ء

مقدمۂ مؤلف

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

الحمدللہ ربّ العالَمین. وَالصلاۃ والسلام علٰی خاتم الأنبیاء والمرسلین، و علیٰ اٰلہ و صحبہ و من تمسّک بشریعتہ إلی یوم الدین.

أما بعد!

ہمیشہ طاقتور ہی کی بات سُنی جاتی ہے، اسی کی رائے نافذ العمل ہوتی ہے اور اسی کی دہشت ہوتی ہے۔ ریاستوں کے مابین تعلقات ہوں یا جماعتوں اور افراد کے مابین، ہمیشہ طاقت اور اقتدار ہی کی منطق کے زیراثر رہتے ہیں۔ کمزور کی بات کوئی نہیں سنتا، خواہ وہ کتنا ہی اُونچا بولے، اور کتنی ہی بلند آواز میں بات کرے، اور خواہ وہ حق بجانب ہی ہو، اُسے درخور اعتناء ہی نہیں سمجھا جاتا، چہ جائیکہ وہ اپنے مفادات اور حقوق کا تحفظ کرسکے یا دنیا کے معاملات کو کسی خاص رُخ پر ڈالنے میں کوئی مؤثر اور فعال کردار ادا کر سکے۔

یہ بات ہمارے زمانے میں اور بھی واضح ہے۔ دو بڑی طاقتیں، روس اور امریکہ، ہی دنیا کی سیادت و قیادت کر رہی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تنہا امریکہ ہی ریاستوں کی مشکلات حل کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے اور آخرکار شیر کا حصہ وصول کرتا ہے۔

اس کے باوجود کہ بین الاقوامی معاشرے میں مثالی اصول نافذ العمل ہیں، جہاں سب معاملات انسانی بنیادوں پر چلانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس کی سرپرستی عالمی تنظیمیں کررہی ہیں، پہلے جمعیت اقوام تھی اور اب اقوام متحدہ، مگر بظاہر نظر آنے والے امن کے پس پردہ اب بھی طرح طرح کے خوفناک جنگی وسائل ہیں، جرار لشکر ہیں، تباہ کن ہتھیار ہیں اور ملیامیٹ کر دینے والے ایٹم بم۔

بنابریں قرآن کریم کا مسلمانوں کو مادی اور معنوی قوت تیار رکھنے کی

تاکید کرنا اور جہاد کو اسلام کے کوہان کی چوٹی قرار دینا ایک بالکل درست دعوت ہے، گفتگو کا معیار بھی یہی ہے اور زمینی حقیقت بھی یہی۔

آج جو مسلمانوں کی حالت ہے، کمزوری، انتشار اور پس ماندگی، تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں دنیا کے لیے کوئی کشش نہیں جو اسے ان کی بات سُننے، ان کے نظریات کو سمجھنے اور ان کی شریعت کے احکام کو اختیار کرنے پر مجبور کرے۔

چناں چہ ہم کتنی ہی انسانی اقدار، عمدہ اخلاق اور اعلیٰ و ارفع اصولوں کی بات کریں، اور ہمارے اہل قلم اور محققین امن و جنگ ہر دوقسم کے حالات میں، اخلاقیات، حریتوں کی ضمانت، اور شرفِ انسانی کے تحفظ کے بارے میں اسلامی تفوق کی تصویر کشی پر کتنا بھی زور صرف کرلیں، نتیجہ عدم توجہی، قلت التفات اور بے پرواہی ہی رہے گا۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے اپنے نوجوانوں کا بھی یہی حال ہے جو مغربی ترقی اور ان صنعت کار اقوام کی تہذیب و تمدن سے مرعوب ہیں جو جدید تہذیب اور عصر حاضر کی ٹیکنالوجی کے تخت وتاج کی مالک بنی بیٹھی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہر نظریے اور ہر نظام کو فکری ومادی سہارا درکار ہوتا ہے اور ایسی ناقابل تسخیر قوت کی ضرورت ہوتی ہے جو مملکت کی جغرافیائی سرحدوں، اس کی سرزمین، اس کے دستور، اس کے قوانین اور اس میں قائم نظامِ زندگی کے اصولوں کا دفاع کر سکے۔

اگرچہ لوگوں کے تصورات اور مفاہیم بدل چکے ہیں، ان کے نظامہائے معیشت میں تغیر آچکا ہے، مادیت، مشینی زندگی اور مطلب پرستی کا رجحان غالب ہو چکا ہے، پھر بھی بنی نوع انسان کو قرآنی دستور اور سنت نبوی کی شکل میں موجود آسمانی ہدایت کی شدید ضرورت ہے۔تاکہ مادیت کا بخار کم ہو اور انسان کو سعادت، اطمینان اور خوش حالی نصیب ہو سکے۔ قرآن کریم نے غیر مسلم رعایا اور دارالاسلام کے غیر مسلم باشندگان کے معاملات اور اسلامی ریاست کے دیگر ریاستوں کے ساتھ تعلقات کے اصول بیان کر دیے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ نے ان اصولوں کی وضاحت کر دی ہے۔

یہاں شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں بین الاقوامی تعلقات کے اصول وضوابط

پیش کئے جائیں گے اور جدید بین الاقوامی قانون سے ان کا تقابل کیا جائے گا۔ کوشش کی جائے گی کہ حالت جنگ اور حالت امن دونوں میں بین الاقوامی تعلقات کی تشکیل کے اِسلامی اصولوں کی وضاحت ہوجائے۔ نیز اسلام میں معاہدات کا خصوصی مطالعہ پیش کیا جائے گا، فقہی نقطۂ نظر سے بھی اور تاریخی نقطۂ نظر سے بھی، کہ عہد رسالتؐ، عہد خلافتِ راشدہ اور مابعد کے اسلامی ادوار میں ان معاہدات پر کس طرح عملدر آمد کیا گیا۔

تحقیقی خاکہ

یہ بحث ایک تمہید اور دو ابواب پر مشتمل ہے اور اس کا خاکہ حسب ذیل ہے:

تمہید: اس میں اسلام کے دینی اور سیاسی پہلو کا تعارف ہوگا۔ اِسلام سے قبل اور اسلامی دَور کے سیاسی معاشرے کی اور پھر نظریۂ ریاست کے ظہور پذیر ہونے کے بعد جدید بین الاقوامی معاشرے کی تصویر پیش کی جائے گی۔ یہاں شریعتِ اِسلامیہ کی روشنی میں بین الاقوامی تعلقات کی ترتیب وتشکیل پر بھی گفتگو ہوگی۔

پہلا باب: زمانۂ جنگ میں بین الاقوامی تعلقات کے نظام پر مشتمل ہے۔ اس باب میں پانچ موضوعات ہیں:

۱۔ اسلام کی رو سے جنگ کے محرکات

۲۔ کن حالات میں جہاد کا حکم جاری ہوجاتا ہے؟

۳۔ جنگ کا آغاز

۴۔ جنگ کے ضابطے اور اصول

۵۔ جنگ کا خاتمہ

دوسرا باب: زمانۂ امن میں بین الاقوامی تعلقات کے تذکرے پر مشتمل ہے اور اس میں چار مباحث ہیں:

۱۔ اسلام میں خارجی تعلقات جنگ پر نہیں، امن کی بنیاد پر قائم ہیں۔
۲۔ دنیا کی دو یا تین قسم کی ریاستوں میں تقسیم
۳۔ اسلام میں خود مختاری کا تصور
۴۔ اسلام میں معاہدات کی حیثیت

زیر نظر بحث سے ہم یہ جان لیں گے کہ ماضی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں رائج بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت اپنی حقیقت اور روح کے اعتبار سے آج کے بین الاقوامی تعلقات سے مختلف نہیں تھی خواہ بظاہر یہ ان سے مختلف ہی نظر آئیں۔

مصادر: اس بحث میں حوالہ جات کے لیے عام طور پر تو حواشی میں دیئے گئے مراجع کو دیکھا جا سکتا ہے۔البتہ جہاد، سیرت اور معاہدات سے متعلق موضوعات کے بارے میں بالخصوص درج ذیل مصادر سے مدد لی گئی ہے:

۱. الأحكام السلطانية، الماوردي
۲. بداية المجتهد، ابن رشد
۳. القوانين الفقهية، ابن جُزَيّ
۴. المنتقى شرح الموطأ، سليمان بن خلف بن سعد الباجي
۵. دعائم الاسلام، القاضي نعمان
۶. المهذب، أبو إسحاق الشيرازي
۷. شرح السير الكبير، السرخسي
۸. السيرة النبوية، ابن هشام
۹. البداية والنهاية، ابن كثير
۱۰. تفسير المنار، رشيد رضا (جلد دہم)

تمہید

ا۔ اسلام کی دینی اور سیاسی خصوصیات

فرد اور جماعت کی اصلاح، نیز ریاست اور معاشرتی زندگی کی ہمہ جہت اصلاح کے ذریعے اسلام کا نصب العین چند بڑے بنیادی مقاصد کا حصول ہے تاکہ ایک اچھا معاشرہ وجود میں آئے اور لوگوں کو دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل ہو۔ انہی مقاصد کے حصول کے لیے، اسلام کے مختلف احکام، ایک دوسرے کی تکمیل و تائیدکرتے ہیں۔ یہ باہم دِگر اس طرح پیوست ہیں جیسے جسم اور روح، کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی لیے اسلام ایک ایسا نظام ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کو محیط ہے۔ جہاں تک دنیاوی اَحکام کا تعلق ہے تو ، خواہ ان کا تعلق ریاست کے داخلی امور سے ہو یا خارجی امور سے، ریاست کا اپنا وجود ہو یا کائنات اور زندگی کا سوال، ان سب کا دینی منہج پر چلنا ہی ان کا مرکزی نقطہ قرار پاتاہے۔ اسلام میں ریاست کا کوئی عمل دین سے جدا نہیں ہوتا۔

دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کے تینوں طرح کے تعلقات تشکیل دیتاہے: اس کا تعلق اللہ کے ساتھ، اس کا تعلق اپنی ذات کے ساتھ، اور اس کا تعلق دوسرے انسانوں کے ساتھ یا معاشرے کے ساتھ۔ ریاست کا کام دینی طرز ہائے نظم ونسق کا تحفظ کرنا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں قانون سازی کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے ۔ ان میں عقائد، اخلاقیات، دستور، سیاست، انتظامی معاملات، عدالتی امور، نظریات، حکمتِ عملی، لین دین، معاشرتی امور اور معاشیات سبھی شامل ہیں۔

چناں چہ اسلامی نظام کے اعتبار سے ، یا مسلمان علماء کی نظر میں، دینی امور

اور قانونی ضوابط میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دونوں ہی لازمی ہوتے ہیں کہ ان سے کوئی مفر نہیں۔ ان دونوں کا نفاذ ضروری ہے اور دونوں واجب الاحترام ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بھی حاصل ہو اور انسانی مفادات بھی۔ بندوں کی طرف سے ان احکام کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کا کوئی ذاتی مفاد نہیں، نہ ہی کسی نافرمانی، خلاف ورزی یا حدود اللہ کے نفاذ سے فرار سے کوئی اسے نقصان پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَه﴾ (جو اللہ کے حدود کو پھلانگے گا تو اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا)۔ پھر امت کے اجتماعی وجود، ریاست اور اس کے عمومی منصوبوں سے متعلقہ امور کا تحفظ لوگوں کے انفرادی حقوق سے زیادہ اہم ہے۔

دنیا کے لیے کام کرنا بھی اسی قدر ضروری ہے جس قدر آخرت کے لیے عمل کرنا، تاکہ دنیوی اور اخروی دونوں زندگیاں اچھی ہو جائیں۔ جب مسلمان نیک اعمال کرنے میں مستغرق ہو جائے، زندگی بھر نیکی، بھلائی اور احسان کے کام کرے اور ہر طرح کے برے اور بگاڑ کے کاموں سے بچا رہے، اللہ کے دین سے بغاوت اور روگردانی بھی نہ کرے تو وہ زمین پر اللہ کے پیغام کے نفاذ کی واضح علامت بن جاتا ہے، اور اس بات کا عنوان بن جاتا ہے کہ انسان کی حالت اچھی ہے، اللہ تعالیٰ کی جو امانت اس کے ذمے تھی، ادا ہورہی ہے، اور جس بات کا اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکلّف بنایا گیا تھا وہ اسے پورا کررہا ہے۔ اسی طرزِ عمل سے وہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو زمین میں عادِل خلیفہ ہونے کا جو منصب سونپا گیا تھا، وہ اس منصب کے تقاضے پورے کررہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد:

﴿وَابْتَغِ فِيْمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَاتَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ [سورۃ القصص: ۷۷]

اور جو (مال) تمہیں اللہ نے دیا ہے اس سے آخرت کی بھلائی طلب کرو اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھولو۔ اور جیسی اللہ نے تم سے

بھلائی کی ہے،ویسی تم بھی بھلائی کرو۔ اور طالب فساد نہ ہو۔
کیوں کہ اللہ زمین میں فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

میں انسانوں کے لیے نیک اعمال کے طریق کار کی وضاحت کر دی اور ایسے تمدن کے بنیادی خد وخال بیان کردیے جس کا دنیا میں غور وفکر، منصوبہ بندی، محنت اور قربانی کی بنیاد پر قیام و استحکام ضروری ہے۔ زندگی کے اسی بلندتر تصور کی تائید حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی: **خير كم من لم يترك آخرته لدنياه، ولا دنياه لآخرته، ولم يكن كلًّا على الناس**۔(۱)(تم میں سے زیادہ اچھا وہ ہے جو نہ دنیا کی خاطر آخرت کو چھوڑے، اور نہ آخرت کے لیے دنیا کو، اور نہ لوگوں پر بوجھ بنا رہے)۔

چوں کہ سیاسی اقتدار کے بغیر کسی بھی منظّم جماعت کے لیے نہ زندہ رہنا ممکن ہے ، نہ اس کی بقا کی ضمانت دی جا سکتی ہے اور نہ ہی اقدار، عقائد، اخلاقیات اور کمالات کا تسلسل قائم رہ سکتا ہے، اسی لیے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا وجود بھی دورِ جدید کے تصورِ ریاست کے مطابق اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ منسلک ہوگیا۔ اس ریاست کے عناصر یہ تھے: قوم، ملک یا علاقہ اور سیاسی خود مختاری یا اقتدار۔

چناں چہ مسلمان اس ریاست کی قوم تھے، مدینہ اور آس پاس کے علاقے ان کا وطن تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حاکم اعلیٰ تھے۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیک وقت دو حیثیتیں تھیں: نبی اور رسول کی حیثیت سے وہ اللہ کے دین کے مبلغ تھے، جب کہ حاکم کی حیثیت سے آپؐ سیاسی اور حکومتی اختیارات کے مالک تھے۔

ان ہی حیثیتوں کی وجہ سے آپؐ ایک طرف مسلمانوں کے عام معاملات کا انتظام وانصرام کرنے میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے، خواہ ان معاملات کا تعلق قانون سازی سے ہو، عدالت سے ہو، یا انتظامی امور سے۔ دوسری طرف غیر مسلموں سے

۱۔ تاريخ الخطيب البغدادي، صحیح حدیث، بروایت انس بن مالکؓ

معاملات طے کرنے کے لیے مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سرداروں، بادشاہوں اور حکمرانوں کے ساتھ خط وکتابت فرماتے اور ان کی طرف سفیر اور اپنے نمائندے بھیج کر انہیں ایسا نظام اپنانے اور ایسے عقائد اختیار کرنے کی دعوت دیتے جو زندگی کے لیے موزوں ترین ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی دیگر اقوام کے ساتھ معاہدات انجام دیتے اور جہاد کا حکم آنے کے بعد ضرورت پڑنے پر جنگ کا اعلان بھی آپؐ ہی فرماتے۔

اس کے علاوہ آپؐ داخلی طور پر مسلمانوں کو متحد رکھتے اور ان کے داخلی اور خارجی مفادات کا تحفظ فرماتے، ان کے آپس کے جھگڑوں کو نمٹاتے اور سزائیں نافذ کرتے، بازاروں کی نگرانی فرماتے، گورنروں اور عملے کا محاسبہ کرتے اور اجتماعی، ثقافتی، سیاسی، معاشی اور دفاعی لحاظ سے امتِ اسلامیہ کے مستقبل کی منصوبہ بندی فرماتے۔ یہ سب کام آپؐ وحی اور شریعت الٰہی کے مطابق سرانجام دیتے۔

ہجرت سے پہلے مکہ ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کی تین بیعتوں کے ذریعے مدینہ کی ریاست کی راہ ہموار کرلی تھی۔اس سلسلے کی ابتداء بعثت نبوی کے گیارہویں سال ہوگئی تھی۔ ان بیعتوں میں پہلے تو مدینہ منورہ سے آئے ہوئے انصار کے وفود سے اسلام کے مبادیات کی پابندی کرنے کا عہد لیا گیا پھر نظام زندگی اور نظام معاشرت کا احترام کرنے کا اور آخر میں جارحیت کے مقابلے میں امت کے نمائندے کی حیثیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرنے کا۔

فرانسیسی سیاسی دانشور جان جاک روسو نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں آکر معاہدۂ عمرانی کا جو تصور پیش کیا یہ بیعتیں اس کی سچی اور صحیح ترین واقعاتی تصویر پیش کرتی ہیں۔ روسو نے اس نظریہ کی رو سے افراد کے باہمی، معاشرتی اتفاق کو ریاست کی بنیاد قرار دیا تھا۔البتہ ان دونوں تصورات میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ روسو کے نظریے کے مطابق قانون سازی کے اختیارات کا منبع عوام ہیں جبکہ اسلام میں یہ حیثیت شریعت کو حاصل ہے۔

اس طرح صحیح معنوں میں ایک امت کے طور پر مسلمانوں کے وجود، یا ان کی سیاسی حیثیت کی تاریخ کا نقطۂ آغاز ہجرت کو قرار دیا جاسکتا ہے، جب انہوں نے دشمن کے مقابلے میں سلبی حیثیت سے نکل کر ایجابی موقف اختیار کیا ، اور صبر وتحمل کے مرحلے سے آگے بڑھ کر جہاد کا راستہ اپنایا اور وہ انفرادی سطح سے اجتماعی سطح پر اور اجتماعی سطح سے ریاستی سطح پر آ گئے۔

ابتدائی مراحل ہی میں اسلامی ریاست کا قیام اس بات کی زندہ دلیل ہے کہ اسلام صرف مذہب ہی نہیں بلکہ ایک ایسا قانونی نظام بھی ہے جسے انسان کی تمام نظریاتی، اعتقادی، معاملاتی،اَخلاقیاتی، حکومتی، انتظامی، تربیتی اور اجتماعی سرگرمیوں پر کامل حاکمیت حاصل ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے مذہب اور ریاست کے درمیان تعلق اس طرح مضبوط ہو جاتا ہے جس طرح عمارت اور بنیاد کے درمیان تعلق، اور اسلام کا صحیح مفہوم بھی یہی ہے۔

ب۔ عہدِ اسلامی اور اس سے پہلے کے سیاسی معاشرے

عرب میں قبائلی نظام رائج تھا اور مکہ میں قریش کو قیادَت اور حرم مکہ کی تولیت کی حیثیت حاصل تھی۔ مکہ اور اس کا گرد و نواح چوں کہ ایک بنجر خطہ تھا جس میں نہ سبزہ تھا ،نہ کوئی فصل ، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:﴿رَبَّنَا اِنِّی اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِی بِوَادٍ غَیْرِ ذِی زَرْعٍ عِندَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمَ ﴾ [ابراھیم: ۳۷](پروردگار میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے)۔

اِن حالات میں یہاں کے باسی شمال اور جنوب میں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ تجارتی کاروبار پر انحصار کرتے تھے۔ وہ سردیوں میں یمن اور گرمیوں میں شام کی طرف تجارتی سفر کیا کرتے تھے، جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے:﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ، اِیلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّیْفِ﴾ [القریش: ۱-۲](قریش کو مانوس کرنے کی خاطر، ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کی خاطر......)۔

کبھی کبھار وہ حبشہ کی طرف بھی سفر کیا کرتے تھے۔ چوں کہ مکہ کے باشندے اللہ کے گھر کے خادم اور پڑوسی تھے، اس لیے لوگ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یوں ان کا کاروبار بہت وسیع ہوگیا تھا اور انہوں نے پڑوسیوں کے ساتھ کئی کاروباری معاہدے اور دوستانہ عہد و پیمان قائم کر لیے تھے۔

جزیرۂ عرب کے علاوہ ایشیائی اور افریقی اقوام میں باہمی مضبوط دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ قدیم مشرق کی بادشاہتیں جیسے مصر، بابل، فارس، چین اور ہندوستان ، ریاست کی ابتدائی شکلیں تھیں۔

اسی طرح قدیم یونانی شہر، ایتھنز، اسپارٹا، تھیرا(Thera)اور پولونی (Apollonia) مستقل سیاسی اکائیاں تھیں جو باہمی تعاون کے اصول پر معاملات کیا کرتی تھیں۔ یونانی چوں کہ اپنے آپ کو باقی تمام اقوام سے برتر قوم تصور کرتے تھے،اس کی وجہ سے دیگر اقوام سے ان کے تعلقات کی بنیاد جنگیں اور فتوحات تھیں۔

دیگر اقوام سے خود کو برتر قوم سمجھنے اور تلوار کے زور پر دنیا پر حکمرانی کرنے میں رومیوں کی سوچ بھی یونانیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اِس دور میں متمدن دنیا کے بیشتر حصے رومی سلطنت کے زیر سایہ تھے۔ انہوں نے مفتوح اقوام کے ساتھ امن معاہدے بھی کیے جن میں زیادہ تر مفتوح اقوام پر فاتح قوم کی برتری نمایاں نظر آتی تھی۔

دعوتِ اِسلام کے ابتدائی ایام میں مسلمانوں سے نفرت کے باعث، مشرکینِ عرب کی ہمدردیاں آتش پرست ایرانی مجوسیوں اور دیگر بت پرستوں کے ساتھ تھیں۔ اسی طرح شروع میں مسلمانوں کے جذبات عیسائیت کے پیروکار رومیوں کے ساتھ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہجرت کے پہلے سال جب ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان ہونے والی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو عرب بت پرستوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں خوشیاں منائیں مگر اس کے بعد ۶۲۷ء میں رومیوں نے ایرانیوں پر بھرپور فتح پا لی۔ اس موقف کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں محفوظ کیا ہے:

﴿الٓمٓ. غُلِبَتِ الرُّومُ. فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ. فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ، لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ یَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ. بِنَصْرِ اللّٰہِ یَنْصُرُ مَنْ یَشَاءُ، وَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ﴾ [الروم: ۱-۵]

الف لام میم۔ رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں، وہ اپنی مغلوبیت کے بعد عنقریب غالب ہو جائیں گے، چند ہی سال میں، اللہ ہی کا حکم ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور اس روز مومن خوش ہو جائیں گے، اللہ کی مدد سے۔ اللہ نصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ غالب اور رحیم ہے۔

یہ آیت ۶۲۲ء میں نازل ہوچکی تھی ۔

اس کے بدلے شاہِ روم ہرقل نے اسلام کے ابتدائی ایام میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اپنایا، جب کہ شاہِ ایران کسریٰ نے غضبناک ہوکر آپؐ کا گرامی نامہ چاک کر ڈالا تھا۔ یہ مسلمانوں اور ان کی ریاست کے ساتھ اعلان جنگ کے مترادف تھا۔ ایرانیوں نے عملاً بھی اپنے پڑوس میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ جنگی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور یمن پر کسریٰ کی طرف سے مامور گورنر نے مدینہ کی طرف ایک شخص کو روانہ بھی کردیا کہ وہ معاذ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سر کاٹ لائے۔اسی طرح اہلِ فارس نے اپنے پڑوسی عرب قبائل پر حملے شروع کردیے جس کی وجہ سے مسلمانوں کو ایرانیوں کے ساتھ متعدد جنگیں لڑنا پڑیں اور بالآخر حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ایرانی جارحیت کے خلاف قادسیہ، مدائن، جلولاء اور نہاوند وغیرہ کی جنگوں نے کسریٰ کی بادشاہت اور ایرانی ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح عراق کو فتح کرنے کا سبب ایران کے حامی عناصر کا قلع قمع کرنا تھا۔(۱)

۱۔　التاریخ السیاسي للدولة العربیة ، ڈاکٹر عبدالمنعم ماجد ۱:۱۶۸، ۲۰۶، ۱۸۹

مسلمانوں کو رومیوں کے ساتھ بھی اس وقت جنگوں کا سلسلہ شروع کرنا پڑا جب عرب عیسائیوں پر رومیوں کے گورنر شرحبیل بن عمرو غسانی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ (۱) سے امیرِ بُصریٰ کے نام بھیجا گیا مکتوب گرامی لے کر انہیں شہید کر دیا۔ اس موقع پر رومی عیسائیوں نے مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے مؤتہ کے مقام پر ایک لاکھ کا لشکر جمع کیا۔ یہ عیسائی ہی تھے جنھوں نے شام میں مسلمان ہونے والے عیسائیوں کو ظلم وزیادتی سے قتل کر کے مسلمانوں کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تھا۔ رومیوں نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے بڑی بڑی فوجیں جمع کیں، پھر تبوک کے موقع پر خود ہی پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان جنگوں کا ایک سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں شام کی فتح اور یرموک کی جنگ کے نتیجے میں انہیں بھی شکست ہوگئی۔(۲)

اس سے مسلمانوں کے لیے فلسطین، اردن، شام اور لبنان کی فتح کا راستہ کھل گیا۔ جب ہرقل کی افواج کو شکست ہوئی تو اس نے زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے شام کو الوداعی سلام کیا: ''اے سوریہ! تو سلامت رہے، تجھے ایسے الوداع کرنے والے کا سلام جو شاید پھر تم سے کبھی نہ مل سکے گا''۔

۱۔ مؤلف نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی کا اسم گرامی حارث بن نمیر اسدی لکھا ہے، جب کہ کتبِ سیرت میں یہ نام حارث بن عمیر ازدیؓ ملتا ہے۔ آپؓ جب گرامی نامہ لے کر شام کے علاقے بلقاء پہنچے تو وہاں کے گورنر شرحبیل بن عمرو غسانی نے والا نامہ آپؓ سے چھین لیا اور آپؓ کو کچھ دیر باندھ کر رکھا اور پھر شہید کر ڈالا۔ یہی واقعہ جنگِ مؤتہ کا سبب بنا جس کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار مجاہدین پر مشتمل اس وقت تک کی اسلامی تاریخ کا عظیم ترین لشکر تشکیل دیا اور ان کے مقابلے میں خود ہرقل روم نے ایک لاکھ کا لشکر لے کر بلقاء کے نواحی علاقے مآرب میں پڑاؤ ڈالا۔ المغازی للواقدی ۱:۳۴۲، زاد المعاد، ابن القیم ۳:۳۸۱،۲، الرحیق المختوم ۱:۳۵۹۔ از اکرام الحق یٰسین

۲۔ التاریخ السیاسي للدولة العربیة ۱: ۱۸۸-۱۷۲

اس سے واضح ہوگیا کہ رومیوں کے مقابلے میں بھی مسلمانوں کی جنگیں جارحیت کے قلع قمع، فتنے کی سرکوبی، اور بلا روک ٹوک تبلیغِ اسلام کا بند وبست کرنے کے لیے لڑی گئی تھیں۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اسلامی فتوحات کا مقصد اقتصادی نہ تھا کہ جزیرۂ عرب کی خشک سالی اور پیداوار سے محرومی ان کا سبب بنی ہو جیسا کہ بیزنطیوں کا خیال ہے، بلکہ یہ سلسلہ ظلم کے خاتمے اور اسلام کی اشاعت کو ممکن بنانے کے لیے شروع ہوا۔ فاتحین کے نزدیک ان کا محرک بھی اسلام کے پیغام کے ساتھ گہرا اخلاص اور نئے دین کی بدولت حاصل ہونے والے عظیم جذبات تھے۔(۱)

اس سب کے باوجود مذہب اختیار کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا گیا کیوں کہ شریعت کی رو سے کسی کو زبردستی مسلمان بنانا جائز ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾[البقرة: ۲۵۶](دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں۔ ہدایت صاف طور پر ظاہر اور گمراہی سے الگ ہو چکی ہے)۔ یہ ایک ایسی عام اور قطعی نص ہے جو نہ تو منسوخ ہوئی ہے، نہ ہی اس میں کسی قسم کی تخصیص کی گئی ہے۔ جب اسلام کے دلائل خوب واضح اور تفصیلات بالکل عیاں ہیں تو زبردستی کی کیا ضرورت ہے۔ یہی بات امام رازیؒ، ابن کثیرؒ، طبریؒ، جصاصؒ اور ابو حیانؒ جیسے محقق مفسرین نے کہی ہے۔(۲)

امام ابن تیمیہؒ نے آیت کریمہ ﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''جمہور علماء سلف کی رائے میں یہ آیت نہ تو منسوخ ہوئی اور نہ ہی اس کی تخصیص کی گئی ہے بلکہ یہ الفاظ عمومی حکم رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم کسی کو مسلمان بننے پر مجبور نہیں کرتے اور نہ کسی کو اپنے دشمن سے لڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر کوئی اسلام

۱۔ التاريخ السياسي للدولة العربية، ڈاکٹر عبدالمنعم ماجدا: ۱۶۵و ما بعد

۲۔ آثار الحرب في الفقه الإسلامي، دراسة مقارنة، وہبہ زحیلی، ص ۷۸ وما بعد، طبع دوم

قبول کرتا ہے تو وہ اپنی جان اور مال کو محفوظ کر لیتا ہے اور جو لڑنے کے قابل نہ ہو تو ہم اسے قتل نہیں کریں گے۔ کوئی شخص بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے ایسی کوئی روایت پیش نہیں کرسکتا جس سے یہ ثابت ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو زبردستی مسلمان بنایا ہو چاہے وہ شخص مسلمانوں کی دسترس سے باہر ہو یا اس پر ان کا بس چل سکتا ہو۔ ظاہر ہے ایسے شخص کے مسلمان ہونے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ البتہ جو شخص اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس کا ظاہری اسلام ہی مان لیا جاتا ہے''۔

ابن تیمیہؒ مزید کہتے ہیں کہ: ''یہ بات تو طے شدہ اور ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ کافروں کو قیدی بنایا تھا جن میں سے کچھ نے فدیہ دے کر جان چھڑائی تھی اور کچھ کو آپؐ نے ویسے ہی چھوڑ دیا تھا، لیکن آپؐ نے ان میں سے کسی کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، حالاں کہ اگر جنگ کی وجہ صرف ان کا کفر ہوتا تو ان لوگوں کا علاج صرف تلوار سے ہوتا، مگر یہاں یہ حال ہے کہ جب مسلمانوں کے پاس دشمنوں کو قتل کرنے کا پورا موقع ہو اور ایسے میں کچھ لوگ قیدی بن کر ان کے ہاتھ لگ جائیں تو اِس حال میں بھی قرآنِ مجید نے انہیں جو اختیار دیا ہے وہ یہ ہے کہ چاہیں تو ان قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیں یا فدیے کے بغیر ہی بطورِ احسان آزاد کر دیں''۔ (۱)

ج۔ نظریۂ ریاست کے ظہور کے بعد بین الاقوامی معاشرہ

عصرِ حاضر کی بین الاقوامی برادری ایسے علاقائی ممالک کے وجود سے عبارت ہے جن کا کسی خاص علاقے یا سرزمین پر اقتدارِ اعلیٰ مسلم ہو۔ ایسے مماک کی تعداد اس وقت ایک سو پچاس سے زائد ہے۔ یہ تمام ممالک جن میں چالیس سے زائد آزاد اور خود مختار عرب اور اسلامی ریاستیں بھی شامل ہیں، اقوام متحدہ کے اس میثاق کی پابند ہیں جو بین الممالک امن و سلامتی کی دعوت دیتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرنے کو ممنوع قرار دیتا ہے، سوائے اس کے کہ کوئی ملک اپنے دفاع کے لیے مجبوراً اس وقت جنگ کرے جب اس کی سرزمین پر باہر سے مسلح حملہ کیا جائے۔

۱۔ رسالة القتال في مجموعة رسائل ابن تيمية، ص ۱۲۶، ۱۲۳

مگر آج کل کی بین الاقوامی صورت حال کے تناظر میں حقیقت یہ ہے کہ ریاستوں نے جارحیت کے مفہوم کو بڑا وسیع کر لیا ہے اور وہ معمولی بہانوں سے دوسری ریاستوں کے معاملات میں دخل اندازی کرنے لگی ہیں۔اس دخل اندازی سے ان کی غرض اپنے معاشی مفادات کا تحفظ کرنا اور اپنی تجارت کے لیے عالمی منڈیوں کے دروازے کھولنا ہوتا ہے، جیسے ویت نام کی جنگ میں امریکہ کی مداخلت، جنوبی کوریا اور شمالی کوریا کے درمیان جنگ، کیوبا کا محاصرہ اور ڈومینیکن (Dominican) کے معاملات۔ یہ سب کچھ امریکا نے اپنے مفادات اور مقاصد کے تحفظ کے دفاع کے لیے کیا ہے۔(۱)

حقیقت یہ ہے کہ بہت سے سیاست دانوں کے نزدیک جنگ کا جواز ہمیشہ موجود رہتا ہے اور جب کسی ملک کے مفاد کا تقاضا ہو تو وہ جنگ شروع کر سکتا ہے۔ بلکہ بعض سیاسی ماہرین کے نزدیک تو جنگ کا کوئی نہ کوئی جواز ہمیشہ پایا جاتا ہے۔(۲)

مگر حال یہ ہے کہ دفاع کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لیے جنگ کا قانوناً ممنوع ہونا، اس قانون کو ماننے والی، دو یا دو سے زیادہ، ریاستوں کے درمیان وسیع پیمانے پر جنگ چھڑ جانے میں عملاً مانع نہیں۔بلکہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں طاقت کے استعمال کی واضح ممانعت کے باوجود طاقت کے استعمال کا امکان عملی طور پر ان صورتوں میں ممکن رہتا ہے جب: سیکورٹی کونسل جارحیت کی صورت میں اس کے مرتکب ملک کے خلاف قرار داد منظور نہ کر پائے، یا جنرل اسمبلی اس بارے میں مناسب ہدایات جاری کرنے میں ناکام رہے یا رکن ممالک اس کی ہدایات کے نفاذ سے انکار کر دیں۔(۳)

حقیقت یہ ہے کہ جدید دور کا نظامِ امن و سلامتی اب تک فکری اور عملی طور پر

۱۔ آثار الحرب في الفقه الإسلامي، ڈاکٹر وہبہ زحیلی، ص ۱۲۸، طبع دوم

۲۔ القانون الدولي العام، ڈاکٹر علي صادق أبو هيف، ص ۶۴۱، مطبوعہ ۱۹۵۹ء

۳۔ مبادئ القانون الدولي العام، ڈاکٹر حافظ غانم، ص ۵۸۶، طبع دوم

مسلح طاقت کے استعمال کو روکنے میں بھی ناکام رہا ہے اور اس کے لیے جدید اصول و ضوابط بنانے میں بھی۔(۱)

بالترتیب سنہ ۱۹۴۸ء، ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء میں چار عرب اسرائیل جنگیں ہو چکی ہیں، حالاں کہ یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ اِسلامی شریعت کی رو سے فلسطین میں یہودیوں کی موجودگی ہی جائز نہیں۔ انہوں نے وطنِ اسلامی کے ایک خطۂ عزیزہ پر غاصبانہ قبضہ جمایا ہوا ہے جس کو آزاد کرانا لازمی ہے۔ ان حالات میں ان کے ساتھ صلح میں برکت کیسے ہوسکتی ہے، یا انہیں تسلیم کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے، ان کی سیاسی نمائندگی کا اقرار کیسے کیاجاسکتا ہے اور ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات کس طرح قائم کئے جا سکتے ہیں؟۔

اس کے علاوہ ایک یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ریاست کا جدید مفہوم یورپ میں سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کے دوران اِس وقت منظر عام پر آیا جب پاپائی تسلط کا خاتمہ ہوا اور جاگیرداری نظام کو زوال آیا۔ یا یوں کہیے کہ جاگیردارانہ قیادت کا اصول ختم ہوا جس کی رو سے زمین کی ملکیت کے ساتھ دیگر امتیازات بھی حاصل ہوجاتے تھے، جیسے فوج کی قیادت یا ٹیکس کی وصولی وغیرہ۔ بادشاہ کو بھی صرف ان اَراضی پر حقیقی تسلط حاصل ہوتا تھا جو اس کی ذاتی جاگیر ہوتی تھیں۔ جاگیروں کے باشندوں نے ہی مل کر بعد میں قوموں کی شکل اختیار کرلی۔ اس کے لیے اطالوی قوم اور فرانسیسی قوم کی مثال دی جاسکتی ہے۔ بعدازاں رفتہ رفتہ اس معاشرے پر سیاسی اقتدار قائم ہوا تو اسی نے ریاست کی شکل اختیار کر لی، کیوں کہ سیاسی اقتدار ہی سیاسی جمعیت کی جدید شکل کا وجود ہے۔(۲)

اس کے بعد ایک قومیت والی جدید ریاست کا ظہور ہوا اور اس کے معاشی اور

۱۔ النظرية المعاصرة للحياد، ڈاکٹر عائشہ راتب، صفحات ۲۸۰، ۲۶۵، ۲۵۷۔ آثار الحرب، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، ص ۱۲۷

۲۔ بحث الدولة الاسلامية، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، ص ۹، الموسوعة الفقهية، الكويت

سیاسی ستون مستحکم ہو گئے جیسا کہ انگلینڈ، فرانس، سپین، پرتگال، سویڈن، ڈنمارک، ناروے، ہنگری، پولینڈ اور روس میں ہوا۔ چناں چہ یہ اصول بن گیا کہ ریاست کا اقتدارِ اعلیٰ اپنا ہو اور کسی دوسری طاقت کے زیرِ تسلط نہ ہو۔

قرونِ وسطیٰ کے خاتمے کے بعد ۱۶۴۸ء میں ویسٹفالیا (Westphalia) کانفرنس کے انعقاد سے ہی بین الاقوامی سطح کے لوگوں میں بین الاقوامی برادری کا تصور پختہ ہوا۔ یہ برادری پہلے پہل مغربی یورپ کی ریاستوں تک محدود تھی، پھر یورپ کی تمام عیسائی ریاستیں اس میں شامل ہوگئیں اور پھر رفتہ رفتہ غیر یورپی عیسائی ریاستیں بھی اس کا حصہ بن گئیں۔ ۱۸۵۶ء میں اس کا دائرہ مزید وسیع ہوا تو اِسلامی ریاست ترکی اور دیگر غیر عیسائی ریاستیں، جاپان اور چین وغیرہ بھی اس میں شامل ہوگئیں۔(۱)

د۔ بین الاقوامی تعلقات کے اِسلامی اصول

دنیا کی دو حصوں دار الاسلام اور دارالحرب میں تقسیم جس کا تذکرہ مجتہدین کے ہاں ملتا ہے، کوئی دستوری یا قانونی تقسیم نہیں، جیسا کہ اس کی وضاحت آئے گی، یہ تو وقتی حالات کا تقاضا تھا۔ بین الاقوامی قانون کے بعض ماہرین یہ سمجھتے ہیں(۲) کہ اسلام ایسی خود مختار ریاستوں میں دنیا کی تقسیم کے خلاف ہے جن میں سے ہر ایک کا اپنا الگ قانونی نظام ہو اور وہ اپنے سے بڑی کسی ریاست کے قانون کے تابع نہ ہو، سوائے اس کے کہ کوئی ریاست اپنی مرضی سے کسی دوسری ریاست کے قوانین کو اپنا لے۔ اس کے برعکس اِسلام پوری انسانیت کو ایک ہی قانونی نظام کے تحت اکٹھا کر دینا چاہتا ہے، جس کا نام اِسلامی شریعت ہے۔

۱۔ ۱۸۵۶ء کے پیرس معاہدے کی رو سے عیسائی اور غیر عیسائی ریاستوں میں مساوات قائم کرنے کا فیصلہ ہوا، جس کی رو سے ترکی کو یورپی کانفرنس میں شامل کر لیا گیا۔ مبادئ القانون الدولي العام، حافظ غانم، ص ۴۶ و ما بعد۔ المجتمعات الدولية الاقليمية، حافظ غانم، ص ۱۴ و ما بعد۔ النظم السياسية، ثروت بدوی، ص ۲۳ وما بعد، ۳۷۶۔ أحكام القانون الدولي في الشريعة الإسلامية، حامد سلطان، ص ۱۰، ۱۱۷۔ القانون الدولي، ابوہیف، ص ۸۸۔

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر مجید خضوری، المجلة الأمريكية للقانون الدولي، شمارہ اپریل ۱۹۵۶ء، ص ۳۵۸

میں اس بیان کے دوسرے حصے سے اتفاق کرتا ہوں، جو یہ ہے کہ اسلام عالمی اور انسانی مزاج رکھنے والا دین ہے۔ وہ تمام انسانوں کے لیے خیر خواہی، خوشحالی، انصاف، دادرسی اور آزادی کا خواہاں ہے۔ چناں چہ اسلام کا روئے سخن تمام انسانیت کی طرف ہے، اس میں ذات، قومیت یا زبان کی بنا پر کوئی تفریق نہیں۔ اِسلام کا یہ نقطۂ نظر عالم گیریت اور محیطیت کے جدید رجحان کے عین مطابق ہے، جس کا تقاضا یہ بتلایا جاتا ہے کہ ریاست کے تنگ نظام کی حدود سے باہر نکلا جائے کیوں کہ قوموں کے آپس میں تعلقات بہت بڑھ چکے ہیں، ذرائع ابلاغ، اخبارات و نشریات وغیرہ کی صورت میں فکری روابط خوب پھیل چکے ہیں اور ایک ریاست کے دوسری ریاست پر اپنے دروازے کھلے رکھنے اور ہر حال میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔(۱)

مگر میں اِس بیان کے پہلے حصہ سے متفق نہیں۔ اس لیے کہ اسلام روئے زمین پر اپنی دعوت کے پھیل جانے اور تمام انسانوں تک اپنا پیغام پہنچ جانے کے بعد بھی مختلف قانونی نظام رکھنے والی ریاستوں کے قیام کو نہیں روکتا بشرطیکہ وہ پیغامِ اسلام کے ساتھ یکسوئی سے مخلص اور مسلمانوں کے ساتھ عہد امن و وفا پر کاربند رہیں۔ اس صورت میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مسلم علاقوں پر حملہ آور نہ ہوں، نہ ان کی دینی حرمتوں کو پامال کریں اور نہ مبلغین اِسلام کو نشانہ بنائیں۔

اِس طرح کے ممالک اپنے ہاں جس قانونی نظام پر قائم رہنا چاہیں، انہیں اِس کا پورا حق ہے اور وہ اِس سلسلے میں مکمل طور پر آزاد ہیں، کیوں کہ قرآن کریم نے ''عَالَمین'' کے وجود کو تسلیم کیا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿تَبَارَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْراً﴾ [الفرقان: ۱](بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ سارے جہاں والوں کے لیے نذیر ہو۔

۱۔ المجتمعات الدولية الإقليمية، غانم،ص ۱۸، المدخل إلى القانون الدولي، ڈاکٹر عزیز شکری،ص۳۰ و ما بعد۔

قرآن کریم نے قسموں کو فساد، دھوکے اور وعدہ خلافی کا ذریعہ بنانے یا قوموں کی تعداد میں اضافے کے خوف سے یا کسی قوم کے مقابلے میں دوسری قوم کی افزائش روکنے کے لیے ظلم، زیادتی، بے حیائی اور برائی کا ارتکاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ. وَأَوْفُواْ بِعَهْدِ اللهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلاَ تَنقُضُواْ الأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلاً. إِنَّ اللّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ. وَلاَ تَكُونُواْ كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثاً. تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلاً بَيْنَكُمْ أَن تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَى مِنْ أُمَّةٍ﴾ [النحل: ۹۰-۹۲]

اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نا معقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔ اور تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو، جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر ضامن بنا چکے ہو، اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے محنت سے سوت کاتا ہو اور پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہو، کہ تم اپنی قسموں کو آپس میں اس بات کا ذریعہ بنانے لگو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ غالب رہے۔

یہ آیات ان لوگوں کے موقف کو رد کرتی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ دین صرف عبادات کا نام ہے، یا یہ کہ یہ دین تو ہے مگر سیاسی نظام نہیں، یا یہ کہ دین ہر زمانے کے لیے مناسب نہیں۔ چناں چہ انصاف، حق اور احسان اپنے وسیع تر مفہوم کے ساتھ،

رشتہ داروں کی مالی امداد کے ذریعے دلوں کا ملنا، ہر فرد کا فحاشی اور منکرات سے دور رہنا، ظلم و زیادتی سے اجتناب کرنا، وعدہ پورا کرنا اور معاہدات کی خلاف ورزی نہ کرنا جیسا کہ اس آیتِ کریمہ میں صراحت فرمائی گئی ہے،ان تمام پہلوؤں سے یہ آیت کریمہ خیر و شر کے بیان پر نہایت جامع آیت ہے۔ یہ سب کچھ جو یہاں ذکر کیا گیا، ایک پاکیزہ اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے ستونوں کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس کے قیام کی فلاسفہ اور مصلحین آرزو کرتے چلے آئے ہیں۔(۱)

بنابریں کوئی بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا سورج طلوع ہونے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عالمی بادشاہوں اور سربراہوں کے نام مراسلات(۲) کے ذریعے اس کا پیغام پہنچ جانے کے وقت سے بین الاقوامی تعلقات پر اسلام کے نہایت اہم اثرات مرتب ہوئے۔ دعوتی سرگرمیوں کا یہ سلسلہ فتوحات کے بعد عہدِ خلافتِ راشدہ اور عہدِ بنی امیہ میں بھی انفرادی اور اجتماعی سطح پر برابر جاری رہا۔ اِسلام کا یہ پیغام تہذیب وتمدن کے ان اصولوں کو محیط تھا جن کا طرۂ امتیاز انسان دوستی کی اعلیٰ اقدار کا حامل ہونا تھا، ان کی بنیاد آسمانی وحی پر تھی اور ان کا مقصد ایک ایسے عمدہ معاشرے کا قیام تھا جس میں بھلائی، عدل اورحسنِ اخلاق کا دور دورہ ہو۔

اس سارے عمل نے تاریکی کے دور میں یورپ کو متاثر کیا۔ بین الاقوامی قانون نے بھی اپنے ابتدائی مراحل میں اِسلامی تہذیب سے اثر لیا، بالخصوص صلیبی جنگوں کے عرصے میں جو تقریباً تین صدیوں تک جاری رہیں۔حتی کہ ان جنگوں کے صدیوں بعد جن جنگی اصول وضوابط کی تشکیل ہوئی اس میں بھی اِسلام کے آثار نہایت نمایاں نظر آتے ہیں۔ چناں چہ شاہسواری کے اصول ہوں، جنگی قیدیوں اور زخمیوں کے

۱۔ التفسیر الواضح، پروفیسر محمد محمود حجازی، ج ۱۴، ص ۵۸

۲۔ نووي شرح مسلم، ج ۱۲، ص ۱۰۳ ومابعد۔ فتح الباري، ج ۸، ص ۱۲۶۔ مجموعة الوثائق السياسية للعهد النبوي والخلافة الراشدة ، ڈاکٹر محمد حمیداللہ، حیدرآبادی، ص ۴۷

ساتھ سلوک کے ضوابط ہوں، مقتولین کی تدفین کے معاملات ہوں، ان کے اعضاء کاٹنے کی ممانعت ہو ، اسی طرح دورانِ جنگ عام شہریوں کی حیثیت کا سوال ہو یا بعض اقسام کا اسلحہ استعمال کرنے کی ممانعت کا معاملہ ، ان سب میں اسلامی تہذیب کا اثر نظر آتا ہے۔

بنا بریں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دارالاسلام سے باہر نظام ہائے حکومت کو جو نیا رخ ملا، وہ اس میں اِسلامی تہذیب کے ممنونِ احسان ہیں۔اسی طرح بعد کے زمانوں میں بین الاقوامی قانون کی تشکیل اور اس کے قواعد وضوابط کی ترتیب وارتقاء کے مراحل بھی اسی کے زیرِ اثر طے ہوتے نظر آتے ہیں۔(۱)

اسلامی تہذیب کے مؤثر ہونے کا سبب یہ ہے کہ اسلام بذاتِ خود اور اس کے مبادیات نہایت سادہ اور واضح ہیں، انسان، کائنات اور زندگی کے بارے میں اس کا تصور ایک جامع تصور ہے۔ اِسلام کے شرعی احکامات اور فرائض و واجبات کو آسانی اور سہولت کے لحاظ سے امتیاز حاصل ہے۔ اس کے اصول اور اس کی اقدار تعصب، تنگ نظری یا ذات، برادری، رسم ورواج اور زبان کی بنیاد پر پیدا ہونے والی فرقہ بندیوں سے پاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات: ۱۳](بے شک اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر زیادہ پرہیزگار ہے)۔

مگر ہر اصلاحی پروگرام کو کئی طرح کی مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔نسل درنسل چلے آتے مناصب، مفادات، رسم و رواج اور ناحق تعصّبات کا تحفظ اس سلسلے کی بڑی رکاوٹوں میں سے چند ہیں۔انہی رکاوٹوں نے مسلمانوں کو مسلسل جنگوں میں پھنسائے رکھا۔ داخلی طور پر جزیرۂ عرب میں وہ عربوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہے اور بیرونی طور پر دنیا کی دو بڑی طاقتوں،رومی اور ایرانی بادشاہتوں، کے ساتھ ان کی ٹھنی رہی ، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔

۱۔ أحكام القانون الدولي في الشريعة الإسلامية ، ڈاکٹر حامد سلطان،ص ۱۷

بے چینی اور غیر یقینی کی یہ صورت حال اقوام کے آپس میں تعلقات پر بھی اثرانداز رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگی صورت حال معمول کی صورت حال بنی رہی، جب کہ بین الاقوامی تعلقات میں امن و استقرار کو ایک استثنائی حالت کا درجہ حاصل رہا۔ ان حالات نے مسلمان فقہاء کے اجتہادی عمل کو بھی متاثر کیا اور انہوں نے بھی اس صورتِ حال کے پیشِ نظر دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا: ایک حصہ دارالاسلام کہلایا اور دوسرے کو دارالحرب کا نام دیا گیا۔

پھر جونہی ایمر جنسی کی یہ صورتِ حال ختم ہوئی جس کی وجہ سے تفریق عمل میں آئی تھی اور حالات اپنی اصل حالت پہ لوٹ آئے تو دنیا کی اصل شرعی حیثیت بھی بحال ہوگئی اور وہ یہ کہ پوری کی پوری دنیا ایک ہی دار ہے، جیسا کہ امام شافعیؒ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

امام شافعیؒ کا یہ اجتہادی نقطۂ نظر اس بات کی تائید کرتا ہے کہ پوری انسانیت تک قرآنی پیغام پہنچانے کے لیے اِسلام ایک عالمگیر فکر رکھتا ہے، تاکہ وہ اصول اور اعلیٰ نمونے راسخ ہو جائیں، جن پر پیغامِ اِسلام کی بنیاد ہے، اور جو ایک ہی نظریے اور ایک ہی عقیدے پر مشتمل ہے۔ یہی عقیدہ اور نظریہ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے بھلائی کا سرچشمہ ہے۔ اس سلسلے میں لوگوں سے جس مثالی رویے کی توقع کی جانی چاہیے وہ یہ ہے کہ سب لوگ اسے تسلیم و رضا کے ساتھ دل وجان سے قبول کر لیں تاکہ ایسا اعلیٰ معاشرے قیامِ عمل میں آ سکے جسے اسلام حق و انصاف اور مساوات و شورائیت کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں شر اور فساد کی روک تھام ہو اور ظلم کے ساتھ جنگ ہو، خواہ یہ ظلم سیاسی ہو، معاشرتی ہو یا معاشی۔

باقی جہاں تک اِن قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کا تعلق ہے جن میں جہاد کے تذکرے ہیں تو یہ ہر زمانے میں فطری امر رہا ہے۔ جب بھی جنگ کا موقع آتا ہے تو اس کے لیے حوصلہ افزائی اور ترغیب کی ضرورت ہوتی ہے۔ جذبہ و جرأت اور نظم وضبط اور ہوشیاری کے بغیر دشمن کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا اور جارحیت کو جڑ سے اکھاڑ

پھینکنے اور حملہ آور کو سبق سکھانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔اسی طرح اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خاطر ہیبت، قوت، ٹھوس شخصیت اور عزتِ نفس کے اِسلامی معیار کو قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جب ایسے حالات پیدا ہوجائیں تو حق وصداقت، وحدت ملی اور دفع مظالم کے داعی اس کلمے کی سر بلندی کی خاطر جہاد فی سبیل اللہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اگرحالات کا تقاضا یہی ہوتو جنگیں بھی ہوجاتی ہیں۔ ایسے میں یہ کوئی معقول بات نہیں کہ مسلمانوں پر کینے، نفرت اور تعصب کی آگ برسا کر بھی دشمن کو فیصلہ کن جواب نہ ملے۔ اس کے بغیر تو فتنے کی سرکوبی اور جارحیت کے تسلسل کو روکنا ممکن ہی نہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ [الأنفال: ۳۹](اور اِن سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کا ہو جائے)۔

اگرچہ دارالاسلام اور اسلامی ریاست کے مفہوم ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں، پھر بھی ان دونوں میں ایک امتیازی فرق یہ ہے کہ دارالاسلام کے لیے بنیادی طور پر ایک مادی عنصر کا پایا جانا ضروری ہے، اور وہ عنصر خطۂ زمین یا علاقہ ہے۔ (۱) جب کہ اسلامی ریاست کے لیے بنیادی شرط اقتدارِ اعلیٰ یا خود مختاری ہے۔ یہ ایک معنوی عنصر ہے جس کی بنیاد پر اس میں ریاست بننے کی اہلیت ہونا ضروری قرار پاتا ہے۔ ریاست بننے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی مالی حیثیت بھی اس کے ساتھ منسلک شہریوں اور شخصیات کی ذاتی حیثیتوں سے الگ تھلگ اور مستقل ہو۔

اس تمہید کے بعد آئندہ دو ابواب میں جنگ اور امن دونوں صورتوں میں اسلام کے بین الاقوامی تعلقات کے نظام کا تفصیلی خاکہ پیش کیا جائے گا۔

۱۔ بحث الدولة الإسلامية، ڈاکٹر وہبہ زحیلی، ص ۹

پہلا باب

زمانۂ جنگ میں بین الاقوامی تعلقات

جنگ ہر زمانے میں انسانوں کے درمیان ایک معاشرتی حقیقت رہی ہے۔ قدیم اور جدید تاریخ دونوں اس بات کی گواہ ہیں۔ ابن خلدونؒ نے کہا ہے کہ جنگ انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس سے نہ کوئی قوم خالی رہی ہے، نہ کوئی نسل(۱)۔ اس کی تفصیل بہت طویل ہے، یہاں درجِ ذیل مباحث کے ذریعے ہمارا مقصد شریعتِ اِسلامیہ کی روشنی میں صرف اس کے اہم اصول وضوابط بیان کرنا ہے:

پہلی بحث

اسلام کی رو سے جنگ کے اسباب

ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کو سخت دباؤ، شدید مزاحمت اور مسلسل اشتعال انگیزیوں کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں جزیرۃ العرب کے اندر بت پرست مشرکین، یہودی اور منافق دشمنان اور مخالفین دعوتِ اسلامی کے ساتھ اور جزیرۂ عرب سے باہر اہلِ روم، عیسائیوں، ایرانیوں اور بت پرستوں کے ساتھ مسلح تصادم کی نوبت آئی، جیسا کہ پہلے ہم جان چکے ہیں۔

ہر طرف وحشی بھیڑیوں سے گھرے اس علاقے کے بیچ درمیان مسلمان ظلم کے خلاف مزاحمت، جارحیت سے دفاع اور آزادانہ تبلیغِ اسلام کو یقینی بنانے کے لیے کارروائی پر مجبور ہوگئے۔

یوں جہاد کو جائز قرار دینے کا مقصد برائی کا خاتمہ، مسلمانوں کا اپنا اور ان کی

۱۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۷۰

دعوت کا تحفظ اور جارحیت کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس کی وجہ مذہب کی مخالفت نہیں تھی، نہ اس کا مقصد جانیں تلف کرنا اور انسانوں کو ایذا دینا تھا۔ قتال تو ایک وسیلہ تھا جو ضرورت کے تحت مسلمانوں کو اختیار کرنا پڑا۔ چناں چہ جب دشمنانِ اسلام نے اللہ کی طرف دعوت دینے والوں پر ظلم ڈھانا شروع کیے، وہ مسلمانوں کو قتل کرنے لگے، انہیں دین سے برگشتہ کرنے کے لیے آزمائشوں میں ڈالنے لگے اور انہیں اپنے گھروں اور املاک سے ناحق بے دخل کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

﴿أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ. الَّذِيْنَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُوْلُوا رَبُّنَا اللَّهُ......﴾ [الحج: ۳۹]

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے۔

جہاد کی اجازت سے مقصد یہ نہیں تھا کہ تلوار کے زور پر لوگوں کو مسلمان بنایا جائے یا اسلام کے مخالفین کو ختم کیا جائے یا اقوام کو محکوم بنایا جائے اور ان کی املاک کو چھین لیا جائے یا لوگوں کے خون سے اپنی پیاس بجھائی جائے یا اقوام پر غلبہ حاصل کیا جائے اور یوں آباد دنیا کے رہنے والوں پر اپنی نگرانی اور اقتدار قائم کردیا جائے۔

جمہور فقہاء نے جن میں مالکیہؒ، حنفیؒ، اکثر شافعیؒ اور حنبلیؒ (۱) سب ہی شامل ہیں،

۱۔ بداية المجتهد ۱:۳۷۱،فتح القدير۴:۲۹۱، مغني المحتاج۴:۲۱۰،فتح المعين شرح قرة العين، مليباری،ص۱۳۳، المنهج للبجيرمي۴:۲۲۷،رسالة القتال لابن تيمية ص۱۱۶

وضاحت سے بیان کیا ہے کہ جنگ کا محرّک کافروں کی طرف سے مسلمانوں کا قتل و غارت کرنا، ان سے لڑائی کرنا، اور ان پر ظلم و زیادتی کرنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں جہاد کا اصلی سبب جارحیت کو ختم کرنا تھا، محض کفر نہیں تھا، چناں چہ کسی شخص کو اس کے کفر کی وجہ سے قتل نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اسی صورت میں قتل کیا جاتا تھا جب وہ مسلمانوں کے خلاف یا اسلام کے خلاف جارحیت کا مرتکب ہوتا۔ اس کا ثبوت یہ اصول ہے کہ جو شہری مسلمانوں سے نہ لڑے، اس سے جنگ نہیں لڑی جائے گی بلکہ اس کے ساتھ صلح کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو قتل کرنا حرام قرار دیا۔ آپؐ کا ارشاد ہے: لا تقتلوا شیخاً فانیاً، ولا طفلاً، ولا امرأۃً، ولاتغلّوا(۱)۔ (عمر رسیدہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا اور نہ مالِ غنیمت سے کوئی چیز چھپا کر خیانت کرنا۔)

اگر محض کفر کی وجہ سے قتل کرنا جائز ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنی قریظہ کے بارے میں ثالث بنانے پر راضی نہ ہوتے اور مجبور کر کے اسلام قبول کر وانا بھی جائز قرار پاتا اور اگر معاملہ اسی طرح ہوتا تو اہل کتاب سے جزیہ قبول کرنے کی اجازت بھی نہ دی جاتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قَاتِلُواْ الَّذِينَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّهُ وَرَسُولُهُ وَلاَ يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُواْ الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾ [التوبة: ۲۹]

جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے، اسے حرام نہیں مانتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے، یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

۱۔ سنن البیهقي ۹: ۹۰، سنن أبي داؤد ۳: ۵۲

یہاں قرآن کریم نے جنگ کی غرض وغایت اس بات کو قرار دیا ہے کہ وہ لوگ ذمی بن کر امن سے رہنے کا معاہدہ کرلیں یعنی ان کی طرف سے پر امن رہنے کا عہد ہو اور مسلمانوں کی طرف سے ان کے تحفظ کا عہد۔ اگر قتال کا محرک ہی ان کا کفر پر قائم رہنا یا اسلام کی مخالفت کرنا ہوتا تو جنگ کی غرض وغایت بھی انہیں مسلمان بنانے کو قرار دیا جاتا، اور اس بات کی اجازت نہ دی جاتی کہ جزیہ دے کر اپنے دین پر ہی قائم رہیں۔

فقہاءِ شافعیہ کا کہنا ہے کہ جہاد کی فرضیت ان امور میں سے ہے جنہیں بطورِ ذریعہ فرض کیا گیا ہے، نہ کہ بطورِ مقصد، کیوں کہ جنگ کی غرض وغایت ہدایت ہے اور اس کے علاوہ شہادت۔ اس سے مقصود کافروں کو قتل کرنا نہیں۔ چناں چہ اگر جہاد کے بغیر دلائل کے ذریعے ہدایت حاصل ہو سکے تو ایسا کرنا جہاد کرنے سے بہتر ہے۔ (۱)

فقہاءِ اَحناف میں سے کمال ابن ہمامؒ نے کہا ہے کہ جہاد کا مقصد دنیا کو فساد سے پاک کرنا ہے۔(۲) ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی طرف سے جنگ کرنے کا دار و مدار کافروں کی طرف سے جنگ کرنے پر رہتا ہے یعنی جب کافر مسلمانوں سے لڑیں گے تو مسلمان بھی ان سے لڑیں گے۔(۳)ابن قیمؒ نے کہا ہے کہ مسلمانوں پر صرف ان کافروں سے لڑنے کو فرض کیا گیا ہے جو مسلمانوں سے لڑیں، نہ کہ ان کافروں سے جو مسلمانوں سے نہ لڑیں۔(۴) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَقَاتِلُواْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ [البقرة: ۱۹۰](اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

۱۔ مغني المحتاج ۴:۲۱۰

۲۔ فتح القدير ۴:۲۷۷

۳۔ رسالة القتال، حوالہ سابقہ

۴۔ زاد المعاد ۲:۵۸

یہ آیت نہ تو منسوخ ہے اور نہ اس میں کوئی تخصیص ہوئی ہے، اس لیے کہ اس کی تنسیخ یا تخصیص کی کوئی دلیل موجود نہیں۔

اس بارے میں کچھ غیر معتبر اقوال بھی ہیں جو امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے بعض شاگردوں سے منقول ہیں۔(۱) ان کی رو سے کفر کو سببِ قتال قرار دیا گیا ہے، جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غیر مقاتل کفار سے لڑنا بھی جائز ہے جیسے راہب، بوڑھے، لنگڑے، اندھے اور کسان۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کے ان الفاظ میں یہ سب شامل ہیں:﴿فَإِذَا انْسَلَخَ الأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُواْ الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ﴾ [التوبة: ۵](پس جب حرمت کے مہینے نکل جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ)۔انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی :اقتلوا شیوخ المشرکین واستحیوا شَرْخهم(۲)(بوڑھے کافروں کو قتل کرو اور جوان کافروں کو چھوڑ دو) سے بھی یہ مطلب لیا ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی بنا پر اس رائے کے حاملین کے نزدیک محض کفر ہی قتل کو جائز بنا دیتا ہے۔

اس رائے کی تردید اس طرح کی گئی ہے کہ ان نصوص کی بنا پر جس عموم کا تذکرہ آپ نے کیا ہے ان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تخصیص فرمادی ہے کیوں کہ آپؐ نے اہل ذمہ، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا حرام قرار دیا ہے۔

باقی قرآن و سنت کی نصوص میں صریح طور پر اس بات کے دلائل موجود ہیں کہ جنگ کا مقصد ظلم اور جارحیت کا خاتمہ ہے۔جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَقَاتِلُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبِّ الْمُعْتَدِينَ﴾ [البقرة: ۱۹۰](اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

۱۔ مغني المحتاج ۴:۲۲۳، بداية المجتهد حوالہ سابقہ

۲۔ اس سے مراد یہ ہے کہ صاحبِ رائے کفار کو مار دو اور نابالغ اور ناسمجھ نوجوانوں کو چھوڑ دو۔ حوالہ ابو داؤد، ترمذی، بروایت سمرۃ بن جندبؓ۔

اور ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ﴾ [البقرة: ۱۹۳](اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں)، ﴿فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ [البقرة: ۱۹۴](لہذا جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو، البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی ہیں)، ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ [التوبة: ۳۶](اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔) اور درج ذیل حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے:لا تتمنّوا لقاءَ العدوّ و سَلُوا اللّٰہ العافیة فاذا لقیتُموھم فَاصبروا ۔ (۱) (دشمن سے لڑنے کی آرزو مت کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرو، پھر بھی اگر جنگ کرنی پڑ جائے تو ثابت قدم رہو)۔

تاریخی حقائق بھی اسی نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں۔ چناں چہ ہجرت سے پہلے بھی اور بعد میں بھی مسلمانوں پر ظلم و زیادتی ہوتی رہی۔ کافروں نے انہیں شدید اذیتیں دیں، کچھ مسلمانوں کو مار ڈالا اور کچھ کو دین سے ہٹانے کے لیے آزمائشوں میں ڈالا اور انہیں سخت عذاب دیتے رہے۔ جو مسلمان مدینہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے ان کے اموال ضبط کر لیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی پوری کوشش کی اور کئی بار مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے بڑے بڑے لشکر جمع کیے۔

۱۔ بخاری اور مسلم نے اسے ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور مسلمؒ نے عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ کی روایت سے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے جس میں یہ اضافہ بھی ہے: وَاعلموا ان الجنة تحت ظلال السیوف. (اور جان رکھو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے)۔ نووی شرح مسلم ۲:۴۵-۴۶، بخاری ۴: ۷۹

ایرانیوں اور رومیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ چناں چہ یمن میں کسریٰ کے گورنر نے ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک لانے کے لیے بھیجا۔ ایرانیوں نے اپنے پڑوس میں رہنے والے عرب قبائل پر یورش کی اور اس کے لیے حیرہ کے بادشاہوں کو استعمال کیا، پھر انہوں نے مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھائے۔

رومیوں اور ان کے حلیف شامی عیسائیوں نے بھی پڑوسی قبائل میں سے اسلام قبول کرنے والے کئی لوگوں کو قتل کردیا، جن میں ایک غسانی امیر بھی تھا۔ رومیوں نے ہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کے صحابہ ؓ کو نیست و نابود کرنے کے لیے موتہ اور تبوک وغیرہ میں بڑے بڑے لشکر جمع کیے۔(۱) ابن تیمیہ ؒ کہتے ہیں: جہاں تک نصاریٰ کا تعلق ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں کسی سے بھی لڑائی نہیں کی ، یہاں تک کہ آپ ؐ نے قیصر روم، مقوقس، نجاشی، مشرقی عرب کے بادشاہوں اور شام کے بادشاہوں کے پاس قاصد بھیجے جس کے نتیجے میں کئی عیسائی اور غیر عیسائی اسلام میں داخل ہوگئے۔ اس پر شام کے عیسائیوں نے مسلمان ہونے والے کچھ آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور یوں مسلمانوں کو قتل کر کے مسلمانوں سے لڑنے میں پہل کی اور ظالمانہ طور پر نومسلموں کو قتل کر ڈالا۔ چنانچہ جب عیسائیوں نے اس طرح مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی موتہ کی جانب ایک لشکر روانہ کیا۔(۲)

۱۔ تاریخ الاسلام السیاسي، ڈاکٹر حسن ابراہیم ۱:۱۰۴ وما بعد، ۲۱۲-۲۳۱، العلاقات الدولیة فی الاسلام، محمد ابوزہرہ، ص ۹۰ وما بعد، الشریعة الاسلامیة والقانون الدولي ، پروفیسر علی منصور ، ص ۲۵۱ ومابعد، ۲۶۰-۲۸۰

۲۔ رسالة القتال، ص ۱۱۸

دوسری بحث

جہاد کی مشروعیت کے حالات واَسباب

اسلام عزت و وقار کا دین ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾[المنافقون: ۸](اور عزت تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے ہے)۔اسی طرح فرمایا:﴿وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴾ [النساء: ۱۴۱] (اور اللہ کافروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہ دے گا)۔

اسلام توحید، بھلائی ،حق، انصاف اور تمام انسانوں کی اصلاح کا پیغام ہے، جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾[الزمر: ۳](خبر دار بندگی صرف اللہ ہی کے لیے ہے)، ﴿قُلْ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الأعراف: ۱۵۸](اے محمدؐ! کہہ دیجیے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں)۔اور﴿تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا ﴾ [الفرقان: ۱](بابرکت ہے وہ ذات جس نے یہ قرآن اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ وہ سارے جہان والوں کو خبر دار کرنے والا ہو)۔اس لیے پوری دنیا کی بھلائی کی خاطر اسلام کو پوری دنیا میں پھیلانا مقصود ہے، جیسے ارشاد ہے:

> ﴿قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَكِتَابٌ مُّبِيْنٌ. يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ بِإِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [المائدة: ۱۵-۱۶]
>
> تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو، جو اس کی رضا کے طالب ہیں، سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اُجالے کی طرف لاتا ہے اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جو غالب رہنے کے لیے آیا ہے، مغلوب رہنے کے لیے نہیں۔ اس لیے کہ یہ آخری آسمانی تعلیم ہے جس کے ذریعہ اللہ نے تمام سابقہ ادیان کو منسوخ کر دیا۔ فی الواقع یہ منسوخ کرنا ہی معقول ہے کیوں کہ اس وقت کوئی ایسی مستند نشانی باقی نہیں رہی جو اس وقت موجود سابقہ آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کی تعلیمات کے مضامین کے قابلِ اعتماد ہونے کا پتہ دے۔ تورات تو ضائع ہو گئی اور انجیل کے موجودہ نسخے بھی وہ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد لکھے گئے۔ یہ وہ ہے ہی نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی۔اس بات کا اعتراف خود یہودی اور عیسائی بھی کر رہے ہیں۔

مسلمان اپنی جنگوں سے صرف اپنے خلاف یا پوری انسانیت کی فلاح وبہبود کی علم بردار اپنی عظیم اور عالمگیر دعوت کے خلاف ہونے والی جارحیت سے دفاع چاہتے ہیں۔ اسلامی شریعت دیگر اقوام کا استحصال کرنے والے نظام کی تائید نہیں کرتی۔ وہ اس طرح کے نظام کا مکمل طور پر انکار کرتی ہے۔ اور ایک مستقل پروگرام کے تحت اسے مسترد کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس نے کبھی استعماری نظام اختیار نہیں کیا، بلکہ وہ ایسے نظام سے واقف تک نہیں۔اس نے کبھی فوجی قبضے یا فوجی حمایت یافتہ والے نظام کو بھی اختیار نہیں کیا۔ غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ بطورِ نظام اور بطورِ دین، دونوں حیثیتوں سے اس کی بنیاد عدل، شورائیت اور مساوات پر ہے۔(۱)

اسلام جدید استعمار کے ہتھکنڈوں سے بھی مانوس نہیں جو کبھی دباؤ کے ذریعے، کبھی اپنے اثر رسوخ کے ذریعے اور کبھی دھمکیاں دے کر دوسرے ممالک کے معاشی معاملات میں مداخلت کرتا ہے۔اسی طرح اس کی دیگر خفیہ چالیں بھی ہیں جنھوں نے فوجی مداخلت اور تباہ کن جنگوں کی جگہ لے لی ہے۔ اسلام تو بس یہ چاہتا ہے کہ اسے مختلف ممالک میں اپنی دعوت پہنچانے کا موقع مل جائے۔

۱۔ أحكام القانون الدولي في الشريعة الإسلامية ، پروفیسر ڈاکٹر حامد سلطان، ص ۱۱۹

جہاد جو اسلام کی بلند چوٹی کی حیثیت رکھتا ہے اسے غصب شدہ حقوق کی بر آوری، ظلم وزیادتی کی سرکوبی، بلاروک ٹوک تبلیغِ اسلام کی ضمانت، مبلغین کے تحفظ اور پائیدار امن کے ذریعے کے طور پر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔اس لیے جہاد کے اجراء کے اہم اسباب درجِ ذیل حالات کو قرار دیا جاسکتا ہے:(۱)

۱۔ مسلمانوں کی جان، مال اور علاقے سے جارحیت کا خاتمہ

یہ ایک ایسا فطری اور قدرتی حق ہے جس کو بین الاقوامی قوانین اور انسانی رسم و رواج نے ماضی میں بھی تسلیم کیا اور آج بھی اسے تسلیم کیا جاتا ہے، اس سے کوئی قانون منع نہیں کرتا۔ اس حق کی خاطر لڑنا ایک جائز جنگ ہے۔ اس لیے کہ یہ زیادتی اور جارحیت کے خلاف محض دفاعی جنگ ہے۔

یہ حق اس وقت تک باقی رہے گا جب تک نوع بشر میں خواہشات اور مفادات کا لالچ رہے گا اور جب تک وہ زندگی میں زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کے ارادوں پر قائم رہے گی ۔یہ وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے شر و فساد اور کشمکش کی کیفیت طاری رہے گی اور یہی کیفیتِ مشروعیتِ جہاد کی بقاء کا لازمی سبب بنی رہے گی۔اسی چیز کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:**الجهاد ماضٍ الی یوم القیامة**۔(۲)(جہاد قیامت تک جاری رہنے والا ہے)۔

۱۔ آثار الحرب، ڈاکٹر وهبة الزحيلي، ص ۹۳، نظام الإسلام، ڈاکٹر وهبة الزحيلي، ص ۳۶۸، العلاقات الدولية، أبوزهرة، ص ۹۲

۲۔ ابو داؤد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **والجهاد ماضٍ منذ بعثنی اللّٰہ إلی ان يقاتل آخر أمتي الدجال لايبطله جور جائر ولا عدل عادل**......(جہاد اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب میری امت کے آخری لوگ دجال سے لڑیں گے۔ جہاد کو نہ ظالم کا ظلم ختم کر سکے گا نہ عادل کا عدل......) نصب الرأية ۳:۳۷۷

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دفاع اور مزاحمت کے حق اور حدود کو اس طرح بیان فرمایا ہے:﴿وَقَاتِلُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبِّ الْمُعْتَدِينَ﴾ [البقرة:۱۹۰](اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو، کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)، نیز فرمایا: ﴿الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ. فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُواْ عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ﴾ [البقرة: ۱۹۴](ماہ حرام کا بدلہ ماہ حرام ہی ہے اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہوگا، لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے تو تم بھی اس پر اتنا تجاوز کرلو جس قدر اس نے تم پر کیا)، اور﴿وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً﴾ [التوبة: ۹] (اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں)۔

معلوم ہوا کہ جب کفار مسلمانوں سے جنگ کریں تو ان پر بھی قتال واجب ہوجاتا ہے ۔یعنی کفار کی طرف سے ایسے حالات پیدا کردیے جائیں جو جنگ کا سبب بن سکتے ہوں، یا جنگ کا جواز بن رہے ہوں یا ایسی غرض وغایت پیش آجائے جس کی بجا آوری جنگ کے بغیر ممکن نہ ہو۔اس کے لیے کفار کی طرف سے عملاً جارحیت کا ارتکاب ضروری نہیں، بلکہ اس قدر علم ہوجانا کافی ہے کہ دشمن مسلح جارحیت کا عزم کرچکا ہے،جیسا کہ کسریٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنالیا تھا۔ اب یہ کوئی عقلمندی نہ ہوتی کہ مشرق کی طرف سے ایرانیوں اور مغرب کی طرف سے رومیوں کے مسلمانوں پر ہلہ بولنے کا انتظار کیا جاتا،خصوصا ان حالات میں جب کہ وہ لوگ جارحانہ کارروائیوں کا ایک سلسلہ شروع کرچکے تھے ۔ حضرت علیؓ کا فرمان ہے: ''اللہ کی قسم! جس قوم پر اپنے گھر کے اندر حملہ ہو جائے وہ قوم ذلیل ہو جاتی ہے''۔

۲۔ مذہبی آزادی اور تبلیغِ اسلام کی ضمانت اور مذہب میں مداخلت کا انسداد

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کا پیغام حق ہے اور آزادئ تبلیغ کا تحفظ شرعاً واجب ہے۔ جب انسانوں تک تبلیغِ اسلام کے درمیان رکاوٹیں کھڑی کردی جائیں تو اسلامی طاقت کی موجودگی میں طاقت کے زور سے اس مقصد کا حصول فرض ہو جاتا ہے تاکہ لوگ آزادانہ طور پر اسلام قبول کرسکیں۔

جب یہ صورت حال پیدا ہوجائے تو اسے دشمن کی جارحیت ہی تصور کیا جاتا ہے۔ماضی میں جب دشمنانِ اسلام نے بہت سے مسلمان طبقات کوظلم وجبر کا نشانہ بنایا تو فی الواقع یہی صورت حال تھی۔ اسی پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا:﴿أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ﴾ [الحج: ۳۹](اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے)اور﴿وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾[البقرۃ: ۱۹۱](اور ان کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے اور فتنہ قتل و خونریزی سے کہیں بڑھ کر ہے) اور ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِيْنَ﴾[البقرۃ: ۱۹۳] (تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں کرنی چاہیے)۔

یہ جنگیں دین یا ملک کو بیرونی خطرات سے بچانے کے لیے دفاعی جنگیں تھیں۔ جب دورِ جدید کے ممالک اپنے معاشی مفادات کوتحفظ دینے کی خاطر تباہ کن جنگیں چھیڑتے ہیں، جو کہ محض مادی مفادات ہیں، تو یہ جنگ تو انسانوں کے ذاتی مفادات کی جنگ تھی۔

۳۔ مظلوم فرد یا گروہ کی مدد کی خاطر جنگ

اس صورت حال میں جنگ کے جواز کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح واضح فرمایا ہے:﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَـٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا﴾ [النساء: ۷۵](آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو فریاد کر رہے ہیں کہ پروردگار ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں)۔

اس قسم کی جنگ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون، نیز ظلم و جارحیت اور فساد فی الارض کے خلاف مزاحمت کی خاطر مظلوموں کے ساتھ ہم آہنگی شمار ہوتی ہے، جو ان حالات میں ضروری ہوجاتی ہے۔ یہ جارحیت سے دفاع کی ایک صورت ہی بن جاتی ہے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے مقابلے میں بنوخزاعہ کی اس وقت مدد فرمائی تھی جس وقت قریش نے صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کی اور بنوخزاعہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد مانگی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مظلوم کی حمایت کے لیے دورِجاہلیت میں کیے گئے معاہدے ''حلف الفضول'' کو اسلامی دور میں بھی برقرار رکھا اور فرمایا: اِنَّ الإسلامَ لایزیده إلا شدّة (۱) یعنی اسلام اس کو مزید مستحکم ہی بناتا ہے۔ تاہم یہ تعاون مسلمانوں کی طرف سے معاہدات کی خلاف ورزی نہ کرنے کے ساتھ مشروط رہتا ہے۔ جیسے ارشاد باری ہے:﴿وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ﴾ [الأنفال: ۷۲](ہاں اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو)۔

مختصر کہ مشروعیتِ جہاد کی یہ تیسری صورت ظلم کی سرکوبی کے لیے جائز رکھی گئی ہے۔ یوں اسے تادیبی جنگ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے جو کہ امنِ عامہ کے تقاضے کے پیشِ نظر لڑی جاتی ہے۔

یہ تمام صورتیں جو تبلیغِ اسلام کے تحفظ کے ضمن میں آتی ہیں،موجودہ عالمی قانون کے تحت تسلیم شدہ کسی بھی ریاست کے فطری حقوق کے دائرے سے کسی طرح باہر نہیں ہیں۔ ایک ریاست کے فطری حقوق حسب ذیل ہیں: حق بقاء، حق دفاع، حق

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں کیے گئے حلف کے دوران موجود تھا۔ مجھے وہ حلف سرخ اُونٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے اور اگر آج اسلامی دور میں بھی مجھے اس کے لیے بلایا جائے تو میں اس میں شرکت کے لیے حاضر ہوں گا۔ سیرۃ ابن ہشام ۱:۱۳۴، ط الحلبي البابي۔

مساوات،حق حریت، اور حق احترام باہمی۔(۱) ان حقوق میں سے کسی کے خلاف جارحیت کی صورت میں اسلام کے مطابق جنگ کا جواز فراہم ہوتا ہے ۔ جارحیت سے مراد ہر وہ ظالمانہ کار روائی ہے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر مسلمانوں کی جان و مال اور علاقے کے خلاف عمل میں آئے۔

جارحیت کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ مسلمان مکمل طور پر ظلم وزیادتی کا شکار ہو چکے ہوں تب جہاد شروع کرنے کا حکم ہے، بلکہ اگر حالات جنگ کا تقاضا کر رہے ہوں اور دھمکی آمیز صورت حال کا سامنا ہو تو مسلمان خود آگے بڑھ کر اقدامی طور بھی جنگ کی ابتدا کر سکتے ہیں۔ ہر ملک کا حق خود مختاری اسے اپنے حقوق یا اپنی رعایا یا انسانیت کے دفاع کی خاطر مداخلت کا حق بھی فراہم کرتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ تبلیغِ اسلام کی رکاوٹیں دور کرنے کے لیے لڑی جانے والی جنگ آج کی اصطلاح میں دوسروں کے معاملات میں مداخلت سمجھی جاتی ہے اور مداخلت جارحیت ہوتی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ آج کل بھی امنِ عامہ، اِثباتِ حق اور باطل کی سرکوبی کے لیے مداخلت کرنا جائز سمجھا جا تا ہے۔ اسی طرح انسانیت کے دفاع، اور اقلیتوں پر ریاستی ظلم کی صورت میں مداخلت بھی درست سمجھی جاتی ہے۔(۲)

تاریخی حقیقت کے طور پر دیکھا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگیں اور آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہؓ کی جنگیں یا تو معاہدات کی خلاف ورزی کے نتیجے میں لڑی گئیں جیسے مدینہ میں بنو قینقاع کے یہودیوں کے ساتھ اور قریش مکہ کی طرف سے صلح حدیبیہ کے معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں حضورؐ نے ان سے جنگ لڑی تھی۔ کچھ جنگیں جارحیت سے دفاع کے لیے لڑی گئیں، جیسے غزوۂ احد اور غزوۂ خندق وغیرہ۔

۱۔ القانون الدولي العام، ڈاکٹر علی ابو ھیف، ص۱۸۷، ۲۰۶

۲۔ أصول القانون الدولي، ڈاکٹر حامد سلطان وعبداللہ العریان، ص ۵۸۳،القانون الدولي العام ڈاکٹر علی ابو ہیف، ص ۲۰۶، طبع ۱۹۵۹ء، الرسالة الخالدة ، پروفیسر عبدالرحمٰن عزام، ص ۸۰

اسی طرح کچھ معرکے قصاص اور معاملہ بالمثل کے طور پر، کچھ اقتصادی حصار کے طور پر جسے عصرِ حاضر میں بھی قانونی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی مثال جنگِ بدر الکبریٰ ہے جو ان اسلامی املاک کے معاوضہ کی وصولی کے لیے لڑی گئی جو مکہ میں غصب کر لی گئی تھیں۔ کچھ جنگیں امکانی جارحیت کی روک تھام اور حفظ ما تقدم کے طور پر لڑی گئیں جیسے مشرق اور شمال میں رومیوں اور ایرانیوں کے ساتھ معرکے ہوئے اور جس طرح شمالی افریقہ میں ہوئے۔(۱) اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ اِسلام ہر طرف سے یوں غیروں کے نرغے میں آ گیا تھا جیسے کوئی بھیڑیوں کی سرزمین کے بیچ پھنس کر رہ گیا ہو، ہر طرف سے اسے کھا جانے والی آنکھوں سے دیکھا جاتا تھا۔ دشمن کی طرف سے عملاً اشتعال انگیزیاں شروع ہو گئی تھیں اور ان کی افواج جنگی کارروائی کے لیے تیار کھڑی تھیں، یہاں تک کہ ایران کے بادشاہ کسریٰ نے ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک لانے کے لیے روانہ کردیا، روم کے بادشاہ ہرقل نے شام میں اسلام قبول کرنے والے چند والیوں کو قتل بھی کر دیا۔

کچھ اِسلامی فتوحات ایسی بھی ہوئیں جن کا مقصد دشمن کے زیرِ اثر اور اس کے حلیف علاقوں میں اس کی طاقت اور دبدبہ کو کمزور کرنا تھا تا کہ رومیوں کے وفادار جابر حکمرانوں کے ظلم کا خاتمہ کیا جائے۔ اس کی مثالیں مصر اور شمالی افریقہ کی فتوحات ہیں۔ اسی طرح ہندوستان اور اس کے پڑوسی علاقوں کو فتح کرکے ایرانیوں کے اثر و رسوخ کو کم کرنا مقصود تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے مصریوں سے جنگ نہیں لڑی تھی بلکہ ان کی جنگ اپنے جھگڑالو دشمن اور اقوام پر ظلم ڈھانے والے رومیوں سے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مصر کے قبطیوں نے بیزنطیوں کی غلامی سے آزادی دلانے پر عربوں کو خوش آمدید کہا۔(۱)

۱۔ الرسالة الخالدة، پروفیسر عزام، ص ۱۹۸-۲۰۴

۱۔ الدعوة إلى الإسلام، آرنلڈ، ص ۱۲۳

اگر دشمنانِ اسلام امن و سلامتی پر کاربند رہتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ ان سے نہ لڑتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ...... ﴾ [الأنفال: ٦١](اور اے نبی! اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو......)

جہاں تک افریقہ، ایران، وسطی ایشیا، ہندوستان، چین اور جنوب مشرقی ایشیائی ممالک میں اسلام کی اشاعت کا تعلق ہے تو یہ تاجروں، علماء، قاضیوں، اور صوفی منش حجاج کی وجہ سے پھیلا ہے۔(۱) برطانوی محقق جارج سیل جس نے قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، اس نے کہا ہے:

> جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف تلوار کی نوک سے پھیلا ہے وہ نہایت دھوکے میں ہیں، انہوں نے ان وجوہات کو نہیں ڈھونڈا جن کی وجہ سے دین محمدیؐ کو ایسا قبول عام حاصل ہوا جس کی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔(۲)

آرنلڈ کہتا ہے:

> اس بات میں بہت ہی کم حقیقت پائی جاتی ہے کہ اسلام اسلحے کے زور سے آگے بڑھ رہا ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب افریقہ یورپی طاقتوں کے درمیان تقسیم ہوگیا اور ہر طاقت نے اپنے ماتحت آنے والے مسلمان سربراہوں کے ہاتھوں سے تلوار چھین لی تو حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد تبلیغِ اسلام کو وہاں کامیابی ملی، حالاں کہ مسلمانوں سے اقتدار چھنے کئی صدیاں گزر چکی تھیں۔(۳)

۱۔ آرنلڈ، حوالۂ سابقہ، ص ۳۴۹ وما بعد، ۲۳۵ وما بعد، ۲۴۸ وما بعد، ۲۸۵ وما بعد، ۳۳۱، ۴۰۱ وما بعد

۲۔ آرنلڈ، ص ۱۶

۳۔ الدعوة إلى الإسلام، ص ۴۰۰

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا، یہ صرف کینہ ور دشمنوں کا غلط خیال ہے۔ بلکہ اِسلام کی اشاعت کا سبب یہ ہے کہ اسلامی دعوت اعلیٰ اقدار اور اصولوں پر مشتمل ہے۔ لوگوں پر شفقت، عدل و انصاف کا قیام، آسانیاں اور دریا دِلی، حقیقت پسندی اور بھلائی، مساوات اور شورائیت اس کے نمایاں اوصاف ہیں۔ ایمان وعقیدہ کو لوگوں کے دل و دماغ میں راسخ کرنے کا ذریعہ، اسے وضاحت سے بیان کرنا، معقول دلائل کا استعمال، بحث و گفتگو کا بھلا انداز اور مسلمانوں کا حسنِ کردار رہا ہے۔(۱)

رہا جنگ لڑنا تو وہ دعوت کی راہ ہموار کرنے اور اس کی نشر واشاعت کے عمل کے دوران پیدا ہونے والے حالات کا ایک فطری نتیجہ تھا جو بتدریج ظاہر ہوتا چلا گیا۔ چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب اور یہود ضد اور عناد سے اس کی راہ میں رکاوٹ بنے اور انہوں نے تشدد کی راہ اپنائی، جب کہ خلفاءِ رسولؐ کے زمانے میں ایرانیوں، رومیوں اور دیگر اقوام کی طرف سے اِس کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاجِ مبارک یہ تھا کہ کوئی کافر بھی آپ کے ساتھ امن کا معاہدہ کرتا تو آپؐ اس سے جنگ نہیں کرتے تھے، خواہ وہ مشرکینِ عرب میں سے ہوتا یا کوئی دوسرا کافر ہوتا۔ یہ بات سیرت، حدیث، تفسیر، فقہ اور مغازی کی تمام کتابوں سے واضح ہے۔ یہی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی ثابت ہے۔ آپؐ نے کسی بھی کافر سے جنگ کرنے میں پہل نہیں کی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر کافر سے لڑنے کا حکم دیا ہوتا تو آپؐ کافروں کو قتل کرنے اور ان سے لڑنے میں پہل کرتے''۔(۲)

۱۔ آثار الحرب، ص ۷۵-۷۸

۲۔ رسالۃ القتال، ص ۱۲۵

اسلامی جہاد دفاعی ہے یا اِقدامی؟

دراصل آج کل لوگوں کے ذہنوں میں دفاع کا جو مفہوم رائج ہے اسے جہاد سمجھنا صحیح نہیں۔ اس لیے کہ جہاد ایک مخصوص قسم کی جنگ ہے، جس کا ایک مقدس ہدف ہے۔ کبھی یہ صرف دفاع کے لیے ہوتا ہے تو اس کی پہلے سے تشہیر کی جاتی ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ جنگی حکمت عملی کے تحت اس کے اچانک اعلان کی ضرورت پڑ جاتی ہے یا کسی پڑوسی دشمن کی طرف سے مسلمانوں کے گرد خطرناک حالات کا اندازہ ہوجائے تو حملہ کرنے میں پہل کی جاتی ہے۔

چناں چہ جدید بین الاقوامی قانون میں جنگ کی دفاعی اور اقدامی دو قسموں میں تقسیم اسلامی جہاد پر منطبق نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ یہ تقسیم ریاستوں کی علاقائی سرحدوں کے پیشِ نظر وجود میں آئی ہے، جو کہ انسانی طمع اور مادی مفادات کی بنیاد پر قائم ہے۔ جہاد کو اقدامی عمل اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ حملہ آور ہونا بنیادی طور پر ظلم ہے، جب کہ جہاد سراسر عدل ہے۔ یہ تو لازوال انسانی اقدار کا تحفظ کرتا ہے اور لوگوں کو دعوت حق کی تبلیغ کرکے ان کے لیے ہر قسم کی بھلائیوں کا راستہ کھولتا ہے ۔ یہ خیرِ مطلق ان کی اِصلاح، ظالموں کے ظلم سے نجات اور فضول لوگوں کی فضولیات سے خلاصی کو محیط ہے۔ اسی کی بدولت ہر شخص مکمل آزادی کے ساتھ ہر دین کی حقانیت کو پرکھ کر اپنے شرح صدر، اطمینانِ قلب اور ضمیر کے مطابق فیصلہ کرسکتا ہے۔

جہاں تک بین الاقوامی قانون میں جنگ کی معروف تقسیم کا تعلق ہے تو پہلی بات یہ ہے کہ یہ جہاد کے نظریے سے ہم آہنگ ہی نہیں، اس لیے کہ اسلام قومیت کی بنیاد پر وطن کی سرحدات پر یقین ہی نہیں رکھتا جس کے نتیجے میں ایک ملک کے باشندے صرف اسی ملک کے دفاع کے پابند رہیں بلکہ اسلام کا دائرہ بہت وسیع ہے اور جہاد کا عمل اپنی طاقت کے مطابق ہر جگہ اسلام کے مبلغین کے تحفظ کے لیے ہے۔ جہاں تک مذکورہ تقسیم کا تعلق ہے تو وہ جدید ریاستوں کے سرحداتی نظام سے مناسبت رکھتی ہے۔

دوم یہ کہ بین الاقوامی قانون کے ماہرین کے نزدیک اس تقسیم کی سرے

سے کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ اس لیے کہ تاریخی شواہد سے اس تقسیم کی خلاف ورزی اور اسے چیلنج کرنا ثابت ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ جنگ کے حامی ممالک ایک منصوبے کے تحت اپنے مخالفین کو اشتعال دلاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی طرف سے کچھ اقدامی کارروائی ہوجاتی ہے اور پھر یہ اس دعوے کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑتے ہیں کہ وہ اپنے مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں۔

یوں جہاد ایک مخصوص طرز کا عمل ہے۔ یہ نہ تو دنیا پر ظلم ڈھانے والی یورش ہے اور نہ ہی ایک تنگ دائرے میں کسی ملک کی سرحدات کے دفاع اور انسانی مفادات کے تحفظ کی جنگ ہے، بلکہ وہ ایک عادل حکمران کے ہاتھ میں تبلیغِ اسلام کے تحفظ اور مسلمانوں کے دفاع کا ایک ذریعہ ہے جیسے کہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں۔ یہ دفاع کبھی تو جاری مسلح جارحیت کے مقابلے میں براہ راست کیا جاتا ہے اور کبھی دشمن کی طاقت کو کم کرنے، اس کے گرد گھیرا ڈالنے یا جنگی حکمت عملی کے تحت دشمن کے خلاف یکجہتی پیدا کرنے کی تحریک کی صورت میں بالواسطہ ہوتا ہے۔ مصر، شمالی افریقہ، اندلس (ہسپانیہ) کی فتوحات مغرب میں رومیوں کا زور توڑنے اور اثر رسوخ کمزور کرنے کے لیے عمل میں لائی گئی تھیں۔ یہ سب کچھ جنگی پالیسی اور ملک کو متوقع حملہ سے بچانے کے تقاضے کے تحت تھا۔

اسی لیے ابن خلدونؒ نے جنگ کو صرف اس وقت جائز قرار دیا ہے جب وہ ملک سے باہر ہو تو اللہ کی راہ میں ہو اور دین کی خاطر لڑی جائے اور اگر اندرونِ ملک ہو تو قانون توڑنے والوں کی گوشمالی اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے لڑی جائے۔(۱)

۱۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۳۵

تیسری بحث

جنگ کا آغاز

جب دشمن جنگ میں پہل کرے تو مسلمان حکمران جہاد فی سبیل اللہ کا اعلان کرتا ہے۔ جہاد کا مطالبہ ہر اس مسلمان سے کیا جاتا ہے جو جہاد کرنے کے قابل ہو۔ یہ فرض کفایہ ہے جو درجہ بدرجہ عائد ہوتا چلا جاتا ہے، پہلے ان مسلمانوں پر جو اس کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں، پھر ان کے بعد والوں پر، پھر ان کے بعد والوں پر، یہاں تک کہ اس کی ذمہ داری بڑھتے بڑھتے تمام مسلمانوں کو محیط ہوجاتی ہے۔ اس سطح پر وہ ہر بالغ اور عقلمند مسلمان پر فرض عین قرار پاتا ہے جو اسلحہ استعمال کرنے کے قابل ہو یہاں تک کہ ظالم قوتوں کو مار بھگایا جائے۔

البتہ اگر مسلمان حکمران کسی دشمن کے خلاف جہاد کا اعلان کرنا چاہے تو وہ تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے کرے گا:(۱)

اوّل: تنبیہ کے بغیر جنگ کا آغاز

اس کا مطلب یہ ہے کہ دورِ جدید کی جنگی حکمتِ عملی کی طرح بغیر اطلاع فوجی کارروائی کا آغاز کرنا۔ اگر دشمن سے جنگ کی صورت حال پہلے سے موجود ہو، یا دشمن نے جنگ چھیڑ دی ہو، یا اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہو اور لڑنے کی تیاری کر رکھی ہو تو ان حالات میں مسلمان جنگ کی ابتدا کر سکتے ہیں، اور کسی اعلانِ جنگ اور تنبیہ کے بغیر بھی دشمن پر ہلہ بولا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ خود دشمن ہی لڑائی چھیڑنے کا سبب بنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کے یہودیوں کا محاصرہ کیا

۱۔ آثار الحرب، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، ص ۱۴۹، نظام الإسلام، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، ص ۳۷۰

تھا اس لیے کہ انھوں نے معاہدہ توڑ کر غزوۂ خندق کے موقع پر مشرکین کا ساتھ دیا تھا، جسے غزوۂ اَحزاب بھی کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جونہی جنگِ احزاب سے فارغ ہوکر واپس آئے تو فرمایا: **ألا لا يُصَلّينَّ أحد الظهر– وفي رواية العصر– إلا في بني قُريظة** (۱)(ظہر کی نماز کوئی نہ پڑھے، اور دوسری روایت کے مطابق عصر کی نماز کوئی نہ پڑھے، بلکہ یہ نماز بنوقریظہ کے ہاں جا کر پڑھیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر بھی قریش کو کوئی تنبیہ جاری نہیں کی، اس لیے کہ انہوں نے غداری اور خیانت کرکے خود پہل کی تھی۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگی تھی کہ انہیں خبر نہ ہونے پائے یہاں تک کہ ان پر اچانک حملہ ہوجائے۔ اسی طرح اہلِ خیبر، شام کے علاقے بلقاء کی جانب واقع مقامِ اُبنیٰ، اور بنی مصطلق پر مسلمانوں نے اچانک ہلہ بولا تھا کیوں کہ ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی حالت پہلے سے موجود تھی۔(۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان مشرکین کے بارے میں پوچھا گیا جن کے گھروں پر رات کو حملہ کیا جائے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو بھی کچھ نقصان پہنچ جائے تو آپؐ نے فرمایا: **هُمْ مِنْهُمْ** (یہ بھی انہی میں سے ہیں)۔(۳)

دوم: دشمن کی طرف سے اعلانِ جنگ اور عہد شکنی

جب مسلمان حاکم کو کسی حلیف دشمن سے خیانت کا اندیشہ ہوجائے، مگر اس کی طرف سے ابھی جاسوسی، قتل یا فساد فی الارض کی نوبت نہ آئی ہو، تو اس کے ساتھ جنگ نہ کی جائے بلکہ معاہدہ ختم کرکے اسے جائے امن تک پہنچا دیا جائے تاکہ اس کے ساتھ کوئی دھوکہ یا خیانت نہ ہوجائے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کا اصول ہے:'' غداری کے

۱۔ نووی، شرح مسلم، ج ۱۲، ص ۶۷

۲۔ عینی شرح بخاری ۱۴:۲۶۰، جامع ترمذی ۲:۳۷۷، الروضة الندية ۲:۳۴۰

۳۔ مغني المحتاج ۴:۲۶۲، طبع دوم، البحر الزخار ۵:۳۹۵، الروض النضير ۴:۲۹۷

بغیر عہد کو پورا کرنا غداری کے بدلے غداری کرنے سے بہتر ہے"۔

جائے امن تک پہنچانا اس صورت حال کے مشابہ ہے جسے آج کل غیرملکیوں کی ملک بدری سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی کسی کو علاقہ چھوڑنے کا پابند بنانا یا اسے اس کی رضامندی کے بغیر علاقے سے نکال دینا۔

آج کل جائے امن تک پہنچانے کی ایک ہی صورت رائج ہے کہ حالت جنگ میں یا دو ممالک کے درمیان اختلافات کی وجہ سے تعلقات منقطع ہوجانے کی صورت میں سفیروں اور سفارتی عملے کو سفری سہولیات فراہم کرکے ملک بدر کردیا جاتا ہے۔

جائے امن سے مراد ہر وہ جگہ ہے جہاں انسان کو اپنی جان اور مال کا تحفظ حاصل ہو۔ یہ دارالاسلام سے قریب ترین دارالحرب کا کوئی بھی مقام ہوسکتا ہے۔ اگر موجودہ عرف میں اس کا مطلب اس شخص کا اپنا وطن لیا جائے تو یہ قرین قیاس ہے، جیسا کہ ابن کثیرؒ نے کہا ہے۔ اوزاعیؒ سے منقول ہے کہ جائے امن سے مراد دشمن کے پڑاؤ کی جگہ ہے۔

سوم:　جنگی تنبیہ یا اسلام کی طرف دعوت

مالکی اور زیدی فقہاء کے نزدیک ہر جنگ سے پہلے اسلام کی دعوت دینا واجب ہے،(۱) چاہے یہ دعوت دشمن تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ ان کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:﴿سَتُدْعَوْنَ إِلَى قَوْمٍ أُوْلِى بَأْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ أَوْ يُسْلِمُوْنَ﴾ [الفتح: ۱۶](عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا جو بڑے زورآور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ اسلام لے آئیں گے)

ان کی دوسری دلیل یہ حدیث ہے جس میں عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا ہے: مَا قاتلَ رسول الله صلى الله عليه وسلم قوماً إلاّ دعاهم (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

۱۔　المدونة ۳:۲-۳،الخرشي ۳:۱۳۰

اسلام کی طرف دعوت دیئے بغیر کسی قوم سے لڑائی نہیں لڑی)۔(۱) اسی طرح ایک اور حدیث کے مطابق حضرت بُریدہؓ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک یہ تھا کہ جب کسی شخص کو کسی لشکر یا کسی فوجی دستے کا امیر بناتے تو اسے وصیت فرماتے کہ اپنے قریبی ساتھیوں اور اپنے دیگر مسلمان ساتھیوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتا رہے اور پھر یہ باتیں ارشاد فرماتے: **وإذا لقيتَ عدوك من المشركين، فادعهم إلى ثلاث خصال أو خلال، فأيتهنَّ ما أجابوك فاقبل منهم وكُفَّ عنهم......، فإن أبوا فسلهم الجزية، فإن أجابوك فاقبل منهم، وكُفَّ عنهم، وإن أبوا فاستعن بالله وقاتلهم......**(۲)(اور جب تیرا سامنا مشرک دشمنوں سے ہو جائے تو انہیں تین باتوں کی طرف دعوت دینا۔ اگر وہ ان تینوں میں سے ایک بھی مان لیں تو اسے منظور کر لینا اور ان کے ساتھ لڑنے سے باز رہنا۔ انہیں اسلام کی دعوت دینا، اگر مان لیں تو قبول کر لینا اور نہ مانیں تو ان سے جزیہ طلب کرنا۔ اگر وہ جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں تو اسے منظور کر لینا اور ان سے لڑنے سے باز رہنا۔ اور اگر وہ یہ بات بھی نہ مانیں تو پھر اللہ سے مدد مانگ کر ان سے لڑائی کرنا)۔

جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کو فتح کرنے کے لیے معاذ بن جبلؓ اور ان کے ساتھیوں کو روانہ کیا تو انہیں یہ نصیحت فرمائی: **لا تقاتلوهم حتى تدعوهم ، فإن أبوا فلا تقاتلوهم حتى يبدأوكم، فإن بدأوكم فلاتقاتلوهم حتى يقتلوا منكم قتيلاً، ثم أروهم ذلك، وقولوا لهم: هل إلى خير من هذا السبيل،**

۱۔ احمدؒ، بیہقیؒ، ابو یعلیٰؒ، طبرانیؒ، حاکمؒ۔ اس کی تائید امام احمدؒ کی روایت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے فروہ بن مسیک کے حوالے سے نقل کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آیا میں اپنی قوم کے ہر سامنے آنے والے اور ہر پیٹھ پھیرنے والے سے لڑوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! ہاں۔ پھر جب میں لوٹ کر جانے لگا تو آپؐ نے مجھے بلایا اور فرمایا: ان سے جنگ نہ کرنا جب تک انہیں اِسلام کی طرف دعوت نہ دے لو۔ نیل الأوطار ۷:۲۳۲

۲۔ بخاری کے علاوہ متعدد محدثین نے اس روایت کو سلیمان ابن بُریدہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

فلأن يهدي الله على يديك رجلاً واحداً خير مماطلعت عليه الشمس وغربت۔ (ان کے ساتھ لڑائی نہ کرو جب تک انہیں اِسلام کی دعوت نہ دے لو، اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کردیں تب بھی اس وقت تک ان سے جنگ نہ کرنا جب تک وہ پہل نہ کریں۔ اگر وہ پہل کردیں تب بھی تم اس وقت تک ان سے نہ لڑنا جب تک وہ تم میں سے کسی کو قتل نہ کر دیں پھر انہیں دکھا دینا اور بتا دینا کہ آیا اسلام سے عمدہ اور بہتر کوئی دوسرا طریق زندگی ہے؟ یہ سب کچھ اس لیے کرنا کہ اگر تمہارے ہاتھوں ایک بھی فرد کو اللہ اسلام کی ہدایت سے نوازدے تو یہ تمہارے لیے ان تمام چیزوں سے بہتر ہوگا جن پر سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے)۔

غزوۂ خیبر کے موقع پر حضرت علیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا: یا رسول اللہؐ کیا ہم اس وقت تک ان سے جنگ کریں گے جب تک یہ لوگ ہم جیسے مسلمان نہ بن جائیں؟ تو آپؐ نے فرمایا تھا: **علىٰ رِسلكَ حتى تنزل بساحتهم، ثم ادعهم إلى الإسلام، فوالله لأن يهتدي بك رجل واحد خير لك من حمر النعم**(۱)(جلدی نہ کرو یہاں تک کہ جب تک تم ان کے علاقے میں پہنچ نہ جاؤ، پھرانہیں اسلام کی دعوت دو۔ اللہ کی قسم اگر تمہارے ذریعے ایک فرد بھی ہدایت پر آ جائے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں کے حصول سے زیادہ بہتر ہوگا)۔

لیکن احناف، شوافع، حنابلہ، امامیہ اور اباضیہ کی رائے یہ ہے کہ(۲) جنگ سے پہلے ایسے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے جنہیں اس سے پہلے نہ پہنچی ہو۔ لیکن جب اسلام پھیل گیا ہو اور خوب واضح ہو چکا ہو اور لوگوں کو معلوم ہو چکا ہو کہ انہیں کس چیز کی دعوت دی جا رہی ہے اور ان سے کیوں جنگ کی جا رہی ہے تو انہیں اسلام کی دعوت دینا مستحب کے درجے میں ہوتا ہے تا کہ اطلاع اور تنبیہ کی حجت تمام ہوجائے۔

۱۔ بخاری، احمد، مسلم

۲۔ مجمع الأنهر ۱: ۴۹۶، مغني المحتاج ۴: ۲۲۱، المغني ۸: ۳۶۱، المختصر النافع في فقه الإمامية، ص ۱۱۱، الروضة البهيّة عند الإماميّة ۱: ۲۱۸، شرح النيل ۱۰: ۴۱۷

ان کی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ بالا احادیث جن میں دعوت کے ابلاغ کا حکم ہے اور ان احادیث میں مطابقت پیدا کر دی جائے جن کے مطابق دشمنانِ اسلام پر اچانک حملہ کرنے کا جواز ملتا ہے۔ اس کی ایک مثال حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی روایت کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو مصطلق پر اس وقت حملہ کردیا تھا جب وہ بے خبر تھے اور ان کے مویشیوں کو پانی پلایا جا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لڑنے والوں کو قتل کیا اور گرفتار شدگان کو قیدی بنا لیا۔(۱) اسی طرح حضرت اسامہ بن زیدؓ نقل کرتے ہیں کہ مجھے یہ حکم فرمایا تھا: أغِر علیٰ أُبنٰی صباحاً وحَرّق (اُبنٰی پر صبح سویرے یلغار کرنا(۲) اور اسے جلا دینا(۳) اور یلغار دعوت دیئے بغیر حملہ کرنے کو کہا جاتا ہے۔

مگر میری رائے میں مسلمانوں کی طرف سے دشمن کو اسلام کی دعوت پہنچنا اور مقصد جنگ بتلانا ضروری ہے، خواہ یہ دعوت عملاً دی جائے یا کسی طریقے سے اس کا مقصد پورا ہوجائے۔ اس لیے کہ جن کافروں پر دورِ اوّل کے مسلمانوں نے حملے کیے تھے انہیں یقیناً اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کے مقاصد سے آگہی ہو چکی تھی۔ دعوت کے ابلاغ میں دھمکی بھی ضمناً آہی جاتی تھی ۔ اس کے بعد یلغار ہونے یا بے خبری میں حملہ کرنے کا انحصار جنگی حکمت عملی پر ہے جس کا طبعی تقاضا رازداری ہوتا ہے۔

تقابلی جائزہ

سب جانتے ہیں کہ دورِ حاضر کے ممالک کے درمیان جنگ کا آغاز تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے ہوتا ہے:(۴)

۱۔ مسلم، بخاری، احمد، بیہقی

۲۔ اُبنٰی فلسطین میں عسقلان اور رملہ کے درمیان ایک علاقے کا نام ہے۔

۳۔ ابو داوٗد، ابن ماجہ

۴۔ قانون الحرب والحیاد ،ڈاکٹر محمود سامی جنینہ،ص ۹۴-۱۰۵، القانون الدولي العام ، ڈاکٹر علی ابوھیف ،ص ۶۵۵ وما بعد، مبادئ القانون الدولي العام ، ڈاکٹر حافظ غانم،ص ۵۹۴ ومابعد

۱۔ جنگ کا اعلان کرنا: اس کو ہیگ کانفرنس، منعقدہ ۱۹۰۷ء کے مشترکہ اعلامیہ میں جنگی کارروائیوں کے آغاز سے متعلق معاہدہ نمبر ۳ میں ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ اطلاع یا آخری تنبیہ : اس کی طرف بھی مذکورہ بالا ہیگ کانفرنس کے مشترکہ اعلامیہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق قانونی طور پر اس کی کوئی ممانعت نہیں کہ کوئی ملک اِعلانِ جنگ کے بعد کسی بھی وقت حریف ملک کے خلاف اچانک کارروائی کر دے، خواہ یہ کار روائی اِعلان کے ایک منٹ بعد ہی شروع ہو جائے، جس طرح جرمنی نے دوسری عالمی جنگ میں ان تمام ممالک کے ساتھ کیا تھا جنہوں نے اس سے جنگ کی تھی۔ جاپان نے بھی بحرالکاہل میں امریکی بحری بیڑے کے ساتھ اسی طرح کیا تھا۔

۳۔ بغیر اِعلان جنگ کا آغاز: بین الاقوامی طور پر مروج طریقِ کار اور اکثر شارحینِ قانون کے نقطۂ نظر کے مطابق قانونی طور پر جنگ کا وجود قائم رہتا ہے خواہ اس کا اِعلان نہ بھی کیا جائے۔ چناں چہ ہیگ کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۷ء سے قبل عملاً بہت سی غیر اعلانیہ جنگیں ہوتی بھی رہیں۔ پھر اس معاہدے نے اچانک حملے کے ذریعے جنگ پر حاوی ہونے کی راہ میں کوئی ٹھوس رکاوٹ بھی کھڑی نہیں کی اور جب تک اشتعال انگیز کارروائیاں ہوتی رہتی ہیں اس وقت تک جنگ جاری سمجھی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہیگ کے اعلامیے میں اِعلان جنگ کا جو ضابطہ وضع کرنا مقصود تھا وہ بھی موجودہ دور میں بحران کا شکار ہو چکا ہے کیوں کہ دونوں عالمگیر جنگوں کے درمیانی عرصے میں بہت سے مواقع پر اس اصول کی پاسداری نہیں کی گئی جس کی وجہ سے وہ اس قدر کمزور پڑ گیا ہے کہ گویا جنگ سے متعلق منظّم اصول کے طور پر سرے سے موجود ہی نہیں۔(۱)

۱۔ قانون الحرب والحیاد ص ۱۰۱، مبادئ القانون الدولي العام، ڈاکٹر حافظ غانم، ص ۵۹۴، آثار الحرب از مؤلف، ص ۱۶۱

جدید جنگ اور خصوصاً ہمہ گیر یا ایٹمی جنگ کی کامیابی کا دارومدار تو بڑی حد تک دھوکہ، فریب اور اچانک کاروائی پر ہوتا ہے اور جنگی قائدین جنگ کے دوران کسی قانونی یا انسانی اصول کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

جہاں دورِ جدید کے ممالک اِعلانِ جنگ کی پابندی نہیں کرتے تو وہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے مغربی ممالک اعلامیۂ ہیگ، منعقدہ ۱۹۰۷ء سے پہلے اس اصول کو سرے سے جانتے ہی نہیں تھے۔

باقی جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی حجت اور دلیل پر مبنی تنبیہ کے بغیر جنگ شروع نہیں کی۔ اس تنبیہ میں بھی دشمن کو درجِ ذیل تین باتوں میں سے ایک اختیار کرنے کا موقع دیا جاتا تھا:

۱۔اسلام قبول کرلو　　۲۔ جزیہ دینا قبول کرلو　　یا　　۳۔جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ

اور اگر کبھی کسی مسلمان حکمران نے تنبیہ کے بغیر کسی قوم کے ساتھ جنگ لڑی تو ان کی جانوں کی دیت کی ذمہ داری اسی کو اٹھانا پڑی۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اِعلانِ جنگ کا اصول اسلام نے بین الاقوامی قانون سے بہت پہلے دے دیا تھا۔

بارون میشل ڈی ٹوب (Baron Michele de tob) نے کہا ہے:

> عصرِ حاضر میں اِعلانِ جنگ کی ابتدائی تاریخ سے ہم واقف ہیں۔ ایک بین الاقوامی اصول کے طور پر ۱۹۰۷ء میں ہونے والی دوسری ہیگ کانفرنس سے پہلے اس کا کوئی وجود نہ تھا، اگرچہ وہ فنِ سپاہ گری کا ایک اصول ہے مگر قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں اس کا نشان تک نہیں ملتا۔ البتہ اس کی جڑیں مشرقِ اسلامی میں بہت گہری رہی ہیں۔(۱)

۱۔　مجموعۂ بحوث، بارون میچل ڈی ٹوب، پولیٹیکل سائنسز اکیڈمی، ہیگ، ص ۳۹۳ وما بعد

ہارون مزید کہتا ہے کہ اعلانِ جنگ کے الفاظ مجھے ماوردی کے ہاں ملے۔ (۱)

جو کوئی بھی مسلمانوں کی طرف سے اپنی فتوحات میں اِعلانِ جنگ کے اصول کی پابندی دیکھنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اسلامی فتوحات کی تاریخ کی ورق گردانی کرے اور ان جنگوں کے حالات پڑھے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، ان کے بعد خلفاءِ راشدین نے اور ان کے بعد کے لوگوں نے حصہ لیا۔(۲)

چناں چہ خالد بن ولیدؓ نے کسی قوم سے بھی، ان مذکورہ تین باتوں کا اختیار دینے سے پہلے، جنگ نہیں لڑی۔ عمرو بن العاصؓ نے جس وقت مصر کو فتح کیا تو روم کے قائدین کو ان تینوں باتوں کی دعوت دی۔ اسی طرح سعد بن ابی وقاصؓ نے جنگ قادسیہ کے موقع پر اپنے ایلچی رِبعی کو ایرانی فوج کے قائد رستم کے پاس بھیجا تو رستم نے اس سے پوچھا تم لوگ کس لیے آئے ہو؟ ایلچی نے جواب دیا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ لایا ہے۔ اِس نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال

۱۔ الأحكام السلطانية، القاضي أبو الحسن علي بن محمد البصري الماوردي، ص ۳۵

۲۔ حنفی فقہ کی کتاب الهداية اورشرح فتح القدیر ۲۸۶:۴ میں ہے کہ مسلمان حکمران کے لیے اس فرد یا قوم سے جنگ کرنا جائز نہیں جسے اسلام کا پیغام نہ پہنچا ہو بلکہ اسے چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قائدینِ عساکر کو جس طرح وصیت فرماتے تھے، یہ بھی اس کے مطابق انہیں دعوت دے، آپؐ ارشاد فرمایا کرتے تھے: فادعهم إلى شهادة أن لا إلٰهَ إلا الله (پھر انہیں لا اِلٰہَ اِلاَّ اللہ کی گواہی دینے کی دعوت دو)۔اس طرح ان لوگوں کو احساس ہو جائے گا ہم ان سے مال چھیننے یا انہیں غلام بنانے کے لیے نہیں بلکہ دین کی سربلندی، عدل اور توحید کی بالادستی کی خاطر جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس طرح ہو سکتا ہے وہ اسلام قبول کر لیں اور ہم جنگ کا بوجھ اٹھانے سے بچ جائیں اور اگر اس نے دعوت دینے سے پہلے لڑائی کی تو گنہگار ہو گا لیکن اس پر تاوان نہ ہوگا۔ کیوں کہ مدمقابل دشمن کسی ایسی حالت میں نہیں تھا جس سے اس کے ساتھ جنگ منع ہو۔ یہ تحفظ یا تو اسلام کی وجہ سے ملتا ہے یا دارالاسلام کی وجہ سے۔ اس جنگ کا حکم دشمن کے بچوں اور عورتوں کے قتل کی طرح ہوجائے گا جو اگرچہ ممنوع ہے مگر مستوجب تاوان نہیں۔

کر اللہ کی بندگی میں لے آئیں اور مختلف نظاموں کے ظلم سے نکال کر اسلام کے عدل میں داخل کریں، تو جو کوئی اس چیز کو تسلیم کرلے گا ہم بھی اسے تسلیم کرلیں گے اور اس کو چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے اور اسے اپنی سرزمین پر قائم رہنے دیں گے۔ پھر انہوں نے اسے اسلام قبول کرنے یا جزیے پر صلح کرنے یا تین دِن کے بعد جنگ کے لیے تیار رہنے کا اختیار دیا۔(۱)

اسی طرح سلمان فارسیؓ نے بھی مدائن کو فتح کرتے وقت یہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ چنانچہ وہ جس قوم کے پاس بھی جاتے اسے کہتے: یا اسلام قبول کرلو یا معاہدہ کرلو اور یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اس سلسلے میں اصولوں کی پاسداری اور حق و اِنصاف کی پابندی کی ایک اعلیٰ مثال اہل سمرقند کا واقعہ ہے جسے ابن الأثیرؒ نے الکامل میں اور بلاذریؒ نے فتوح البلدان میں نقل کیا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ اہلِ سمرقند نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو قُتَیبة بن مسلم الباھلي کے ظلم وزبردستی کی شکایت کی کہ انہوں نے تنبیہ کیے بغیر ان سے جنگ لڑی ہے اور لوگوں کو اپنی سرزمین سے نکال باہر کیا ہے۔ اس پر عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے قاضی سلیمان بن ابی سری سے کہا کہ ان کے مقدمے کا فیصلہ کریں۔ قاضی نے فیصلہ دیا کہ عرب فوج وہاں سے نکل کر اپنی چھاؤنی میں چلی جائے اور برابری کی سطح پر آکر اِعلانِ جنگ کریں تاکہ نئے سرے سے معاہدۂ صلح ہو جائے یا طاقت کے زور پر فیصلہ ہو جائے۔ اس پر سمرقند کے صوبے صفد کے لوگوں نے کہا کہ جو کچھ ہو چکا ہم اسی پر راضی ہیں اور نئی جنگ چھیڑنا ہم نہیں چاہتے۔(۲)

۱۔ البدایة والنهایة ۱: ۳۹

۲۔ الکامل، ابن الأثیر ۵:۴۴، طبع لندن

کیاموجودہ زمانے میں، یا ماضی میں،کسی جنگجو کی ایسی مثال ملتی ہے جو دشمنوں سے ایسا سلوک کرنے والا ہو؟ یہ کام صرف اسلام نے کیا ہے جو پوری دنیا کے لیے اللہ کی رحمت بن کر آیا، اورجس نے اپنے پیروکاروں کو عدل پسندی اور حق و انصاف پر کاربند بنایا۔ اِسلام کے اِس امتیازی وصف نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور وہ پورے جوش جذبے اور اطمینانِ قلب کے ساتھ اِسے قبول کرنے کے لیے آگے بڑھے۔(۱)

دشمن کے نقضِ عہد پر معاہدہ توڑنا

اسلام نے ایک اور مثالی اصول قائم کرنے میں بھی سبقت کی ہے۔ وہ یہ کہ دشمن کی طرف سے صلح توڑنے یا معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں بھی اس کے ساتھ غداری سے اجتناب کیا جائے ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال پیش آنے پر دشمن کے گھر میں اسے معاہدہ ٹوٹنے کا پیغام پہنچادیا جائے اوراس کے ملک کے اندر اس کا اِعلان کردیاجائے، اس لیے کہ اسلامی شریعت میں دھوکہ اور خیانت کسی طرح جائز نہیں، اگرچہ دشمن نے خیانت کی ہو اور ہم سے دھوکہ کیا ہو۔ مسلمانوں کا مثالی اصول یہ ہے کہ : غداری کے بغیر عہد پورا کرنا غداری کے بدلے میں غداری کرنے سے بہتر ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس اصول کو یوں بیان کیا ہے:

﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ. إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبُّ الخَائِنِينَ﴾ [الأنفال: ۵۸](اور اگرکبھی تمھیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہوتو (ان کا عہد) انھی کی طرف پھینک دو (اور) برابر (کا جواب دو) یقیناً اللہ خائنوں کو پسندنہیں کرتا)۔

اس صورت میں معاہدہ برقرار نہ رہنے کا اعلان ہی کافی ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ جنگ کی دھمکی بھی دی جائے۔ ماوردیؒ نے کہا ہے کہ دشمنوں کو معاہدۂ امن کے

۱۔ آثار الحرب، ڈاکٹر وھبة الزحیلي، ص ۱۴۵ وما بعد

پورا ہونے تک امن و امان سے رہنے کا حق حاصل ہے اور جب تک وہ معاہدے پر قائم رہیں، ان سے جہاد نہ کیا جائے۔ لیکن اگر وہ معاہدہ توڑ ڈالیں تو پھر وہ برسر جنگ دشمن بن جائیں گے اور تنبیہ کے بغیر بھی ان سے جہاد کیا جائے گا۔ چناں چہ جب قریش نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑ ڈالا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے جنگ لڑنے کے لیے تشریف لے گئے اور مکہ فتح کیا۔(۱)

معاہدہ واپس لوٹانے کے بارے میں تاریخی واقعات میں سے بلاذریؒ نے فتوح البلدان میں ایک واقعہ یہ نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: اہل قبرص نے عبدالملک بن صالح کے عہد میں سرحدات پر کوئی خلاف ورزی کی تو عبدالملک نے ان سے صلح ختم کر دینا چاہی۔ اس وقت فقہاء بڑی تعداد میں موجود تھے۔ چناں چہ عبدالملک نے لیث بن سعدؒ، مالکؒ بن انس، سفیانؒ بن عُیینہ اور ان سے جیسے دیگر علماء کو اس بارے میں لکھ بھیجا۔ لیثؒ نے جواب دیا: میری رائے یہ ہے کہ تم ان سے معاہدہ ختم ہونے کا اعلان کر دو اور انہیں ایک سال تک سوچنے کی مہلت دو۔

امام مالکؒ نے لکھا: میری رائے یہ ہے کہ ان سے معاہدہ توڑنے میں عجلت سے کام نہ لو اور ان پر حجت پوری ہونے دو کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ﴾[التوبۃ۹:۴] (تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو) اگر اس کے بعد بھی یہ لوگ راہِ راست پر نہ آئے اور اپنے دوغلے پن سے باز نہ آئے اور تم نے دیکھ لیا کہ غداری ان میں جڑ پکڑ چکی ہے اور اس کی بنا پر تم نے ان پر حملہ کر دیا تو تمہارے اس عمل پر ان کا کوئی عذر باقی نہ ہوگا اور تمہیں کامیابی ملے گی اور وہ ذلیل و رسوا ہوں گے، اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

یحییٰ بن حمزہؒ نے جواب لکھا کہ قبرص کا معاملہ عربسوس والے معاملے کی طرح ہے۔ اس میں بہترین نمونہ اور قابلِ تقلید طریقہ ہے۔ اس کا واقعہ یوں تھا کہ عمیرؒ بن سعد

۱۔ الأحكام السلطانية، ص ۴۸

حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا: ہمارے اور روم کے درمیان ایک شہر ہے جسے عربسوس کہا جاتا ہے اس کے باشندے ہمارے راز ہمارے دشمنوں کو بتاتے ہیں لیکن دشمنوں کے راز ہمیں نہیں بتاتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

> جب تم جاؤ تو ان سے کہو کہ میں تمہیں ایک بکری کی جگہ دو بکریاں، ایک گائے کی جگہ دو گائیں اور ہر چیز کی جگہ دو چیزیں دوں گا۔ اگر وہ تمہاری یہ پیش کش مان لیں تو یہ چیزیں انہیں دے دو، پھر انہیں مہلت دو اور شہر کو تباہ کردو(۱)۔ اگر وہ نہ مانیں تو معاہدہ توڑنے کا اعلان کر دو اور انہیں ایک سال تک مہلت دو اور پھر ان سے لڑو۔(۲)

۱۔ عربسوس شام کی سرحد پر ملک روم کا ایک شہر تھا۔ اس کے نام ابسس، أفسس اور ارب سوس وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ مؤلف نے حضرت عمرؓ کے ہدایت نامے کے الفاظ اسی طرح لکھے ہیں اور یہ الفاظ فتوح البلدان ا: ۱۸۵ میں بھی ہیں کہ انہیں معاوضہ دیکر ایک سال کی مہلت بھی دو اور شہر کو تباہ کردو اور اگر وہ انکار کریں تو عہد انہیں واپس لوٹا دو اور انہیں ایک سال کی مہلت دو اور پھر شہر کو تباہ کردو۔ أخربها کی وضاحت مؤلف نے أي حاربهم (ان سے جنگ کرو) سے کی ہے مگر بظاہر یہ بات سیاق وسباق کے ساتھ جچتی نظر نہیں آتی۔ بعض دیگر مراجع کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں انہیں دینے کے بعد مہلت دینے کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ فإن رضوا بذلك فأعطهم وخرّبها، فإن أبوا فانبذ إليهم، وأجلهم سنة ثم خرّبها کے الفاظ ہیں، یعنی اگر وہ اس پیشکش کو قبول کرلیں تو وہ سب کچھ انہیں دے دو اور اس شہر کو تباہ کردو، اور اگر وہ انکار کردیں تو تم معاہدہ ان کی طرف واپس کردو اور انہیں ایک سال کی مہلت دے دو اور جب یہ گزر جائے تو اس شہر کو تباہ کردو۔ بغية الطلب في تاريخ حلب، ابن العديم، باب في ذكر عربسوس ۱:۸۶، معجم مااستعجم ۱: ۲۵۵۔ فتوح البلدان ۱: ۱۸۶ میں اس کی مزید وضاحت لکھی ہے کہ انہیں ذاتی اموال کے بدلے دوگنا مال لے کر شہر خالی کرنے کی پیش کش کی گئی تھی۔ از اکرام الحق یٰسین

۲۔ الشرع الدولي في الإسلام، ڈاکٹر نجیب الأرمنازي، ص ۱۲۳ وما بعد

چوتھی بحث

جنگ کے قواعد و ضوابط

مسلمان اپنی جنگوں کے دوران اعلیٰ انسانی اصولوں اور بلند مرتبہ اخلاق کے پابند رہتے ہیں۔ دشمنوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ہر طرح کے کینہ، نفرت اور تعصب جیسی گری ہوئی حرکتوں سے بلند رہنے میں مسلمان ضرب المثل ہوا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آسمانی پیغام کے حامل اور ہدایت، نور اور حکمت کے داعی تھے۔

چناں چہ مسلمان شرفِ انسانی کے تحفظ، حریت، توازن، حق پرستی، رحم دلی، عفو و درگزر اور تزک واحتشام اور خوفِ خدا کا عنوان اور دیباچہ تھے۔ وہ شرفِ انسانی کی ان صفات سے متصف تھے جو تمام بھلے تصورات کو محیط تھیں۔ نیکی کی دعوت دینے، برائی سے روکنے، ذلیل حرکتوں سے بالاتر رہنے، اللہ تعالیٰ کے احکامات کے پابند رہنے اور بے حیائی، نافرمانی اور غلاظت کے ان کاموں میں آلودہ ہونے سے بچنے میں وہ اپنا نام و مقام رکھتے تھے، جنہیں دشمن قابلِ فخر سمجھا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں دشمن کو قتل کر کے اس کے اعضاء کاٹنے، غیراللہ کی بندگی، ظلم وجارحیت، جنگی ضرورت کے بغیر کسی طرح کی تباہ کاری یا بربادکاری کا ان کے ہاں کوئی تصور نہ تھا۔ وہ جنگ نہ کرنے والوں کو قتل نہیں کرتے تھے، نہ ہی دشمن کی عصمت دری کرتے تھے۔ وہ جنگی قیدیوں سے اعلیٰ اور عمدہ سلوک روا رکھتے تھے۔طاقت کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا اور جنگی کامیابی کے بعد جب برتری ثابت ہوجائے اور باعزت فتح یابی کا یقین ہوجائے اور ذلیل و بے آبرو ہونے کا کوئی خطرہ نہ رہے تو اکثر و بیشتر قیدیوں کو آزاد کر دینا مسلمانوں کا شیوہ رہا ہے۔(۱)

۱۔ اسلام کے اہم بین الاقوامی اصولوں کی مزید وضاحت کے لیے مصنف کی دوسری دو کتابیں آثار الحرب، ص ۱۴۱ و ما بعد، نظام الإسلام، ص ۳۵۱ وما بعد اور پروفیسر ابو زہرہ مرحوم کی العلاقات الدولية في الإسلام، ص ۱۹ و ما بعد ملاحظہ ہو۔

جنگی اکھاڑے کے اندر بھی اِسلامی تعلیمات کے مطابق صرف ہدف کا حصول ہی ذرائع کے استعمال کا جواز پیدا کرتا ہے ۔ چناں چہ جب فتح و کامرانی کا حصول مقصود ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انسانیت کے اصولوں اور اخلاقی اقدار کے ساتھ ٹکرایا جائے، بلکہ صرف جنگی ضرورت کی حد تک محدود رہنے پر اکتفا کیا جائے، چاہے یہ جنگی ذرائع کے استعمال کی صورت میں ہو، چاہے دشمن کے قلعوں اور مراکز کو تباہ و برباد کرنے کی صورت میں ہو اور چاہے جنگ کی صلاحیت رکھنے والے افراد سے نمٹنے اور ان کے اموال چھیننے کی صورت میں ہو۔ اب بعض جنگی قواعد کی وضاحت پیش کی جاتی ہے:

اوّل: جنگ کے مادی ذرائع

دشمن کے جنگجو جب شہریوں سے علیحدہ ہوں اور ان دونوں میں فرق نمایاں ہو تو ان کے مقابلے میں جنگی ذرائع استعمال کرنے کے بارے میں فقہاءِ اسلام میں دو طرح کی آراء پائی جاتی ہیں:

حنفیؒ، شافعیؒ فقہاء اور امام احمدؒ کے نزدیک ایسے دشمن کے مقابلے میں ایسا ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا جا سکتا ہے جس سے اس کا دبدبہ توڑا جا سکتا ہو(۱)، چاہے وہ ذریعہ سخت ہو یا نرم۔ تاہم نرم ذریعے سے مقصد حاصل ہو سکتا ہو تو سخت ذریعے کا استعمال مکروہ اور ناپسندیدہ ہے کیوں کہ یہ بلا ضرورت تخریب شمار ہوگی ، جیسا کہ کمال ابن ہمامؒ نے کہا ہے۔ مطلب یہ کہ دشمن کو مغلوب کرنے کے لیے لڑنے والے کو آزادی دی جائے کہ وہ دشمن کو زیر کرنے کی خاطر کوئی بھی ذریعہ استعمال کرے جیسے تلوار، خنجر، نیزہ وغیرہ یا بھاری اسلحہ، یہاں تک کہ جدید بین الاقوامی عرف کے برعکس اگر ضروری ہو تو اسے زہریلی گیس یا آتش گیر بم استعمال کرنے کی بھی اجازت ہو۔

۱۔ فتح القدیر ۲۸۶:۴،الأحکام السلطانیة،ماوردی، ص ۴۹ وما بعد،الأحکام السلطانیة،ابو یعلی، ص ۳۴

لیکن شافعیہؒ اور حنابلہؒ کے نزدیک دشمن کو زندہ یا مردہ کسی صورت آگ میں جلانا جائز نہیں، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: **لا تعذبوا عباداللّٰه بعذاب اللّٰه** (اللہ کے بندوں کو اللہ کا عذاب نہ دیا کرو)۔(۱)

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو مرتدین کے کچھ لوگوں کو جلایا تھا تو شاید یہ اس وجہ سے ہوا ہو کہ مذکورہ حدیث اس وقت تک انہیں نہ پہنچی ہو۔

مالکی علماءؒ کے نزدیک، اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ کے نزدیک دشمن کو مغلوب کرنے کے لیے فوجیوں کو اپنے طور پر ذرائع اختیار کرنے کی اجازت نہیں،(۲) اسی بناپر دشمن کے قلعوں کو آگ سے جلانا جائز نہیں۔ البتہ جب مسلمانوں کے وجود کو خطرہ ہو یا دشمن کو مغلوب کرنے کے لیے یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہو اور اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ ہو یا دشمن کی طرف سے اس کے استعمال میں پہل ہو جائے تو پھر بدلے کے طور پر یا جنگی ضرورت کے تحت ایسا کرنا جائز ہوگا۔

مالکی علماء کے نزدیک دشمن کو زہر دینا جائز نہیں، چاہے پانی میں زہر ملانے کی صورت ہو یا زہریلی گیس کا استعمال ہو یا زہر آلودہ تیروں کا استعمال ہو۔

یہ نقطۂ نظر اجمالی طور پر ذرائع جنگ اختیار کرنے کے بارے میں فوجیوں پر کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے ۔یہی وہ بات ہے جس کی منظوری بروسل کانفرنس منعقدہ ۱۸۷۴ء میں اقوام عالم نے دی تھی۔ پھر زمینی جنگ کے چارٹر کی دفعہ ۲۲ میں بھی اسی کی صراحت کی گئی جس کا لب لباب یہ ہے کہ جنگ میں ایسے ذرائع کا استعمال ممنوع ہے جو شہری قوانین اور انسانی احساسات کے خلاف ہوں ۔

بناء بریں جنگ میں استعمال کیے جانے والے جائز ذرائع یہ ہیں: سفید ہتھیار

۱۔ ابو داؤد، ترمذی، حاکم بحوالہ ابن عباس

۲۔ الشرح الكبير ، الدردير مع الدسوقي ۲:۱۷۷

یعنی خنجر، تلوار، نیزہ وغیرہ، ان کے استعمال کے جواز میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الجنة تحت ظلال السيوف (جنت تلواروں کے سائے تلے ہے)۔ اسی طرح فرمایا: جُعِل رزقي تحت ظلّ رُمحي (میرا رزق میرے نیزے کے سائے تلے رکھا گیا ہے)۔(۱)

دیگر جائز ذرائع میں چھوٹی بڑی منجنیقوں کے ذریعے پھینکے جانے والے گولے اور اسی طرح کے دیگر آلاتِ جنگ شامل ہیں جو زمانۂ ماضی میں عام طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف والوں کے خلاف منجنیق استعمال کیا تھا۔ اسی طرح عمرو بن العاصؓ نے بھی اسکندریہ میں منجنیق نصب کیا تھا۔ دورِ جدید کے فضائی جنگی آلات جیسا کہ بمباری کرنے والے آلات اور میزائل وغیرہ بھی منجنیق کی طرح ہیں، جنہیں ۱۹۱۱ء میں دورِ حاضر کے بین الاقوامی حلقوں نے اس شرط کے ساتھ تسلیم کیا کہ جنگ کے عمومی ضابطوں کی پاسداری کی جائے، چناں چہ یہ آلات شہریوں کو خوف زدہ اور پریشان کرنے کے لیے استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔

سمندری ذرائع جنگ میں دشمن کو غرق کرنا بھی جائز ہے۔ مسلمانوں کے دور میں سب سے پہلے سمندری جنگ ۲۸ھ میں حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں پیش آئی جب حضرت معاویہؓ نے سمندری راستے سے جنگ پر جانے کی تجویز پیش کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے جواز کا اشارہ فرمایا تھا جیسا کہ بخاری و مسلم میں حدیث منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انسؓ کی خالہ اُمّ حرامؓ بنت ملحان کے

۱۔ پہلی حدیث کو حاکم نے ابوموسیٰ کے حوالہ سے روایت کیا ہے جسے امام سیوطی نے الجامع الصغیر میں ضعیف قرار دیا ہے۔ دوسری حدیث کو احمد نے مسند میں اور ابویعلیٰ اور طبرانی نے عبداللہ بن عمر کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ تاہم پہلی حدیث کو مسلم نے عبداللہ بن ابی اوفیٰ کے حوالہ سے روایت کیا ہے، جو صحیح کا درجہ رکھتی ہے۔

۲۔ منجنیق پتھر پھینکنے والا ایک آلہ تھا جس سے بھاری پتھر پھینک کر شہر کی دیواریں توڑی جاتی تھیں۔ اور دوسرا لفظ یہاں عرّادة استعمال ہوا ہے، یہ بھی منجنیق سے چھوٹا پتھر پھینکنے والا آلۂ جنگ ہوکرتا تھا۔

ہاں تشریف لے گئے اور وہاں تکیہ لگا کر استراحت فرمائی۔ پھر آپؐ نے تبسم فرمایا تو اُمّ حرامؓ نے اس کی وجہ دریافت کی جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ناس من أمتي يركبون ثبج البحر في سبيل الله، ملوك على الأسرّة، فقالت :أدع الله أن يجعلني منهم، قال :اللّٰهم اجعلها منهم۔(۱)

میری امت کے کچھ لوگ اللہ کی راہ میں سمندر کے بڑے حصے پر سوار ہوں گے جیسے تختوں پر بادشاہ بیٹھے ہوں۔ ام حرامؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! دعا فرمائیں کہ میں بھی ان میں شامل رہوں۔ آپؐ نے دعا فرمائی: اے اللہ اسے بھی ان میں شامل فرمادے۔

بین الاقوامی قانون کی رو سے بھی سمندری جنگ کی اجازت ہے۔ مگر ہیگ کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۷ء نے متحارب فریقوں سے مطالبہ کیا ہے کہ جنگ کے ہر دور کے بعد جس قدر ممکن ہو بحری حملوں کے متاثرین ،زخمیوں اور بیماروں کو تلاش کرکے لوٹ کھسوٹ اور بدسلوکی سے ان کے تحفظ کا انتظام کیا جائے۔

دشمن کی افواج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کے لیے پانی بند کرنے کی ممانعت نہیں۔ سیرتِ ابن اسحاقؒ میں واقعہ منقول ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے مقام پر قریب چشمے پر پڑاؤ کیا تو حباب بن المنذرؓ نے سوال کیا: کیا اس پڑاؤ کو آپؐ نے اللہ کے حکم سے چُنا ہے کہ ہمیں اس سے آگے یا پیچھے جانے کا اختیار نہیں ، یا یہ آپؐ کی ذاتی رائے اور جنگی تدبیر ہے؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بل هو الرأي والحرب والمكيدة (یہ میری ذاتی رائے، ایک حربہ اور جنگی تدبیر ہے)۔ حبابؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ پھر تو یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ آپؐ لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر

۱۔ بخاری ۴: ۱۰۳

چلیے تاکہ ہم دشمنوں کے قریبی چشمے تک جائیں اور وہیں پڑاؤ ڈالیں۔ پھر اس کے بعد جتنے کنویں ہیں انہیں گہرا کر کے وہاں ایک تالاب بنائیں اور اس کو پانی سے بھر دیں۔ اس کے بعد دشمن سے لڑیں تو ہمارے پاس پینے کا پانی ہوگا اور دشمن کے پاس نہیں ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أشرتَ بالرأي (تم نے بڑی اچھی رائے دی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حبابؓ کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا۔(۱)

بیہقیؒ کی سنن میں حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: أمرني رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن أغوِّرَ آبار بدر (مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بدر کے کنوؤں کا پانی کھینچ لوں)۔

جدید بین الاقوامی ضوابط نے بھی دریاؤں اور پانی کی گزر گاہوں کا رخ موڑنے اور چشموں کو خشک کرنے کو ذرائع جنگ کے طور پر تسلیم کیا ہے کیوں کہ اس سے دشمن کو اپنے مرکز چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں جرمنی نے اٹلی کے جنوب میں ایک دریا کا رخ موڑ دیا تھا اور اسی طرح ۱۹۵۶ء میں سہ فریقی جارح افواج نے پورٹ سعید کا پانی کاٹ دیا تھا۔

جراثیمی اور کیمیاوی جنگ

یہ پہلی عالمگیر جنگ کے دوران اس وقت متعارف ہوئی جب بعض ممالک نے مہلک متعدی بیماریوں کے جراثیم کا سہارا لیا اور زہریلی اورخناق کا سبب بننے والی کیمیاوی گیسوں کا استعمال کیا۔

جب دوسرے ممالک ایسے ذرائع استعمال کررہے ہوں تو اسلامی اصولوں میں بھی اِن کے استعمال کی گنجائش ملتی ہے، البتہ یہ کارروائی اسلامی قانون کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی جو عمومی رحم دلی کی تلقین کرتا ہے اورقتل کرتے وقت بھی اچھا سلوک

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ۱: ۶۲۰

کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں جدید دنیا کے ممالک کے درمیان طے پانے والے تخفیفِ اسلحہ کے معاہدوں میں جراثیمی اور مہلک گیسوں اور اس قسم کے دیگر تمام سیّال مواد کو جنگ کے دوران استعمال کرنے پر پابندی لگادی گئی تھی۔

باقی جہاں تک دشمن کے خلاف آلۂ جنگ کے طور پر آگ استعمال کرنے کا تعلق ہے تو اسے حنفیہؒ، شافعیہؒ اور امام احمدؒ نے جائز قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنونضیر کے بُویرہ نامی نخلستان کو جلا کر کاٹ دیا تھا۔ امام مالکؒ نے البتہ اس کو ممنوع قرار دیا ہے ماسوائے اس صورت کے کہ اس کے بغیر دشمن پر غلبہ پانا ممکن نہ ہو۔ مالکی فقہاء نے بھی اسے ممنوع قراردیاہے سوائے اس کے کہ یہ ذریعہ استعمال کیے بغیر دشمن کی طرف سے خطرہ لاحق ہو اور اسے زیر کرنا بھی ممکن نہ ہو۔ (۱) عام حالات میں اس کی ممانعت کی دلیل یہ حدیث ہے:**ان النار لا یعذب بھا الا اللّٰہ** (آگ سے عذاب صرف اللہ ہی دیتا ہے)ایک اور حدیث میں ہے: **لا تعذبوا بعذاب اللّٰہ** (تم لوگ وہ عذاب کسی کو نہ دو جو اللہ تعالیٰ دیں گے)۔

بنونضیر کے بُویرہ نخلستان کا جلانا صرف ضرورت کے درجے میں تھا کیوں کہ ایسی ضرورت کے تحت ممنوع کام جائز ہو جاتے ہیں۔ ان احادیث میں ایک اور طریقے سے بھی تطبیق کی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ آگ کے استعمال کو معاملہ بالمثل کے طور پر جائز قراردیاجائے۔ اس کی مثال عُرَنیّین کا واقعہ ہے کہ جب انہوں نے مسلمانوں کی آنکھیں پھوڑ دیں تو مسلمانوں نے بھی لوہے کی سلاخیں آگ میں گرم کر کے ان کی آنکھوں میں پھیر دیں۔ یا ارتداد کی سزا کے طور پر ایسا کرنے کی اجازت ہو جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مرتدین کو اور حضرت علیؓ نے زنادقہ کو جلانے کا حکم دیا تھا۔ ایسی صورتوں کے علاوہ آگ سے سزا دینا حدیث کی نص صریح کی بنا پر ممنوع ہے جیسا کہ احادیث میں آگ کے استعمال سے نہی وارد ہے۔

۱۔ الدرد یرو الدسوقي ۲:۱۷۷،بدایة المجتھد ۱:۳۷۲ وما بعد، المبسوط ۱۰:۹۲، فتح القدیر ۴:۲۸۶

یاد رہے کہ بین الاقوامی قانون کے تحت آگ کے ہتھیار کو استعمال کرنا جائز ہے، چاہے بدلے کے طور پر استعمال ہو اور چاہے اسی سے پہل کی جائے ۔ اس کے استعمال پر کوئی قدغن نہیں لگائی گئی، تاہم برّی جنگ کے چارٹر کی دفعہ ۵/۲۲ کی رُو سے ایسے گولوں اور دیگر جنگی آلات کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے جو بلاوجہ درد اور تکلیف کا باعث بنتا ہو جیسے پھٹنے والی گولی جو درد انگیز زخم لگانے کا سبب بنتی ہو یا پسینے والی گولی جو جسم کے اندر اندر پھیل جاتی ہے یا ایسا سیّال شعلہ جو مخصوص آلات کے ذریعے پھینکا جاتا ہے اور جس کو لگتا ہے وہ بے ہوش ہو جاتا ہے یا جیسے نیپام بم وغیرہ۔

مُثلہ کرنا

یہ ایک نہایت برا اور بھونڈا کام ہے جو جسم کے ساتھ پیش آتا ہے ، جیسے سر کچلنا اور کان یا ناک کاٹنا۔ اسلام میں ایسا کرنا حرام ہے۔(۱) بخاریؒ کی روایت ہے:

نهى رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم عن المثلة و النهبىٰ (۲)(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ کرنے اور لوٹ مار کرنے سے منع فرمایا ہے)۔اسی طرح مسلم کی ایک روایت میں ہے: اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا(جہاد کرو مگر مالِ غنیمت سے چوری نہ کرو، خیانت نہ کرو، معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو اور مثلہ نہ کرو)

مُثلہ کی ممانعت دَم دَم نامی گولی(dum-dum bullet) کے استعمال کی ممانعت کو بھی شامل ہے کیوں کہ وہ بھی مثلے کا ایک آلہ ہی ہے جس کے استعمال سے مثلہ ہوجانا ممکن ہوتا ہے۔ بین الاقوامی عرف کی رو سے بھی اس کی اجازت نہیں، اس لیے کہ جنگی قوانین لفظی طور پر تو جسم کو چیر پھاڑ کرنے والی گولیوں اور سیّال شعلوں کے استعمال کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔

۱۔ فتح القدير ۴:۲۸۹، الدردير و الدسوقي ۲:۱۷۹

۲۔ ابن تیمیہؒ نے منتقى الأخبار اور اس کی شرح نيل الأوطار ۷:۲۴۸ یوں عنوان قائم کیا ہے: (باب الكف عن المثلة و التحريق و قطع الشجر و هدم العمران الالحاجة و مصلحة)

باقی زہر کا استعمال جس شکل میں بھی ہو، چاہے ہوا میں ہو، پانی میں ہو، کھانے میں ہو یا مشروب میں ہو بہرحال حرام اور ممنوع ہے۔ مالکی فقہاء کے نزدیک اسے جنگی ذریعہ بنانا جائز نہیں جبکہ جمہور علماء کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے۔ زہریلی گیس کا استعمال بھی اس میں شامل ہے، چاہے اس میں گندھک اور دھماکہ خیز مواد بھرا گیا ہو۔ یہ ہیگ کانفرنس منعقدہ ۱۸۹۹ء کے فیصلے کے برعکس ہے جس میں صرف ان گولوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جو گیس چھوڑنے کے کام آتے ہیں۔ اس بارے میں مالکی فقہاء کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں: وَحَرُمَ نَبْلٌ سُمَّ (جس بھالے کو زہرآلود کیا گیا ہو وہ حرام ہے)۔ مطلب یہ کہ کوئی ایسا بھالا اور نیزہ وغیرہ ان کو مارنا ہمارے لیے جائز نہیں جس پر زہر لگایا گیا ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسے واپس ہمارے اوپر ہی پھینک دیں۔(۱) دسوقی کی تحقیق یہ ہے کہ امام مالکؒ سے صرف اس کی کراہت نقل کی گئی ہے، تاہم دسوقی کے قول: وَلَو رمَونَا به (اگرچہ وہ اسے ہمارے خلاف استعمال کریں تب بھی......) کے برخلاف قصاص یا جوابی کارروائی کے طور پر اسے استعمال کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ جان کے دفاع کے اصولوں کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی صورت میں اسے استعمال کیا جائے۔

۱۹۳۰ء کے تخفیفِ اسلحہ کے معاہدے میں زہریلی گیس وغیرہ کے استعمال کو واضح طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ باقی جہاں تک اَدلے کے بدلے اور جوابی کارروائی کا تعلق ہے تو بین الاقوامی قانون میں بھی اس کی اجازت ہے، البتہ اس کی کوئی صورت متعین نہیں، کیوں کہ جوابی کارروائی کسی بھی طرح کی ہوسکتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ بین الاقوامی معاہدات میں ایسے گولوں کا استعمال منع کیا گیا ہے جن کا وزن ۴۰۰ گرام سے کم ہو یا وہ نشانہ بننے والے لوگوں کی تکالیف میں بلا وجہ اضافے کا باعث بن سکتے ہوں۔ اسی طرح زہریلی گیسوں، دیگر ہر طرح کی گیس یا جراثیمی اسلحے کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ (۲)

۱۔ الدردیر ۲:۱۷۸

۲۔ مبادئ القانون الدولي العام ، حافظ غانم، ص ۶۰۲

دوم: محاصرہ، تباہ کاری اور توڑ پھوڑ

کسی علاقے یا قلعے میں دشمن کا محاصرہ کرنا شرعاً جائز ہے۔ محاصرے کا مطلب یہ ہے کہ کسی مقام پر یا کسی قلعے میں دشمن کی فوجوں کو اس طرح گھیرا ڈال لیا جائے کہ ان کا کسی اور سے رابطہ نہ ہوسکے۔ یہ محاصرہ جنگی غرض کے لیے بھی ہوسکتا ہے کہ خشکی اور سمندر کے راستے بند کرکے دشمن کو گھیر لیا جائے تاکہ انہیں باہر سے مدد نہ آسکے اور وہ اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ اسی طرح محاصرہ معاشی مقاصد کے لیے بھی ہوسکتا ہے کہ دشمن کو تنگی میں ڈال کر اس کے منصوبوں کو ناکام بنادیا جائے اور اسے کمزور کردیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ﴾ [التوبۃ: ۵](جب احترام والے مہینے گزر جائیں تو کافروں کو جہاں پاؤ، انہیں قتل کرو، انہیں پکڑو، ان کا محاصرہ کرو اور ان کی تاک میں ہر جگہ بیٹھ جاؤ)۔ اس کی دوسری دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے کہ آپؐ نے مدینہ میں یہودیوں کے تینوں قبائل بنوقریظہ، بنونضیر اور بنوقینقاع کا محاصرہ کیا تھا۔ چھ دن تک بنونضیر کا محاصرہ ہوا، پندرہ روز تک بنوقینقاع کا، اور پچیس روز تک بنوقریظہ کا۔ بنونضیر کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَظَنُّوا أَنَّهُم مَّانِعَتُهُمْ حُصُونُهُم مِّنَ اللَّهِ﴾ [الحشر: ۲](ان کا خیال تھا کہ ان کے قلعے انہیں اللہ سے بچا لیں گے)۔اور منافقین کو بنوقینقاع کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعاً إِلَّا فِي قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِن وَرَاءِ جُدُرٍ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعاً وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ. كَمَثَلِ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَرِيباً ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [الحشر: ۱۴-۱۵]

یہ کبھی اکٹھے ہوکر کھلے میدان میں تمہارا مقابلہ نہ کریں گے، لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے

چھپ کر، یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں، تم انہیں اکٹھا
سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں، ان
کا یہ حال اس لیے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں۔ یہ انہی لوگوں
کے مانند ہیں جو ان سے تھوڑی ہی مدت پہلے اپنے کیے کا مزہ
چکھ چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اور بنو قریظہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ﴾ [الأحزاب: ٢٦] (پھر اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا، اللہ ان کی قلعوں سے انہیں اتار لایا)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس روز تک اہلِ طائف کا محاصرہ بھی کیا تھا جیسا کہ بخاریؒ اور مسلمؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ (١) بعدازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے محاصرہ اٹھا لیا کیوں کہ انہوں نے قلعوں میں ایک سال تک کے لیے ضروریات زندگی جمع کی ہوئی تھیں جیسا کہ کتبِ مغازی میں منقول ہے۔

باقی جہاں تک معاشی حصار کا تعلق ہے تو یہ بھی آپؐ کے عمل سے ثابت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ معرکۂ بدر سے پہلے، اور اس کے بعد، آپؐ قریش کی تجارتی ناکہ بندی کے لیے، چھوٹے چھوٹے دستے روانہ کرتے رہے اور بذات خود بھی ایسی لڑائیوں میں شریک ہوئے۔ اس مقصد کے لیے آپؐ نے ان قبائل سے معاہدات بھی کیے تھے جن کے علاقوں سے قریش کے تجارتی قافلے گزرا کرتے تھے۔ چناں چہ آپؐ نے عبداللہ بن جحشؓ کے دستے کو رجب کے مہینے میں روانہ کیا تو اس نے قریش کے قافلے کو جا لیا .. جس پر انہوں نے ہرزہ سرائی کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت والے مہینے کی بے حرمتی کی ہے۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی:

١۔ نووی، شرح مسلم ١٢:١٢٣

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ. قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ﴾ [البقرة: ۲۱۷](۱)

لوگ پوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو اس میں لڑنا برا ہے، مگر اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ بند کرنا اور اس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے۔

اسی حکمتِ عملی کے تحت غزوۂ ودّان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوضمرہ کے ساتھ اور غزوۂ بُواط میں بنو مُدلج کے ساتھ معاہدۂ امن کیا۔(۲) ثمامہ بن اُثال حنفیؓ جب مسلمان ہوئے اور عمرہ کرنے کے لیے مکہ میں داخل ہوئے تو کسی نے ان سے پوچھا: کیا تم صابی ہو گئے ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں، اللہ کی قسم۔ میں تو محمد رسول اللہ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا ہوں۔ اللہ کی قسم جب تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہیں دیں گے یمامہ سے تمھیں گندم کا ایک دانہ نہیں آ سکے گا۔(۳)

یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ امرِ الٰہی کا نفاذ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین تھا اور آپ کو اس کی آرزو تھی، اس کی تکمیل ہو سکے۔ اس عمل سے نہ صرف یہ کہ محاصرے کا جواز ملتا ہے بلکہ کہ غیر مسلم علاقوں میں بھی اس کی گنجائش ملتی ہے۔

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ۱:۶۰۱-۶۰۴۔ اس آیت سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر تم نے شہرِ حرام میں قتل کیا ہے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کر چکے ہیں اور اس پر مزید ان کا جرم یہ ہے کہ تم لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا، مسجدِ حرام سے روکا۔ تم مسجد حرام کے رہنے والے تھے، اس کے باوجود ان کا تمھیں اس سے نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قتل سے بڑا گناہ ہے جو تم لوگوں نے ان میں سے کیا، اور فتنہ قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔

۲۔ سیرۃ ابن ہشام ۱: ۵۹۱-۵۹۸

۳۔ نیل الأوطار ۷:۳۰۲ طبع حلبی

بین الاقوامی قانون کی رو سے بھی جنگی اور معاشی دونوں طرح کا محاصرہ جائز ہے۔ چناں چہ کسی برسرِ پیکار ملک کی فوج کے لیے اس بات کی کوئی ممانعت نہیں کہ وہ کسی شہر یا علاقے کا اس طرح محاصرہ کرے کہ نہ کوئی وہاں داخل ہو سکے اور نہ وہاں سے باہر نکل سکے۔ محاصرہ دو طرح کا ہوتا ہے، فوجی بھی ہوتا ہے اور تجارتی بھی۔ قانونی ماہرین کی اکثریت کے نزدیک دونوں طرح کا محاصرہ جائز ہے، البتہ بعض دیگر ماہرین تجارتی محاصرے کے خلاف ہیں۔(۱)

دورانِ جنگ تباہ کاری اور اِتلافِ اَملاک

جہاں تک دورانِ جنگ دشمن کی املاک کو تلف کرنے، تباہ کرنے یا انہدام وغیرہ کے اِقدامات کا تعلق ہے تو اس بارے میں فقہاءِ اِسلام کے تین نقطہ ہائے نظر ہیں:

حنفیہؒ کی رائے

دشمن کے قلعوں کو آگ سے جلا دینے، پانی سے غرق کردینے، انہیں تباہ کردینے، دشمن کے اوپر گرا دینے، ان کے درخت کاٹ دینے، فصلیں برباد کردینے، ان کے مویشیوں کو ذبح کر دینے اور ان کے قلعوں کو منجنیقوں سے توڑ دینے میں کوئی حرج نہیں۔(۲) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُم بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ﴾ [الحشر: ۲] (وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسی تمام کارروائیوں کا نتیجہ دشمن کو مغلوب کرنا، اس کا دبدبہ توڑنا اور اس کی صفوں میں انتشار پیدا کرنا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں مسلمان قیدی یا تاجر بھی موجود ہوں تب بھی ان پر تیر برسانے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ ایسے

۱۔ القانون الدولي العام، ڈ۔محمود سامی جنینہ، ص ۴۲۹، القانون الدولي، حافظ غانم، ص ۶۰۲

۲۔ بدائع الصنائع ۷:۱۰۰ وما بعد، فتح القدیر ۴:۲۸۶ وما بعد

موقعوں پر ایسا کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ یہاں تیر چلانے کا مقصد اسلام اور مسلم علاقوں کا دفاع کر کے اجتماعی نقصان سے بچنا ہوتا ہے جب کہ قیدی اور تاجر اگر قتل ہو جائیں تو یہ ایک ذاتی نقصان ہوتا ہے۔ ایسا کوئی قلعہ کم ہی ملے گا جس میں ایک بھی مسلمان موجود نہ ہو۔ اگر اس بات کا لحاظ رکھتے ہوئے تیر برسانے سے اجتناب کیا جانے لگا تو دشمن ہمارے علاقوں پر قابض ہو جائیں گے۔ اجماعی نقصان سے بچنے کے لیے ذاتی نقصان برداشت کیا جاسکتا ہے جیسا کہ قواعدِ شرعیہ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اور مسلمانوں کو کافروں سے لڑنے کے لیے دوسرے کافروں سے مدد نہیں لینی چاہیے۔ اس لیے کہ ان کی طرف سے غداری کا خدشہ بہرحال موجود ہے اور مذہبی عداوت انہیں غداری پر آمادہ کر سکتی ہے۔ البتہ نہایت مجبوری کی صورت میں ان سے مدد لی جا سکتی ہے۔

مالکیہؒ، شافعیہؒ اور ابن حزمؒ ظاہری کی رائے(۱)

ان کے نزدیک بھی دشمن کے ٹھکانوں کو گرانا، تباہ کرنا، جلانا یا ڈبو دینا جائز ہے۔ البتہ ان کے باغات اور درختوں کو کاٹنے کی اجازت نہیں، سوائے اس کے کہ کھانے کے لیے ایسا کچھ کیا جائے یا جنگی حکمتِ عملی اس کا تقاضا کر رہی ہو۔ مثال کے طور پر یہ انہیں کمزور کرنے کے لیے ایسا کیا جائے تاکہ بزورِ بازو ان پر غلبہ پایا جا سکے، یا وہ لوگ امن کے ساتھ صلح کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر ایسی کوئی مصلحت نہ ہو تو پھر ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ﴾ [الحشر: ۵](تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا اور اس لیے کہ وہ فاسقوں کو رسوا کردے)۔

۱۔ الدردیر والدسوقي ۲: ۱۷۷، بدایة المجتهد ۱: ۳۰۷، المهذب ۲: ۲۵۱-۲۵۷، الأحکام السلطانیة للماوردي، ص ۴۹، المُحَلّٰی ۷، فقرہ ۹۲۴

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ طائف کی انگوروں کی بیلیں کاٹ دی تھیں، اور یہی بات ان کے مسلمان ہوجانے کا ذریعہ بن گئی۔ اسی طرح آپؐ نے بنونضیر سے جنگ کے دوران ان کی اصفر نامی کھجوروں کے کاٹنے کا حکم دیا تھا۔

دشمن کا پانی کھینچ لینا یا اس پر پانی بند کردینا بھی جائز ہے کیوں کہ یہ دشمن کو کمزور کرنے اور اس پر بزور فتح پانے صلح پر مجبور کرنے کا مضبوط ترین ذریعہ ہے۔

البتہ مالکیہؒ نے دشمن کو آگ سے جلانے کی اجازت نہیں دی، سوائے اس کے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو اور دشمن سے خطرہ بھی ہو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دشمنوں کے درمیان کوئی مسلمان موجود نہ ہو۔ اگر جلانے کے بغیر دوسرا کوئی طریقہ ممکن ہو یا ان میں کوئی مسلمان بھی موجود ہو تو دشمن کو آگ سے نہ جلایا جائے چاہے ان سے ہمیں خطرہ ہی لاحق ہو۔ امام مالکؒ نے المدونۃ میں واضح طور پر بتادیا ہے کہ آگ کا استعمال جائز نہیں، سوائے اس کے کہ آگ ہی دشمنوں کو زیر کرنے کا واحد ذریعہ بچا ہو جیسا کہ محاورہ ہے: آخر الدواء الکي (آخری علاج داغنا ہے)۔

ابوبکر صدیقؓ، لیثؒ، ابوثورؒ، اوزاعیؒ اور حنابلہؒ کی رائے (۱)

ان حضرات کی رائے کے مطابق توڑ پھوڑ کرنا، جلانا، مکانات ڈھا دینا اور پھل دار درختوں کا کاٹنا جائز نہیں۔ اس کی دلیل حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وصیت ہے جو انہوں نے یزیدؒ بن ابوسفیانؓ کو کی تھی، آپؓ نے فرمایا: ''میں تجھے دس چیزوں کی وصیت کر رہا ہوں: کسی عورت، بچے یا بوڑھے ضعیف کو قتل نہ کرنا، پھل دار درخت نہ کاٹنا، کسی عمارت کو تباہ نہ کرنا، کسی بکری یا اونٹ کو ذبح نہ کرنا سوائے اس کے کہ کھانے کے لیے ہو، کھجور کے درختوں کو نہ جلانا، اور نہ ہی انہیں جڑ سے اکھاڑنا، مالِ غنیمت میں سے چوری نہ کرنا اور بزدلی نہ دکھانا۔(۲)

۱۔ موطأ امام مالك، بشرح الزرقاني ۳:۱۲،جامع الترمذي بشرح ابن العربي ۷:۴۰، المغني ۱۰:۵۰۶ وما بعد

۲۔ نیل الأوطار ۷:۲۴۸ وما بعد

امام اوزاعیؒ کہتے ہیں: ''مسلمانوں کو ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس کا نتیجہ دارالحرب یعنی دشمن کی سرزمین میں توڑ پھوڑ کی صورت میں نکلے، کیوں کہ ایسا کرنا فساد ہے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا''۔(۱)

اس رائے پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرصدیقؓ کا مطلب تو یہ تھا کہ لڑائی ختم ہونے اور دشمن کو مغلوب کرنے کے بعد ایسا نہ کیا جائے، یہ مطلب نہیں تھا کہ جنگ کے دوران بھی ایسا نہ کیا جائے۔ کیوں کہ انہوں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔ یا یہ کہ انہوں نے اسے حرام سمجھ کر لڑائی کے دوران ایسا کرنے سے منع نہیں کیا تھا بلکہ عوامی فائدے کے پیشِ نظر منع کیا تھا، کیوں کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ علاقے مسلمانوں کے قبضہ میں آنے والے ہیں اور انہوں نے مناسب نہ سمجھا کہ مسلمان اپنی املاک کو اپنے ہی ہاتھوں سے تباہ کردیں۔ (۲)

اس اعتراض کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قاضی ابویعلی حنبلیؒ نے کہا ہے کہ سپہ سالار چھوٹی بڑی منجنیقوں کے ساتھ دشمن کا محاصرہ کرسکتا ہے، ان کے مکانات منہدم کرسکتا ہے، آگ لگاسکتا ہے اور دشمن پر رات کے وقت اچانک حلہ بول سکتا ہے۔ باقی رہی درخت اور کھجوریں کاٹنے کی بات تو اگر سپہ سالار کو اس میں کوئی فائدہ محسوس ہو جیسا کہ دشمن کو کمزور کرنا اور اس پر غلبہ پانا، یا اسے صلح پر آمادہ کرنا تو اس صورت میں ایسا کرنا بھی جائز ہے۔(۳) تاہم کسی انسان کو زندہ یا مردہ حالت میں آگ سے جلانا جائز نہیں کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: **لا تعذبوا عباد الله بعذاب الله** (اللہ کے بندوں کو اللہ کا عذاب نہ دو) یہ بات دوسری رائے کے مضمون سے ہم آہنگ ہے۔

۱۔ شرح السير الكبير ۱: ۴۳

۲۔ فتح الباري ۶: ۹۵

۳۔ الأحكام السلطانية، ص ۴۳ وما بعد

علماء کی ایک جماعت نے امام احمدؒ کا ایک قول یوں نقل کیا ہے: **إن فعلوا بنا فعلنا بهم**(اگر دشمن ہمارے ساتھ اس طرح کا سلوک کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ایسا ہی کریں گے)۔ اسی طرح انہوں نے فرمایا:**لا أذهب إليه إلا إذا هم فعلوا بنا ذلك** (میں یہ تب جائز سمجھتا ہوں جب دشمن ہمارے ساتھ اس طرح کا سلوک کریں)۔ مطلب یہ کہ انہوں نے بھی اِس میں پہل کرنے کو جائز قرار نہیں دیا، البتہ اَدلے کا بدلہ یا معاملہ بالمثل کے طور پر ایسا کرنا جائز ہوگا۔ یہ ایک معقول اور عمدہ درمیانی رائے ہے۔ اس طرح دوسری رائے جس میں باغات تلف کرنے کو جنگی مفاد کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے یا معرکے کے حالات کا تقاضا ہونے کی وجہ سے یہ اقدام کرنے کی اجازت دی گئی ہے، جیسا کہ بعض معرکوں کی نوعیت ایسی ہوتی ہے تو یہی رائے سنت نبویہ سے ثابت شدہ عمل کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔

بین الاقوامی قانون میں قدیم نظریہ تو یہ تھا کہ برسر جنگ ریاست کو لڑائی میں ہر طرح کا حربہ استعمال کرنے کی اجازت ہے لیکن بعد میں ہیگ معاہدۂ چہارم منعقدہ ۱۹۰۷ء کی دفعہ۲۲ منظر عام پر آئی تو اس کے تحت طے پایا کہ برسر جنگ ملکوں کو، کسی قاعدے ضابطے کے بغیر، دشمن کو نقصان پہنچانے والے ذرائع اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

ذرائع جنگ کے استعمال پر پابندیاں کچھ تو ہیگ کانفرنس میں لگائی گئی تھیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جو خصوصی معاہدوں کے ذریعے بعد میں عائد کی گئیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ: مغلوب ہونے پر مجبور کرنے کے لیے کسی شہر پر بمباری کرنے یا اس کا محاصرہ کرنے کی اجازت ہوگی،بشرطیکہ کسی فتح شدہ شہر کے خلاف ایسا اِقدام نہ کیا جائے۔ اور یہ کہ ہسپتالوں اور عبادت گاہوں کی بے حرمتی نہ کی جائے، نیز جس شہر کے خلاف کارروائی کی جانی ہو اسے پہلے سے نوٹس دیا جائے۔(۱)

۱۔ مبادئ القانون الدولي العام، ڈاکٹر حافظ غانم،ص ۶۰۲

سوم: جنگ میں دھوکہ اور حیلہ سازی

ماضی میں روم اور ایران کی جنگیں اور اسی طرح قرونِ وسطیٰ میں روم اور ایران کے عسکری طرزِ عمل سے متاثر یورپ اور دوسری دنیا میں جو جنگیں ہوئیں، وہ سنگ دلی، قتل عام اور تباہی و بربادی سے بھرپور جنگیں تھیں ۔ ان میں جان، مال اور آبرو کو بے دھڑک برباد کیا جاتا رہا۔ جب اسلام آیا تو چوں کہ وہ جنگ کو بامر مجبور اختیار کرنے کا قائل تھا، اس لیے اِس نے اسے صرف لڑائی کے میدانوں تک محدود کر دیا اور شہریوں کو جنگ کی تباہ کاریوں اور آفتوں سے الگ رکھا۔(۱)

آخر کار برّی جنگ کے چارٹر کی دفعہ ۲۴ نے یہ تصریح کی کہ جنگ کرنے والے ملک دورانِ جنگ حیلے کا سہارا لے سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ اس بہانے بدعہدی اور خیانت کی حد تک نہ پہنچیں یا اپنی ذمہ داریوں کی خلاف ورزی کے مرتکب نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جنگ میں حیلہ اور تدبیر کرنا تو جائز ہے مگر دھوکہ دینا جائز نہیں۔ جائز حیلے کی ایک مثال دشمن کو غلط تاثر دینا یا اسے رفتہ رفتہ گھیر لینا ہے، جب کہ ممنوعہ دھوکہ کی مثال یہ ہے کہ صلیب احمر کے نشانات استعمال کرنا یا جنگی کارروائیوں کو چھپانے کی غرض سے ہتھیار ڈالنے کی علامات کا مظاہرہ کرنا۔(۲)

کامیابی حاصل کرنے کے لیے جائز حیلوں اور چالوں کے استعمال کے جواز پر دونوں قسم کے قوانین اجمالی طور پر متفق ہیں۔ امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ حالتِ جنگ میں جس طریقے سے ممکن ہو کفار کو غلط تاثر دینے کے جواز پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ البتہ ایسے کسی اِقدام کی اجازت نہیں جس سے معاہدے کی خلاف ورزی لازم آئے یا کسی کو دی ہوئی امان ٹوٹتی ہو۔(۳)

۱۔ الشريعة الإسلامية والقانون الدولي العام ، پروفیسر علی علی منصور، ص ۳۲۴

۲۔ مبادئ القانون الدولي العام ، ڈاکٹر حافظ غانم، ص ۲۰۲

۳۔ شرح مسلم، نووی ۱۲: ۴۵

علماء کی دلیل یہ حدیث ہے: الحرب خُدعة (جنگ ایک چال ہی ہوتی ہے)۔(۱) ایک اور حدیث سے ثابت ہے کہ تین چیزوں میں جھوٹ بولنا جائز ہے، جن میں سے ایک جنگ ہے۔(۲) عربی کی ایک کہاوت ہے: رُبّ حيلة أنفع من قبيلة (بعض حیلے پورے قبیلے سے زیادہ مفید ہوتے ہیں)۔ ابن خلدونؒ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے:''اکثر و بیشتر جنگوں میں فتح اور شکست کا دارو مدار خفیہ تدابیر اور نفسیاتی حیلوں اور چالوں پر ہوتا ہے۔ یا پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو رعب کی دولت مل جاتی ہے اور کسی کے حصے میں رسوائی کا فیصلہ ہوجاتا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب بھی یہی ہے:نصرت بالرعب مسيرة شهر (ایک مہینہ کی مسافت تک میرے رعب سے میری مدد کی گئی ہے)۔(۳)

۱۔ بخاری، مسلم، ترمذی بحوالہ جابر بن عبداللہ، نووی ۱۲:۴۵

۲۔ ترمذی بحوالہ اسماء بنت یزید۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: يا ايها الناس ما يحملكم أن تتابعوا على الكذب كتتابع الفراش في النار، الكذب كله على ابن آدم حرام إلا في ثلاث خصال: رجل كذب على امرأته ليرضيها، و رجل كذب في الحرب فإن الحرب خدعة، و رجل كذب بين المسلمين ليصلح بينهم (لوگو! تمہیں کون سی چیز مجبور کر رہی ہے کہ مسلسل جھوٹ بول رہے ہو جس طرح پتنگے مسلسل آگ پر گر رہے ہوتے ہیں۔ ہر طرح کا جھوٹ انسان کے لیے حرام ہے سوائے تین صورتوں کے: ایک یہ کہ کوئی اپنی بیوی کو منانے کے لیے جھوٹ بولے۔ دوسرے یہ کہ کوئی جنگ کے دوران بولے کیوں کہ جنگ چال چلنے کا نام ہوتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ کوئی مسلمانوں میں صلح کرانے کے لیے جھوٹ بولے۔

۳۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۷۷

جائز جنگی تدابیر

۱۔ گھات لگا کر دشمن کو پھنسانا

کمین گاہ بنانا اسلام اور بین الاقوامی قانون دونوں میں ایک جائز حیلہ اور ایسا کرنا دھوکہ اور غداری شمار نہیں ہوتا۔ المصباح المنیر میں ہے کہ جنگ میں کمین کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ کسی خفیہ جگہ میں اس طرح چھپ جائیں کہ ان کی طرف کسی کا خیال نہ جائے اور پھر وہاں سے نکل کر بے خبری میں دشمن پر حملہ کردیں۔ ابوبکر ابن العربیؒ نے کہا ہے کہ جنگ میں جو دھوکہ جائز ہے اس کی ایک صورت یہ ہے کہ فوج اپنے لیے کوئی خفیہ جگہ تیار کرکے اس میں گھات لگا کر بیٹھ جائے۔

اس کے جواز کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ رفاعہ بن قیس جُشَمی کو قتل کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن ابو حدرد اور ان کے دونوں ساتھیوں نے رات کو ایک کمین گاہ تیار کی اور رفاعہ کے انتظار میں وہاں بیٹھے رہے۔ چناں چہ جس وقت وہ تلوار لے کر وہاں سے گزرنے لگا تو یہ اس پر حملہ آور ہوئے اور اسے قتل کرکے اس کا سر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اِس اقدام کو درست قرار دیا۔(۱)

غزوۂ حنین کے موقع پر مسلمانوں کو وادئ حنین کی گھاٹیوں اور اطراف میں کمین لگائے ہوئے بنو ہوازن کے لوگوں کی وجہ سے ہی کم مائیگی کا سامنا کرنا پڑا۔ واقعہ یوں ہوا کہ اس موقع پر کچھ مسلمانوں نے کہا: لن نُغلَبَ الیومَ من قلة (آج ہم تھوڑے سے لوگوں سے مغلوب نہیں ہوں گے) تو بہت سے فوجی دستوں نے یکدم نکل کر ان پر ہلہ بول دیا جس کی وجہ سے انہیں پیٹھ پھیر کر بھاگنا پڑا۔(۲)

۱۔ سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۶۲۹ وما بعد

۲۔ ایضاً، ص ۴۴۲۔ اس موقع پر مسلمانوں کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ اگرچہ ایک بہت بڑے دھچکے کے بعد بالآخر فتح مسلمانوں ہی کی ہوئی مگر اپنی کثرت تعداد پر نظر اور دشمن کے گھات لگائے دستوں کی وجہ سے ایک دفعہ ان کے قدم بالکل اکھڑ گئے اور انہیں خاصی تکلیف اٹھانا پڑی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: البدأ والتاریخ لابن المطھر ا: ۲۵۶۔ از اکرام الحق یٰسین۔

۲۔ سُرنگیں بچھانا

قدیم زمانے میں سرنگ ایک ایسے گڑھے کی شکل میں ہوتی تھی جس پر کچھ لکڑیاں اور ٹہنیاں رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی جاتی تا کہ دشمن بے خبری میں اس میں گر پڑے۔ غزوۂ احد کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے ایک گڑھے میں گر پڑے تھے جسے کافروں نے بنایا تھا۔ مالکیہؒ نے تصریح کی ہے کہ جنگ میں ایسی تدبیر اختیار کرنا جائز ہے۔(۱)

جدید سرنگیں دو طرح کی ہوتی ہیں: سمندری اور زمینی سرنگیں۔ ان کا استعمال بھی دیگر آتشین اسلحہ کی طرح جائز ہے بشرطیکہ مسلمانوں کے حلیفوں کے لیے نقصان دہ نہ ہوں اور کھلے سمندر میں بھی نہ بچھائی گئی ہوں۔ چناں چہ اگر وہ دشمن کے پانیوں میں یا متحارب ریاست کے علاقائی سمندر میں بچھا دی گئی ہوں تو اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ یہ اسلامی احکام انٹرنیشنل لاء کمیشن کی قراردادوں سے تقریباً ملتے جلتے ہیں۔ اسی کمیشن سے ۱۹۱۳ء میں آکسفورڈ چارٹر تیار کیا گیا تھا۔ اس چارٹر کی دفعہ ۲۰ کے تحت سمندری بارودی سرنگوں کا کھلے سمندر میں بچھانا ممنوع ہے۔ دفعہ ۲۱ کے تحت برسرِ پیکار ممالک کے اپنے علاقائی سمندر یا دشمن کی سمندری حدود میں ان سرنگوں کا بچھانا جائز قرار دیا گیا ہے۔ دفعہ ۲۲ میں یہ شرط رکھی گئی ہے کہ دشمن کی ساحلی سرحدات پر بارودی سرنگیں جنگی مقاصد کے تحت ہی بچھائی گئی ہوں۔

۳۔ دشمن کی صفوں میں انتشار پیدا کرنا

ایسا کرنا اسلام کی رو سے بھی جائز ہے اور بین الاقوامی قانون کی رُو سے بھی۔ یہ دشمن کے لیے تدابیر اختیار کرنے کے ضمن میں آتا ہے۔ اس کی طرف نعیم بن مسعود اشجعی غطفانی کے واقعہ سے رہنمائی ملتی ہے۔ وہ ۵ھ میں غزوۂ خندق کے موقع پر اِسلام قبول کرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا:

۱۔ حاشية الدسوقي على الشرح الكبير ۲:۱۷۸

یا رسول اللہؐ! میں نے اسلام قبول کیا ہے اور میری قوم کو میرا مسلمان ہو جانا معلوم نہیں۔ اس بارے میں آپؐ جو چاہیں مجھے حکم فرمائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنما أنت فينا رجل واحد، فَخَذِّلْ عنا إن استطعتَ، فإن الحربَ خُدعة (تم ہم میں اکیلے آدمی ہو، بس اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو دشمن کی صفوں میں ہم سے دور دور ہی انتشار پیدا کردو، کیوں کہ اصل جنگ تو چال ہی ہوتی ہے)۔ چناں چہ وہ بنو قریظہ کے پاس گئے جن کے وہ زمانۂ جاہلیت سے ہم محفل رہے تھے، اور ان سے جا کر کہا: ''بنوغطفان اور قریش سے ان کے کچھ سرداروں کو طلب کرو تا کہ وہ اس بات کی ضمانت کے طور پر تمہاری تحویل میں رہیں کہ وہ لوگ محمدؐ اور ان کے صحابہؓ کے خلاف جنگ میں ضرور حصہ لیں گے۔ اس کے بعد وہ قریش اور غطفان کے پاس گئے۔ قریش سے ان کی دوستی تھی اور غطفان ان کا اپنا قبیلہ تھا۔ نعیم نے ان دونوں کو سمجھایا کہ بنوقریظہ نے جو تم سے ضمانت طلب کی ہے وہ بڑی خطرناک بات ہے۔ دراصل یہ یہودی تمہارے ان سرداروں کو لے کر قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے قریش اور ان کے حلیفوں کو ختم کرنے کے لیے محمدؐ سے باہمی معاہدہ کر لیا ہے''۔(۱)

نہ صرف یہ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر دشمن کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور ان کی وحدت ختم کرنے کے لیے مال کا استعمال بھی کیا۔ چناں چہ آپؐ نے غطفان کے سردار عُیینہ بن حصن کو مدینہ کے باغات کی ایک تہائی کھجوریں دینے کی پیش کش کی تا کہ وہ لے کر ان اتحادی افواج میں انتشار پیدا کرے اور خود بھی اپنے ساتھیوں سمیت مدینہ سے واپس لوٹ جائے۔(۲)

امام محمدؒ نے السیر الکبیر میں واضح طور پر لکھا ہے(۳) کہ اگر معاہدۂ امن کرنے کی ضرورت لاحق ہو اور اس کے لیے کافروں کو کچھ مال بھی دینا پڑے تو یہ بھی

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ۲:۲۲۹ و ما بعد، زاد المعاد، ابن قیم ۲:۱۱۸

۲۔ زاد المعاد ۲:۱۱۸

۳۔ شرح السیر الکبیر ۴:۴

جائز ہوگا اور یوں مسلمان اپنی جانیں بچانے کے لیے مال کو قربان کرنے والے ہوں گے۔ ایک حدیث ہے: **اجعل مالك دون نفسك واجعل نفسك دون دينك** (اپنے مال کو اپنی جان کے لیے آڑ بنالو اور اپنی جان کو اپنا دین بچانے کے لیے آگے کر دو)۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دشمنوں کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے مال خرچ کرنا جائز ہے اور فقہاءِ اسلام نے بعض کافروں کے شر سے بچنے کے لیے تالیف قلب کے طور پر انہیں زکوٰۃ کا ایک حصہ دینے کی بھی اجازت دی ہے۔

۴۔ نفسیاتی جنگ

شریعت اور بین الاقوامی قانون کی رو سے جنگ میں نفسیاتی حربے استعمال کرنا بھی جائز ہے۔ اس سلسلے میں جنگی آلات کا استعمال اور دیگر تدابیر اختیار کرنا برابر ہے بشرطیکہ ان میں سے کوئی تدبیر غداری کے زمرے میں نہ آتی ہو۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے موقع پر دشمن کے سامنے بات بدل کر کرنے کی اجازت بھی دی کیوں کہ جنگ تو چال ہی ہوتی ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ۔ لہذا جنگ میں کوئی بھی ایسی بات یا ایسا فعل کرنا جس سے دشمن کا حوصلہ کمزور پڑ سکتا ہو، جائز ہے، خواہ وہ حقیقت کے برعکس ہی کیوں نہ ہو، یا دشمن کا رخ بدلنے کی چال ہی کیوں نہ ہو ۔

معبد بن ابو معبد الخزاعی غزوۂ احد کے موقع پر اسلام لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا تھا کہ جاؤ اور ابوسفیان کو پسپائی پر آمادہ کرو۔ چناں چہ وہ ابوسفیانؓ کے پاس گئے اوران سے کہا: "محمدؐ اور ان کے صحابہ تمہارے خلاف غصے میں بھنے جارہے ہیں اور وہ اتنی بڑی تعداد میں نکلے ہیں کہ اس سے پہلے اتنی تعداد میں کبھی نہیں نکلے اور نہ میں نے کبھی اتنی بڑی تعداد دیکھی ہے۔(۱)

اسی طرح نعیم بن مسعود کی عادت تھی کہ جو بات سنتا اسے پھیلا دیتا تھا۔ غزوۂ خندق کے موقع پر ایک روز عشاء کے وقت وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

۱۔ الاستيعاب في معرفة الأصحاب، ابن عبدالبر ۳:۱۴۲۸ وما بعد

سے گزرا تو آپؐ نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلالیا اور فرمایا کہ بنوقریظہ نے میرے پاس پیغام بھیجا ہے کہ اگر بنونضیر کو مدینہ میں اپنے گھروں اور املاک میں واپس آنے دیا جائے تو ہم آپؐ سے صلح کر لیں گے۔ نعیم نے یہ بات سن کر قریش تک پہنچا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکین محاصرہ چھوڑ کر واپس چلے گئے۔(۱)

۸ھ میں شام کے علاقے بلقاء میں غزوۂ موتہ کے موقع پر جب خالد بن ولیدؓ نے اسلامی لشکر کی قیادت سنبھالی تو اس وقت مسلمانوں کی تعداد تین ہزار اور رومیوں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ خالد بن ولیدؓ کے آنے سے پہلے مسلمانوں کے تین سالار شہید ہو چکے تھے۔ خالد بن ولیدؓ نے قیادت سنبھالتے ہی لشکر کو نئی ترتیب دی اور لشکر کے اگلے حصے کو پیچھے کر دیا اور دائیں کو بائیں کر دیا۔ اس سے رومی دھوکہ کھا گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کو نئی مدد آ پہنچی ہے اور یوں وہ مرعوب ہو کر پسپا ہو گئے۔(۲) یہ ایک جنگی چال تھی جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی مدد سے تعبیر فرمایا۔

فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرّالظہران کے پہاڑوں پر زبردست آگ جلانے کا حکم دیا تاکہ قریش سمجھیں کہ مسلمان لشکر کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ابوسفیانؓ اسے دیکھ کر کہنے لگے کہ آج رات جیسی بڑی آگ اور بڑا لشکر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اسی طرح جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی قبائل اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے لشکر کے ساتھ وہاں سے گزرے تو ابوسفیان نے حضرت عباسؓ سے کہا: ''آج تیرے بھتیجے کی باشاہی بہت بڑی ہو گئی ہے''۔ حضرت عباسؓ نے جواب دیا: ''اے ابوسفیان یہ تو نبوت ہے''۔ ابوسفیانؓ نے کہا: ''اچھا تو یہ بات ہے''۔(۳)

۱۔ البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر۴:۱۱۳۔ جنابِ ابوسفیان افواجِ اسلام کے گزرنے کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر حضرت عباسؓ کی حفاظت میں تھے۔ اسی صبح انہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔تہذیب سیرۃ ابن ھشام ا: ۳۵۵، حیاۃ الصحابۃ،کاندھلوی ا:۱۷۲۔ از اکرام الحق یٰسین۔

۲۔ زادالمعاد، ج ۲، ص ۱۵۸

۳۔ البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر۴:۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۲۔ سیرۃ ابن ہشام ۲:۴۰۴-۴۰۲

اسلام میں اور بین الاقوامی قانون میں جو حیلے اور حربے ممنوع ہیں ان میں سے ایک جھوٹ موٹ ہتھیار ڈالنے کا تاثر دینا یا مذاکرات کی دعوت دینا ہے، جیسے سفید جھنڈا لہرانا یا صلیب احمر کا نشان لگانا جن کا مقصد عام طور پر دشمن کا غلبہ تسلیم کرنا یا مذاکرات کی دعوت دینا ہوتا ہے۔ اس قسم کا حیلہ کرنا، غداری اور دھوکہ شمار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ فریقِ مقابل کو امن کا اشارہ دینے کے مترادف ہے اور شریعت کی رو سے کسی کو امان دے کر توڑ دینا جائز نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے تو خیانت سے امان توڑنے والے کو قتل کی دھمکی دی تھی اور فرمایا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں عمرؓ کی جان ہے، اگر تم میں سے کوئی کسی کافر کی طرف انگلی سے بھی اشارہ کرے اور پھر اس کے پاس جا کر اسے قتل کر دے تو میں اس شخص کو ضرور قتل کر دوں گا۔(۱)

اسلام کی رو سے دشمن کا لباس استعمال کرنا بھی ممنوع ہے، کیوں کہ اس میں ضمنی طور پر دشمن کو اپنی حالت پر قائم رہنے کی اجازت دینے کے مترادف ہے۔ یہی بات بری جنگ کے بین الاقوامی چارٹر کی دفعہ ۶/۲۳ میں یوں منقول ہے: ''ناجائز حربوں میں یہ بھی شامل ہے کہ فریقِ مخالف پر قابو پانے کے لیے دشمن کے فوجیوں یا اس کے جھنڈے یا دیگر علامات کو استعمال کیا جائے۔ دورانِ جنگ یہ ضروری ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک مکمل طور پر نمایاں ہو اور یہ بات بالکل واضح ہو کون لوگ اس کے ساتھی ہیں اور کون اس کے دشمن کے فوجی ہیں۔

نعرے لگانے میں، دشمن کی نقل کرنا بھی بین الاقوامی قانون کے بعض ماہرین کے نزدیک ممنوع ہے کیوں کہ ایسا کرنا جنگی مصلحت کے خلاف ہے۔ اسلام کی رو سے بھی ایسا کرنا ممنوع ہے کیوں کہ دشمن کے نعروں جیسے نعرے لگانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دشمن کو امن دے دیا ہے۔ اور یہ بات واضح طور پر زبان سے امن دینے کے برابر ہے۔

اس بحث کے آخر میں جاسوسی اور خفیہ قتل کا حکم بتا دینا بھی ضروری ہے۔

۱۔ بروایت ابو سلمہ، المهذب ۲:ص ۳۳۵۔ العيني، شرح البخاري ۱۵:۹۴۔ الزرقاني، شرح الموطا ۲:۲۹۶۔ آثار الحرب، ص ۲۳۰، طبع دوم۔

جاسوسی کرنا

عربی لغت میں تجسس سے مراد دشمن کی خبریں معلوم کرنا اور اس کے چھپے راز دریافت کرنا ہے۔ امام بخاریؒ نے کہا ہے: تجسس کا معنی تلاش کرنا ہے۔ برّی جنگ کے چارٹر کی دفعہ ۲۹ میں جاسوس کا یہ معنی منقول ہے: ''جاسوس ایسا شخص ہوتا ہے جو چھپ کر یا بھیس بدل کر جنگ کے ایک فریق کی سرزمین پر فوجی نقل و حرکت کی معلومات حاصل کرے یا حاصل کرنے کی کوشش کرے تاکہ انہیں جنگ کے دوسرے فریق تک پہنچا دے۔ جنگی چارٹر کی دفعہ ۲۳ نے دشمن کے بارے میں یا میدانِ جنگ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے ذرائع اختیار کرنے کو قانونی تحفظ دیا ہے۔(۱) اسلام کی رو سے بھی ایسے اِقدامات کی اجازت ہے، جس کے دلائل درجِ ذیل ہیں:

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن انیسؓ کو اس خبر کی حقیقت جاننے کے لیے بھیجا کہ غزوۂ اُحد کے بعد بنولحیان کا قائد خالد بن سفیان الہذلی مقامِ نخلہ یا مقامِ عُرنہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے کے لیے لوگوں کو جمع کر رہا تھا۔(۲)

۲۔ غزوۂ خندق کے موقع پر جسے غزوۂ اَحزاب بھی کہا جاتا ہے، کافروں میں پھوٹ پڑنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ کو یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا کہ رات کو ان لوگوں نے کیا کیا۔(۳)

۱۔ مبادئ القانون الدولي العام، حافظ غانم، ص ۲۰۲

۲۔ فتح الباري ۷:۲۶۶

۳۔ سیرۃ ابن ہشام ۲:۲۳۱۔ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی ہے جو مجھے دشمن کی خبر لاکر دے تو اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن میرے ساتھ رکھیں گے۔ پھر آپؐ نے حذیفہ بن یمانؓ کو ان کے حالات معلوم کرنے بھیجا (نووی شرح مسلم ۲:۱۴۵)۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ اس موقع پر زبیرؓ نے کہا تھا: یا رسول اللہ! میں خبر لاؤں گا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نبی کے مددگار ہوا کرتے ہیں اور میرا مددگار زبیرؓ ہے۔

۳۔ غزوۂ بدر سے ذرا پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بُسَیس بن عمرو جُہنی اور عدی بن رعباء کو بدر کی طرف روانہ کیا تھا، تاکہ ابوسفیان کے قافلے کے بارے میں معلومات لے آئیں۔(۱)

۴۔ غزوۂ حُنین کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی حدرَد اسلمی کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ جاؤ اور دشمن لوگوں میں شامل ہو جاؤ اور ان میں رہ کر ان کی نقل وحرکت کے بارے میں ہمیں خبر دو۔(۲)

۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات علیؓ، زبیرؓ اور مقدادؓ بن اسود کو روضۂ خاخ کی طرف بھیجا جو کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام تھا: آپؐ نے ان سے فرمایا کہ جاؤ، وہاں کجاوے میں سوار ایک عورت ہے جس کے پاس ایک خط ہے، وہ خط اس سے چھین لاؤ۔ وہ خط حاطب بن ابی بلتعہؓ نے مکہ کے کافروں کو لکھا تھا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ معلومات دی گئی تھیں۔(۳)

یہ اور اس طرح کی دیگر احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جاسوسی کرنا جائز ہے، چاہے معاوضے کے ساتھ ہی ہو اور چاہے دشمن ملک کے کسی غیر مسلم سے ہی یہ کام لیا جائے بشرطیکہ ہمارے ساتھ کام کرنے سے پہلے بھی وہ قابل اعتماد رہا ہو۔(۴)

ابن قیمؒ نے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جاسوس بھیجا کرتے تھا جو آپ کے پاس دشمن کی خبریں لاتے، آپؐ حالات معلوم کرنے کے لیے فوجی دستے بھی بھیجا کرتے تھے اور رات کے وقت پہرے دار بھی مقرر کرتے تھے۔(۵)

۱۔ زادالمعاد ۲:۸۵

۲۔ سیرۃ ابن ہشام ۲: ۴۳۹ وما بعد

۳۔ بخاری ۴:۱۴۴۔ طبع المنيرية، نيل الأوطار ۸:۷۔ فتح الباري ۷: ۵۱۹

۴۔ مغني المحتاج ۴:۲۴۰، المهذب ۲:۲۳۰

۵۔ زاد المعاد ۲:۶۴

جاسوس کی سزا

دشمن کا جاسوس یا تو حربی ہوگا یا معاہد ہوگا، یا مسلمان۔ اگر وہ حربی کافر ہے تو اس کے قتل کے جواز پر مسلمانوں کا اجماع ہے، جیسا کہ نووی نے لکھا ہے۔ اس کی دلیل وہ واقعہ ہے جو سلمہ بن الاکوع نے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: غزوۂ ہوازن میں جو کہ مقام حُنین پر پیش آیا، صحابہؓ نے ایک شخص کو سرخ اُونٹ پر دیکھا جو مسلمانوں کی جاسوسی کر رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:اطلبوہ فاقتلوہ (اسے ڈھونڈو اور قتل کر دو)۔ چناں چہ ابن الاکوعؓ نے اسے قتل کر دیا اور اس کا سارا سامان لے لیا۔ (۱) حُنین مکہ اور طائف کے درمیان مکہ سے تین رات کی مسافت پر ایک مقام ہے اور مقتول جنگجو سے چھینی ہوئی چیزوں: اسلحہ، سامان اور مال وغیرہ کو السلب کہتے ہیں ۔

جہاں تک کسی حلیف قوم کے جاسوس یا ذمی جاسوس کا تعلق ہے تو امام امالکؒ اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک اسے قتل کرنا جائز ہے، اس لیے کہ وہ عہد شکنی کا مرتکب ہوا ہے، جب کہ جمہور علماء کے نزدیک اس اِقدام سے وہ معاہدہ توڑنے والا شمار نہیں ہوتا۔

شافعیؒ اور حنبلیؒ فقہاء کے نزدیک اگر کوئی حلیف یا ذمی کافر دشمن کے لیے مسلمانوں کی جاسوسی کرے اور انہیں مسلمانوں کے راز اسے بتائے تو اس کے ساتھ معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے۔ البتہ شافعیہ کا راجح قول یہ ہے کہ جاسوسی کرنے سے ذمی کا معاہدہ نہیں ٹوٹتا سوائے اس کے کہ اس کے ساتھ معاہدے میں یہ شرط لگائی گئی ہو کہ جاسوسی کرو گے تو معاہدہ ختم ہوجائے گا۔(۲)

میری رائے میں امام مالکؒ اور اوزاعیؒ کے نقطۂ نظر کو ترجیح حاصل ہے جس کے مطابق معاہد یاذمی اگر جاسوسی کرے تو اسے قتل کرنا جائز ہے۔ دلیل یہ ہے کہ فرات بن حیان جو کہ ذمی بھی تھا اور ایک انصاری صحابی کا حلیف بھی تھا، اس کے باوجود

۱۔ نووی شرح مسلم ۱۲: ٦٦ وما بعد، نیل الأوطار ۸: ۷

۲۔ نووی شرح مسلم ۱۲: ٦۷، مغني المحتاج ۴: ۲۵۸-۲٦۲، المغني ۸: ۵۲۵، نیل االأوطار ۸: ۸

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو سفیان کے لیے مخبری کرنے کے جرم میں اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا مگر بعد میں صرف اِس لیے اس کی جان بخشی فرما دی کہ اس نے کہا میں مسلمان ہوں۔(۱)

اس بارے تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ امام ابویوسفؒ نے فرمایا: اے امیرالمومنین آپ نے مجھ سے ایسے یہودی ، نصرانی اور مجوسی جاسوسوں کے بارے میں پوچھا ہے جو ہیں تو ذمی اور جزیہ بھی ادا کرتے ہیں مگر ہماری جاسوسی کرتے ہیں تو ان کے بارے میں حکم یہ ہے کہ ان کی گردن اُڑا دی جائے۔ اور اگر کوئی واضح مسلمان آدمی جاسوسی کا مرتکب ہو تو اسے دردناک سزا دی جائے اور اسے طویل قید میں رکھا جائے یہاں تک کہ توبہ کرلے۔(۲) امام ابن تیمیہؒ کی رائے میں جاسوس کو قتل کیا جائے گا، چاہے وہ اسلام ہی قبول کر لے۔(۳)

جہاں تک مسلمان جاسوس کا تعلق ہے تو قاضی عیاض کی روایت کے مطابق فقہِ مالکی کے اکابرین اور حنابلہ میں سے ابن عقیلؒ کی رائے یہ ہے کہ ایسے شخص کو قتل کردیا جائے۔(۴) مگر جمہور فقہاء جن میں امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اوزاعیؒ اور مالکیہ کے کچھ حضرات شامل ہیں(۵)، ان کے نزدیک کافر دشمن کے لیے مسلمانوں کی جاسوسی کرنے والے مسلمان کو قتل نہ کیا جائے بلکہ قید اور مارپٹائی وغیرہ کی تعزیری سزا دی جائے۔

فریقین میں سے ہر ایک کا استدلال حاطب بن ابی بلتعہؓ کے واقعہ سے ہے۔

۱۔ نیل الأوطار ۸: ۷

۲۔ کتاب الخراج، امام ابویوسف، ص ۱۸۹ وما بعد

۳۔ فتاویٰ ابن تیمیہ ۴: ۱۹۰

۴۔ نووی، شرح مسلم ۱۲: ۶۷۔ زادالمعاد ۲: ۶۸

۵۔ نووی، شرح مسلم ۲: ۶۷۔ زادالمعاد ۲: ۶۸۔ المهذب ۲: ۲۴۲

حاطبؓ نے مکہ کے کافروں کو خط لکھ کر ایک عورت کے ہاتھ روانہ کیا۔ اس خط کے ذریعے انہوں نے فتح مکہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادوں کے بارے میں کافروں کو آگاہ کرنا تھا۔ خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاں ایک جنگی مہم کی تیاری کا اعلان کر دیا ہے اور میرے خیال میں اس کا ہدف تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ کو ڈانٹا اور فرمایا کہ حاطبؓ تو نے یہ کیا کیا؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! مجھے سزا دینے میں جلدی نہ کیجئے۔ میں قومِ قریش کا فرد نہیں، بلکہ باہر سے آکر قریش کے ساتھ رہ رہا تھا۔ جو لوگ بھی ہجرت کر کے آپؐ کے ساتھ آئے ان کے رشتہ دار مکہ میں رہتے ہیں، جن کی وجہ سے ان کے گھر والے اور ان کی اَملاک محفوظ رہتی ہیں۔ چوں کہ میری اس قسم کی کوئی رشتہ داری نہیں ہے، اس لیے میں نے چاہا کہ کافر لوگ میرے اس کام سے خوش ہو کر میرے رشتہ داروں کا خیال رکھیں گے۔ میں نے یہ کام اس لیے نہیں کیا کہ میں کافر ہو گیا ہوں یا مرتد ہو چکا ہوں اور نہ ہی مسلمان ہو جانے کے بعد کفر سے راضی ہوں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ یہ سچ کہہ رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! مجھے اس منافق کی گردن مارنے کی اجازت دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بدر کی جنگ میں شریک رہا ہے اور تجھے کیا معلوم کہ شاید اللہ نے اہلِ بدر کے دلوں میں جھانک لیا ہو اور فرمایا ہو: "جو چاہو کرو! میں نے تمہیں بخش دیا ہے"۔(۱)

اس واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ کو اس لیے قتل نہیں کیا کہ وہ مسلمان تھے۔ پہلے فریق کا موقف یہ ہے کہ اگر حاطب بدر میں شریک نہ ہوئے ہوتے تو حضور ارادۂ قتل میں حضرت عمرؓ کی تائید فرماتے۔ چناں چہ قتل نہ کرنے کی علت ان کا بدری ہونا تھی جو کہ اور لوگوں میں نہیں پائی جاتی۔ اگر صرف مسلمان ہونا ان کے قتل میں مانع ہوتا تو دوسری علت کا ذکر نہ کیا جاتا

۱۔ بخاری، مسلم، احمد، نیل الأوطار ۸:۷

جس سے اِسلام کی عمومیت میں تخصیص پیدا ہوگئی۔اس لیے کہ جب کسی حکم کی علت عام سبب کو بنایا جائے تو اس صورت میں خاص سبب غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ اور جب کوئی خاص سبب بطورِ علت بیان کیاجائے تو وہ عام سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ یہاں جب غزوۂ بدر میں شرکت کی علت حاطبؓ کے سوا کسی دوسرے مسلمان جاسوس میں نہیں پائی جاتی تو ایسے جاسوس کوقتل کرنے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں۔

میرا میلان فریق اوّل کی رائے کی طرف ہے جوامام مالکؒ اور ان کے ہم خیال فقہاء کی ہے تاکہ مسلمانوں کے عمومی اور اعلیٰ ترین مفاد کوتحفظ حاصل ہوسکے۔ بین الاقوامی قانون کسی ملک کے اپنے شہری جاسوس کی نسبت غیرملکی جاسوس کے ساتھ زیادہ نرمی برتتا ہے، اگرچہ واقعی طور پر اس کے برعکس ہوتا ہے۔

جس مسلمان کوبھی کسی جاسوس کے بارے میں معلوم ہو جائے، اس پر لازم ہے کہ حکومت کو اس کی اطلاع دے تاکہ اس کے خطرے اور نقصان سے بچا جاسکے اور اس کے بارے میں حکومت کوئی مناسب فیصلہ کر سکے۔(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ.
تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ﴾
[الممتحنة:۱]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو حالاں کہ جوحق تمہارے پاس آیا ہے، اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں۔

بین الاقوامی قانون میں جاسوس کی سزا یہ ہے کہ یا تو اس پر مقدمہ چلا کر اسے پھانسی کے ذریعے یا گولی سے سزائے موت دی جائے۔(۲)

۱۔ فتح الباری، ج ۶، ص ۸۷

۲۔ ملاحظہ ہو ہیگ کانفرنس، ۱۹۰۷ء، دفعہ ۳۰

بے خبری میں مار ڈالنا

بے خبری میں مار ڈالنے اور خیانت کر کے مار ڈالنے میں فرق ہوتا ہے۔اگر معاہدے یا امان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی کوقتل کیاجائے تو یہ خیانت سے مارنا ہے۔ جب کہ بے خبری سے قتل کا معاہدے یا امان کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا۔ معاہدے کی صورت میں اس کے ارتکاب کو غدر اور معاہدے کے علاوہ بے خبری میں قتل کرنے کو غیلۃ کہاجاتا ہے ۔دوسری صورت کا قتل بعض اوقات اسلام اور مسلمانوں کے سرکش دشمنوں سے جان چھڑانے کے لیے ضرورت کے تقاضے سے بھی عمل میں لایا جاتا ہے۔

انسانی قانون اگرچہ میدانِ جنگ کے علاوہ بے خبری میں دشمن کوقتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔(۱) لیکن بعض حالات میں اسلام اس کو منع نہیں کرتا، خصوصاً کوئی سرکش آدمی جب اسلام دشمنی میں بہت گہرا اور زیادہ جارحیت دکھانے والا ہو، اسے اِسلام کی دعوت بھی پہنچ چکی ہو اور اسے یہ بھی معلوم ہو کہ اس سے لڑائی کس بنیاد پر ہو رہی ہے تو ایسے شخص کو اگر بے خبری میں قتل کردیا جائے تو کوئی حرج نہیں، یہاں تک کہ اس کو سوتے ہوئے قتل کرنا بھی جائز ہوگا۔ اس کی دلیل حسب ذیل ہے :

۱۔ بنو نضیر کے یہودی کعب بن اشرف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا گیا یہ معاہدہ توڑ دیا تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں دشمن کا ساتھ نہیں دے گا۔ اس نے اپنے غزلیہ اشعار میں مسلمانوں کی عورتوں کا تذکرہ بھی کیا، قریش مکہ کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا بھی اور کعبۃ اللہ کے پاس مسلمانوں سے لڑنے کے

۱۔ زمینی جنگ کے چارٹر کی دفعہ ۲۳ کہتی ہے: دشمن ملک کے فوجی یا شہری کو دھوکے سے اور بے خبری میں قتل کرنا ممنوع ہے لہذا یہ جائز نہیں کہ کسی اجرتی قاتل کو دشمن ملک کے سربراہ کو قتل کرنے کے لیے کرایہ پر لیا جائے یا کسی سرکاری فرد یا سربراہ کوقتل کرایا جائے۔ نہ ہی یہ جائز ہے کہ کسی دشمن کا سر کاٹنے کے لیے انعام رکھا جائے یا کسی دشمن کو قانونی تحفظ سے محروم قرار دیا جائے۔

لیے قریش کے ساتھ معاہدہ بھی کیا۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کو بھڑکایا، آپؐ کی ہجو میں شعر کہے، جنگ بدر میں قتل ہونے والے مشرکین پر رویا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی اس خبر کو ناگوار سمجھا کہ کافروں کے کچھ لوگ قتل ہو چکے ہیں اور کہا: ''یہ لوگ تو عرب کے معززین اور لوگوں کے بادشاہ ہیں۔ اللہ کی قسم! اگر محمد نے ایسے لوگوں کو قتل کیا ہے تو پھر زندہ رہنے سے مر جانا بہتر ہے۔

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کعب بن اشرف کے لیے کون تیار ہے؟ کیوں کہ اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت دی ہے۔ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا: ہماری طرف سے ابن اشرف کے مقابلہ میں کون تیار ہے؟ کیوں کہ اس نے ہمارے ساتھ عداوت کا برملا اعلان کر دیا ہے۔ اس پر محمد بن مسلمہؓ نے کہا، یا رسول اللہ! میں آپؐ کے حکم پر حاضر ہوں، میں اسے قتل کروں گا۔ چناں چہ کعب بن اشرف کو قتل کرنے کے لیے محمد بن مسلمہؓ اور قبیلۂ اوس کی شاخ بنو عبدالاشہل میں سے دو آدمیوں نے مل کر منصوبہ بنایا۔ انہوں نے حیلہ یہ کیا کہ اسے بہانے سے ایک قلعے میں لے گئے۔ وہاں ابن مسلمہؓ نے اس سے کہا: میں آپ کے سر کے بالوں کو سونگھ(۱)

۱۔ جب اس کی دشمنی حد سے گزر گئی اور مشرکینِ مکہ کو اس نے تعاون کا یقین دلایا تو اس کے بارے میں سورۂ نساء کی آیت ۵۱ بھی نازل ہوئی……پھر مدینہ پہنچ کر اس نے یہود کی ایک جماعت کو تیار کیا کہ ہم محمد کو دعوت پر بلائیں گے اور جب وہ یہاں آئیں گے تو اچانک انہیں قتل کردیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سب باتیں معلوم ہوتی رہیں یہاں تک کہ محمد بن مسلمہ اور ان کے ساتھی اسے قتل کرنے کے لیے تیار ہوئے۔ان میں محمد بن مسلمہ کے علاوہ عباد بن بشر، ابو نائلہ سلکان بن سلامہ، حارث بن اوس بن معاذ اور ابوعبس بن جبر کے نام ملتے ہیں۔ وہ اسے باتوں باتوں میں قلعے سے باہر لے گئے اور دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے، شعر وشاعری بھی چلتی رہی۔ اس نے تازہ تازہ شادی کی تھی اور زبردست خوشبو لگا رکھی تھی۔ محمد بن مسلمہ نے اس کی خوشبو کی تعریف کی تو وہ خوش ہوگیا، پھر انہوں نے کہا: میں آپ کے سر کے بالوں کو سونگھ سکتا ہوں؟۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سبل الهدى والرشاد، محمد بن يوسف الصالحي الدمشقي، الباب الحادي عشر ۶:۲۸۔ از اِکرام الحق یٰسین۔

سکتا ہوں؟ اس نے اجازت دے دی۔ محمد بن مسلمہ نے اس کا سر سونگھا، پھر ساتھیوں کو سونگھوایا۔ ابن سلمہؓ نے پھر پوچھا کہ میں ایک بار پھر سونگھ لوں؟ اس نے کہا ہاں! چناں چہ جب انہوں نے اسے اچھی طرح قابو کرلیا تو ساتھیوں سے کہا: مار ڈالو، چناں چہ انہوں نے اسے قتل کر دیا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آ کر اس کے بارے میں بتایا۔(۱)

۲۔ ابو رافع سلام بن ابی الحقیق یہودی کا قتل: ابورافع ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے خیبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں لشکر تیار کر رکھے تھے۔ چناں چہ خزرج کے چند لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے قتل کی اجازت مانگی تو آپؐ نے اجازت دے دی۔ اس طرح عبداللہ بن عتیک کی سربراہی میں پانچ آدمی اس کام کے لیے نکل پڑے۔ رات کے وقت عبداللہ اس کے گھر میں داخل ہوئے اور اسے سوتے میں قتل کر ڈالا کیوں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دیتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں دشمنانِ اسلام کی مدد کرتا تھا۔(۲)

۳۔ فتح مکہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ مردوں اور چھ عورتوں کو قتل کرنے کی اجازت دے دی تھی، کیوں کہ وہ اپنی شرارتوں میں، اپنی سخت دشمنی میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اذیت دینے میں بہت نمایاں تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان لوگوں کو قتل کر دو، چاہے وہ کعبہ کے پردوں کے نیچے بھی پائے جائیں۔(۳)

۱۔ بخاری اور مسلم نے یہ قصہ جابر بن عبداللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ فتح الباري ۷:۳۳۷، سیرۃ ابن ہشام ۱۲:۱۶۱، نیز ۲:۵۱ و ما بعد۔ اس قصہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنگ کے دوران جھوٹ بولنا جائز ہے اور اگر کافر کو اسلام کی عمومی دعوت مل چکی ہو تو اسے ذاتی دعوت دیئے بغیر بھی قتل کرنا جائز ہے۔ فتح الباري ۷:۳۴۰۔

۲۔ براء بن عازب کے حوالے سے یہ قصہ بخاری میں منقول ہے۔ فتح الباري ۷:۳۴۰، سیرۃ ابن ہشام ۲: ۲۷۳ و ما بعد۔

۳۔ زاد المعاد ۲:۷۰، سیرۃ ابن ہشام ۲: ۴۰۹، فتح الباري ۸ :۱۱-۱۵

اصل حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو بے خبری میں قتل کرنے کے مخصوص حالات تھے۔ ایسے واقعات متحارب ممالک میں بکثرت پائے جاتے ہیں، اگرچہ بین الاقوامی قانون اصولی طور پر اس کی اجازت نہیں دیتا۔

چہارم: جن لوگوں کو قتل کرنا اور اَملاک کو تلف کرنا منع ہے

جنگ میں جو بھی اپنی سوچ، تدبیر یا عمل سے حصہ لے اسے قتل کرنا جائز ہے۔ شرعی لحاظ سے عملی طور پر جنگ نہ لڑنے والوں کو قتل کرنا جائز نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے آج کل شہری آبادی کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، جس میں عورتیں، بچے، اور کسان وغیرہ شامل ہیں، سوائے اس کے کہ یہ لوگ بھی عملاً لڑنا شروع کردیں، یا جنگجوؤں کو مدد فراہم کریں یا انہیں مشورے دیں۔ یہ رائے مالکیہؒ، حنفیہؒ اور حنابلہؒ کی ہے ۔(۱) ان کی دلیل وہ احادیث ہیں جن میں عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا تقتلوا امرأة ولا وليدا** (کسی عورت یا بچے کو قتل نہ کرنا)، اور **نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن قتل النساء والصبيان** (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا) اور **لا تقتلوا ذرية ولا عسيفا** (بچوں اور مزدوروں کو قتل نہ کرنا)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب لشکر روانہ کرتے تو فرماتے: **لا تقتلوا أصحاب الصوامع** (عبادت گاہوں میں رہنے والوں کو قتل نہ کرنا)۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **انطلقوا باسم الله وعلىٰ ملة رسول الله، لا تقتلوا شيخاً فانياً ولا صغيرا وَلا امرأة** (اللہ تعالیٰ کا نام لے کر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت پر چل نکلو۔ زیادہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا)۔

جن لوگوں کو جنگ کے دوران قتل کرنا جائز نہیں انہیں جنگ سے فراغت کے بعد بھی قتل کرنا جائز نہیں۔ لیکن جو لوگ لڑیں اور انہیں جنگ کے دوران قتل کرنا جائز ہو

۱۔ الدردير و الدسوقي ۲:۱۷۷، البدائع ۷:۱۰۱، كشاف القناع ۳:۳۱، أحكام أبي يعلى، ص ۲۷

تو جنگ ختم ہونے کے بعد بھی انہیں قتل کرنا جائز ہوگا، سوائے بچوں اور ناسمجھ پاگل قسم کے لوگوں کے کہ اگر وہ جنگ میں حصہ لیں گے تو جنگ کے دوران تو انہیں قتل کرنا جائز ہوگا لیکن جنگ کے بعد اگر وہ قیدی بن جائیں تو انہیں قتل کرنا جائز نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر انہوں نے جنگ کے دوران بہت سے مسلمانوں کو بھی قتل کر دیا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ قیدی بن جانے کے بعد قتل کر دینا سزا دینے کے برابر ہے اور بچے اور پاگل کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ جنگ کے دوران قتل کرنا خود قتل کے شر سے بچنے کے لیے ہوتا ہے۔ اگر یہ شر ان سے سرزد ہو تو اس کے خاتمے کے لیے انہیں قتل کرنا جائز ہوگا۔(۱)

امام شافعیؒ اور فقہاءِ ظاہریہ کا کہنا ہے کہ عورتوں اور بچوں کے سوا باقی سب لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے کیوں کہ صحیح احادیث میں انہیں قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ پاگل بھی اسی زمرے میں شامل ہے۔(۲)

اگر دشمن مذکورہ بالا لوگوں کو ڈھال بنا لیں تو امام مالکؒ اور اوزاعی کے نزدیک ان پر وار کرنا یا انہیں قتل کرنا جائز نہیں۔(۳) سوائے اس کے کہ مسلمانوں پر دشمن کی طرف سے حملے کرنے کا اندیشہ ہو جیسا کہ مالکی علماء کا فتویٰ ہے۔

جبکہ امام شافعیؒ، حنفیہؒ، حنابلہؒ اور جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اگر انہیں ڈھال بنالیا جائے تو ایسے لوگوں کو قتل کرنا بھی جائز ہے۔

اسی طرح اگر دشمن نے مسلمانوں کو ڈھال بنا لیا ہو تو جنگی ضرورت اور عام مسلمانوں کے تحفظ کے لیے مصالح مرسلہ کی بنیاد پر مسلمانوں کو نشانہ بنائے بغیر قتل کرنا جائز ہوگا۔(۴) تاہم ضروری ہے کہ حملہ سے مقصود دشمن ہوں، نہ کہ مسلمان۔

۱۔ البدائع ۷:۱۰۱

۲۔ الأحکام السلطانية، الماوردي، ص ۳۹۔ مغني المحتاج ۴:۲۲۴

۳۔ نيل الأوطار ۷:۲۰۱۔ الدردير والدسوقي ۲:۱۷۸

۴۔ المبسوط ۱۰:۶۴، الخرشي ۳:۱۶۴، طبع دوم، التاج والإكليل للمَوّاق ۳:۳۵۱، المهذب ۲:۲۳۴، الأحکام السلطانية، الماوردی، ص ۳۹، کشاف القناع ۳:۳۹

مالکیہؒ نے ڈھال بنائے گئے مسلمانوں کو مارنے کے جواز کے لیے عام مسلمانوں کو خطرہ سے بچانے کی شرط رکھی ہے جبکہ شافعیہؒ اور حنابلہؒ نے یہ شرط رکھی ہے کہ ایسا کرنا جنگی ضرورت کے تحت ہو، مثلاً ایسے حالات میں جب ایسا کیے بغیر عام مسلمانوں کو خطرہ لاحق ہو۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے مسلمانوں کو قتل کرنے کے بدلے کفارے کی ادائیگی کو واجب قرار دیا ہے، البتہ دیت عائد کرنے میں اختلاف ہے۔

بین الاقوامی قانون نے اس بارے میں بے اعتنائی برتی ہے اور زمینی جنگ کے چارٹر کی دفعہ ۲۵ نے ان شہروں، قصبوں، رہائش گاہوں اور عمارتوں پر حملے کو بھی قانونی تحفظ فراہم کیا ہے جن کا دفاع کیا جارہا ہو۔ اسی طرح بحری جنگ کے چارٹر کی دفعہ ۲ نے ان فوجی تنصیبات کو نشانہ بنانے کی بھی اجازت دی ہے جو غیر مزاحمتی مقامات پر واقع ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قانون نے عام شہریوں کو مارنا بھی جائز ٹھہرایا ہے، چاہے وہ فوجیوں سے واضح طور پر الگ تھلگ ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ قانون مزاحمتی فوجیوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے بھی شہریوں پر حملے کی اجازت دیتا ہے، تاکہ فوجی ہتھیار ڈال دیں۔ اس کی نظر میں صرف دشمن کا حوصلہ کمزور کرنے کے لیے بھی ایسا کرنا جائز ہے۔

باقی جہاں تک اَملاک کو تباہ کرنے کا تعلق ہے جیسے عمارتیں، فصلیں، درخت اور شہری سہولیات: پل، سڑکیں وغیرہ تو اگر ضرورت پڑے تو انہیں تباہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ان میں سے کوئی چیز میدانِ جنگ میں فوجی نقل وحرکت کے لیے رکاوٹ بن رہی ہو، یا اس کے پیچھے دشمن چھپا ہوا ہو تو ایسی صورت میں انہیں تباہ کیا جا سکتا ہے۔ ہاں ایسی چیزوں کو تباہ کرنا جائز نہیں جنہیں عام ضروریات کے تحت باقی رکھنا چاہیے جیسے پانی کے ٹینک وغیرہ ، کیوں کہ اس سے عام لوگوں کو نقصان پہنچے گا یا اس کے جواب میں دشمن بھی ہمارے بند تباہ کر سکتا ہے۔

لیکن جن چیزوں کو باقی رکھنا یا تباہ کرنا کسی ضرورت کے تحت نہ آتا ہو تو جمہور فقہاءِ حنفیہؒ، شافعیہؒ، مالکیہؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ نے انہیں تباہ کرنے

کی اجازت دی ہے۔(۱) تاکہ دشمن کو ان چیزوں سے طاقت نہ مل سکے۔ ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَطَؤُونَ مَوْطِئاً يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلاً إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ﴾ [التوبة: ۱۲۰](یا وہ ایسی جگہ چلتے ہیں کہ کافروں کو غصہ آئے یا دشمنوں سے کوئی چیز لیتے ہیں تو ہر بات پر ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے)۔ نیز بنونضیر کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُم بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ﴾ [الحشر: ۲](وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے)۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ(۲) أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَى أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ﴾ [الحشر: ۵](تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا)۔

جبکہ امام اوزاعیؒ، لیثؒ، ابوثورؒ اور دوسری روایت کے مطابق امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ ان چیزوں کو تباہ کرنا جائز نہیں۔(۳) کیوں کہ یہ فساد اور تباہ کاری ہے جسے قرآن میں منع کیا گیا ہے: ﴿وَلَا تَعْثَوْاْ فِي الأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾ [البقرة: ۶۰](اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو)اور ﴿وَلَاتُفْسِدُواْ فِي الأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا﴾ [الأعراف: ۵۶](زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے)اور ﴿إِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الفَسَادَ﴾ [البقرة: ۲۰۵](اور جب پیٹھ پھیرے تو زمین میں فساد ڈالتا پھرے اور کھیتی اور جانیں تباہ کرے، اور اللہ فساد سے راضی نہیں)۔

۱۔ فتح القدير ۴:۲۸۶ وما بعد، مغني المحتاج ۴:۲۲۶، الدردير والدسوقي ۲:۱۸۱، الأحكام السلطانية، الماوردي، ص ۴۹، الأحكام، ابو يعلى، ص ۳۴، المغني، ابن قدامہ ۸:۴۵۳ وما بعد۔

۲۔ موٹی کھجوروں والے درخت کو لینہ کہا جاتا ہے، اور اسے عجوہ بھی کہا جاتا ہے۔

۳۔ المغني ۸:۴۵۳

مگر یاد رہے کہ یہ عمومی ہدایات ان حالات کے ساتھ خاص ہیں جب جنگ نہ ہو رہی ہو یا ان کے ساتھ کوئی اور مفاد وابستہ نہ ہو یعنی ایسے اِقدامات سے جنگی کامیابی کا حصول یا دشمن کو صلح کرنے پر آمادہ کرنے کا مقصد سامنے نہ ہو۔

جانوروں کو ذبح کرنا

جانور اگر کھانے کے لیے ذبح کیا جائے تو جائز ہے کیوں کہ کھانے کی نیت کے بغیر حیوان کو ذبح کرنا ممنوع ہے۔ البتہ اگر کھانے کے مقصد کے علاوہ جانور ذبح کیا جائے تو ایسا کرنے میں فقہاء کی تین آراء ہیں:

۱۔ حنفی اور مالکی فقہاء کی رائے

دشمن کی قوت توڑنے کے لیے ان کے مویشیوں کو ہلاک کرنا جائز ہے۔(۱)

۲۔ جمہور حنابلہؒ اور ظاہریہؒ کی رائے (۲)

ان حضرات کی رائے میں ایسا کرنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وصیت کی تھی کہ بکری ہلاک نہ کرنا مگر صرف کھانے کی نیت سے۔ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے کھڑے جانور کو ذبح کرنے سے منع فرمایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں کو بھوکا پیاسا رکھ کر ہلاک کرنے سے منع فرمایا تھا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جانور کو پکڑنے کے بعد اس پر وار نہ کیا جائے۔

۳۔ شافعیہؒ کی رائے (۳)

جانور کو بلا ضرورت ہلاک کرنا جائز نہیں۔ ضرورت کی مثال یہ ہے کہ ہلاک

۱۔ فتح القدير ۴:۳۰۸، الدردير والدسوق ۲:۱۸۱

۲۔ المغني ۸:۴۵۱، المحلى ۷:۳۴۳

۳۔ مغني المحتاج ۴:۲۲۷، المهذب ۲:۲۳۴

نہ کیا جائے تو شاید دشمن اس جانور کی مدد سے ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے کیوں کہ حدیث میں جانور کو ہلاک کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ البتہ ضرورت کے موقع پر ممنوع چیز بھی جائز ہو جاتی ہے۔

زمینی جنگ کے چارٹر کی دفعہ ۲۳/۷ میں کہا گیا ہے کہ جنگی ضرورت کے سوا کسی بھی چیز کو تلف کرنا ممنوع ہے۔ مثلاً پلوں، سڑکوں وغیرہ کو دشمن کے استعمال سے بچانے کے لیے تباہ کرنا یا ضرورت سے زائد ریلوے لائن کو اس لیے ناکارہ بنادینا کہ دوسری طرف سے دشمن اسے استعمال نہ کرسکے، یا مکانات و عمارات کو اس لیے تباہ کرنا کہ دشمن پر حملے کے لیے توپخانہ نصب کیا جاسکے۔ یا جنگی ضرورت کے تحت کھیتوں میں کھڑی فصلوں کو تلف کردینا۔ ۱۹۴۳ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی نے اور ۱۹۰۱ء میں انگلینڈ نے اپنی بعض جنگوں میں ایسی کارروائیاں کی تھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی عمومی روح کے مطابق فساد اور بربادی برپا کرنا ناپسندیدہ چیز ہے۔اسلام جنگی ضرورت کے سوا جنگ کے دوران املاک کو تلف کرنے اور لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ حملوں کے دوران لوگوں کا قتل ہونا اور جن لوگوں کا قتل جائز نہیں انہیں ڈھال بننے کی حالت میں قتل کرنا جنگی ضرورت کی مثالیں ہیں۔دشمن ملک کے تمام غیر مسلم شہریوں کو اسلام جنگجو نہیں سمجھتا ۔ اس کے مطابق جنگجو صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر جنگ کرنے کے لیے پیش کیا ہو، جیسے باقاعدہ فوجی یا رضاکار یا زمینی، سمندری یا فضائی جنگ کی منصوبہ بندی کرنے والے۔

وہ شہری جو ہتھیار ڈال چکے ہوں اور اپنے کاموں میں لگ چکے ہوں یا وہ لوگ جن کا کام عملاً دشمن کی مدد کرنے سے الگ ہو جیسے غیر ملکی ملٹری اٹیچی، یا ذرائع ابلاغ کے مراسلہ نگار یا افواج کے ساتھ منسلک مذہبی کارکن، تو ایسے لوگوں کو جنگجو نہیں سمجھا جاتا کہ ان کا خون بہایا جائے۔(۱)

۱۔ آثار الحرب، ڈاکٹر وہبہ ارحیلی، ص ۵۰۳

ہاں ریاست کا سربراہ، ڈاکٹر، نرسنگ سٹاف، دوافروش اور فوجی ڈاک کا عملہ یہ لوگ چاہے عملاً جنگ نہ بھی کریں، انہیں جنگجو تصور کیا جائے گا۔ اس لیے کہ ریاست کا سربراہ دشمن فوج کا حوصلہ بلند رکھتا ہے، ڈاکٹر وغیرہ دشمن جنگجوؤں کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اور یوں وہ زخمی دشمن صحت یاب ہو کر دوبارہ مسلمانوں سے لڑنے کے قابل بن جاتے ہیں اور اس طرح دشمن کو نئی طاقت مل جاتی ہے۔

بین الاقوامی قانون اس طرح کے لوگوں کو جنگجو قرار دیتا ہے۔ یہ بھی اسی سلوک کے مستحق ہیں جو جنگی قیدیوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔(۱)

جنگی مشیر بھی جنگجو سمجھے جاتے ہیں کیوں کہ جس طرح جنگ کرنے کے لیے اسلحہ اور فوج کے عزم و حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اس سے بڑھ کر وہاں فوجی منصوبہ سازی اور جنگی رہنمائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درید بن صمہ کو اسی لیے قتل کروا دیا تھا کہ وہ بہت ذہین اور جنگی چالوں کا ماہر تھا اور اس کی قوم اسے مشورے کے لیے آگے رکھا ہوا تھا، حالاں کہ وہ بہت بوڑھا تھا۔ مشورہ جنگ میں بہت بڑی مدد شمار ہوتا ہے۔ بلکہ مشیر ہی جنگ کا منصوبہ بناتا ہے اور جنگی کامیابی کا دار و مدار اسی پر ہوتا ہے۔(۲)

پنجم: مجاہدین کی ذمہ داریاں

مسلمان مجاہدین کے لیے لازم ہے کہ وہ جنگ کے دوران ثابت قدم رہیں۔ جب انہیں یقین ہو جائے کہ وہ دشمن کے مقابلے میں ہیں تو اس کے سامنے ڈٹ جائیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُواْ﴾ [الأنفال: ۴۵](اے ایمان لانے والو! جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو)۔

۱۔ مبادئ القانون الدولي، حافظ غانم، ص ۵۰۵

۲۔ كتاب الأم، الشافعي ۴:۱۵۷، المغني ۸:۴۷۸، سیرۃ ابن ہشام ۲:۴۵۳

ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ دو کافروں کے مقابلے میں عزم و ہمت کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الآنَ خَفَّفَ اللّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفاً فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّئَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُواْ مِئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُواْ أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللّهِ وَاللّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ [الأنفال:٦٦]

اچھا اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کیا اور اس نے معلوم کر لیا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے سو آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو وہ دوسو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آ جائیں گے اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہیں۔

میدان سے بھاگنا مسلمان پر حرام اور ممنوع ہے کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ جنگ سے بھاگنے کو سات مہلک گناہوں میں شمار کیا ہے۔(۱) لیکن اگر مجاہدین کو یقین ہو جائے کہ ان پر غلبہ پا لیا جائے گا اور وہ قتل کر دیئے جائیں گے تو پھر دشمن سے بھاگنے اور دوسرے مسلمانوں کے پاس مدد حاصل کرنے کے لیے جانے میں کوئی حرج نہیں۔ تعداد کا کوئی لحاظ نہیں یہاں تک کہ اگر ایک شخص غیر مسلح ہو اور دو مسلح کافروں سے، یا ایک مسلح کافر سے، بھاگ جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ اگر کوئی بیمار پڑ جائے یا کسی دوسری مجبوری سے لڑنے سے عاجز آ جائے اور بھاگ جائے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں۔(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُواْ زَحْفاً فَلاَ تُوَلُّوهُمُ الأَدْبَارَ. وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلاَّ مُتَحَرِّفاً لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزاً

۱۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی بروایت ابوہریرہؓ

۲۔ المغني ۸:۴۸۵، المهذب ۲:۲۳۳، الأحكام السلطانية، الماوردی، ص ۴۲

إِلَى فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾ [الأنفال:۱۵]

اے ایمان والو! جب ایک لشکر کی صورت میں تمہارا کفار سے آمنا سامنا ہو تو ان کے مقابلے میں پیٹھ نہ پھیرو، جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری، الاّ یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لیے، تو وہ اللہ کے غضب کا مستحق ٹھہرے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بہت بری جائے بازگشت ہے۔

جنگ قادسیہ کے موقع پر جب مسلمان پسپا ہو کر حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو حضرت عمرؓ نے ان کے اس فعل کو غلط نہیں کہا اور فرمایا کہ میں ہر مسلمان کے لیے دوسری فوج ہوں، اور یوں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ کیا:

﴿او متحیزا الی فئة﴾ (یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لیے)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف اس دستہ کے بھاگ آنے کو درست قرار دیا جو نجد میں دشمن کی قوت کے مقابلے میں قتال جاری نہ رکھ سکا۔ ان لوگوں نے واپس مدینہ آ کر کہا، ہم بھاگنے والے ہیں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ تم واپس اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے جانے والے ہو اور میں تمہارا گروہ ہوں۔ جس کے پاس تم نے آ کر پناہ لی ہے تاکہ تم میرے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں پلٹ کر جا سکو۔(۱)

طائف کا ایک مدت تک محاصرہ کرنے کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل ہم واپس جائیں گے اور حضرت عمرؓ نے کوچ کرنے کا اعلان کیا تو صحابہؓ خوش ہو گئے۔(۲)

۱۔ نیل الأوطار ۷:۲۵۲، ابو داؤد ۳:۶۳

۲۔ زاد المعاد ۲:۱۹۷، سیرۃ ابن ہشام ۲: ۴۸۴

غزوۂ مؤتہ کے موقع پر تین قائدین کے قتل ہونے کے بعد جب خالدؓ بن ولید اپنے لشکر کو بحفاظت نکال لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو جنگی فتح قرار دیا اور جو لوگ جنگ سے بھاگ آنے کا طعنہ دے رہے تھے، ان کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بھاگنے والے نہیں بلکہ یہ ان شاء اللہ بار بار حملہ آور ہونے والے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان فوجیوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی جبکہ رومیوں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔(۱)

حضرت معاویہؓ یا یزید کے دور میں قسطنطنیہ کے پہلے محاصرے کے بعد مسلمان یونانی جنگی بیڑے کے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے جزائر قبرص، روڈس اور ارواد سے پیچھے ہٹ آئے تھے۔(۲) اسی طرح ۹۹ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں جب مسلمہ بن عبدالملک کی قیادت میں قسطنطنیہ کا دوسری بار محاصرہ کیا گیا تو اس سے بھی مسلمان پیچھے ہٹ آئے تھے۔(۳)

آج کے دور میں فوجوں کا پیچھے ہٹ آنا ایک عام طریقہ ہے۔ چناں چہ دونوں عالمی جنگوں میں اس طرح ہوا ہے۔ مسلمان مجاہدین کے فرائض کو شاید سب سے بہتر انداز میں الماوردیؒ نے اپنی کتاب **الأحکام السلطانیة** میں اور ابویعلیؒ نے اپنی کتاب **الأحکام السلطانیة** میں بیان کیا ہے۔(۴) دونوں نے اختصار کے ساتھ کہا: مسلمان مجاہدین کے لیے جن باتوں کی پابندی کرنا لازم ہے وہ دو طرح کی ہیں: ان میں سے ایک قسم کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جبکہ دوسری کا تعلق اپنے قائد کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھنے والے حقوق چار ہیں:

۱۔ سیرۃ ابن ہشام۲:۳۸۲، الروض الأنف ۲:۲۶۰، البدایة والنهایة۴:۲۴۸، تاریخ طبری۳: ۱۰۹

۲۔ التاریخ السیاسی للدولة العربیة ، ڈاکٹر عبدالمنعم ماجد۲:۴۸

۳۔ حوالۂ سابقہ۲:۲۴۸ وما بعد

۴۔ الأحکام السلطانیة، الماوردي ،ص۴۲ وما بعد، ابو یعلیٰ ص ۲۹ وما بعد۔

۱۔ دشمن کے ساتھ ٹکراؤ کے دوران دشمن سے بڑھ کر صبر اور ثابت قدمی سے کام لینا اور دگنی تعداد تک دشمن ہو یا اس سے کم ہو تو اس سے پسپا نہ ہونا۔

۲۔ لڑنے کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرنا اور جو نظام اس کے خلاف ہوں ان کو باطل ثابت کرنا۔

۳۔ جتنا مالِ غنیمت ہاتھ آئے اسے دیانت داری کے ساتھ قائد کے پاس جمع کرایا جائے۔ اس میں سے کوئی چیز چھپا کر نہ رکھی جائے تاکہ جہاد میں شریک دوسرے تمام مجاہدین میں اسے تقسیم کیا جائے۔

۴۔ رشتہ دار کافر کی مدد نہ کی جائے اور نہ اللہ کے دین کی نصرت کے مقابلہ میں کسی دوست کی مدد کی جائے۔

اسی طرح قائد کے حقوق بھی چار ہیں:

۱۔ قائد کی بات مانی جائے اور اس کی ماتحتی میں رہا جائے۔

۲۔ معاملہ قائد کی رائے اور اس کی حکمت عملی کے سپرد کر دیا جائے تاکہ ان کی آراء میں اختلاف پیدا نہ ہو۔

۳۔ قائد کے احکامات پر مستعدی سے عمل کیا جائے اور جس چیز سے وہ روکے یا ڈانٹے اس سے باز رہا جائے۔

۴۔ قائد جب غنیمت کا مال تقسیم کرنے لگے تو اس سے نہ الجھا جائے۔

پانچویں بحث

جنگ کا خاتمہ

اسلام کی رو سے جنگ کا خاتمہ درج ذیل پانچ طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے ہوتا ہے:

۱۔ دشمن اسلام قبول کرلے: یوں لوگوں کی جان و مال محفوظ ہو جاتے ہیں، اِسلام کی وجہ سے ان کی سرزمین دارالاسلام بن جاتی ہے اور وہاں اسلامی احکامات نافذ ہوجاتے ہیں۔ اس مسئلے پر جمہور فقہاء کا اتفاق ہے۔(۱)

۲۔ دشمن کی مسلمانوں کے ساتھ صلح ہو جائے: یہ صلح عارضی ہوتو معاہدۂ امن ہے اور دائمی ہوتو معاہدۂ ذمہ ہے۔ عارضی معاہدۂ امن کے نتیجے میں جنگ ختم ہو جاتی ہے اور معاہدہ کرنے والوں کی جان، مال، عورتیں اور بچے سب محفوظ ہو جاتے ہیں کیوں کہ یہ امان کا معاہدہ بھی ہے۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ جب تک دشمن کی طرف سے کوئی اس معاہدے کو توڑ نہ دے اس وقت تک مسلمانوں کی طرف سے دشمن کو کوئی گزند نہ پہنچائی جائے۔(۲)

دائمی اور مستقل معاہدۂ امن کے نتیجے میں تو بطریق اولیٰ جنگ کا مستقل طور پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور مسلمانوں اور کافروں دونوں کی جان، مال، سرزمین اور آبرو کو امن نصیب ہو جاتا ہے اور ان کی سرزمین دارالاسلام کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ معاہدے کے نتیجے میں یہ سب چیزیں محترم اور محفوظ ہو جاتی ہیں۔(۳) یوں انہیں

۱۔ آثار الحرب، وہبہ الزحیلی، ص ۶۴۸

۲۔ ایضاً

۳۔ آثار الحرب، ڈاکٹر وھبہ الزحیلی ص ۷۲۸ وما بعد مع مراجع قدیمہ، رسالة أحكام الذميين والمستأمنين في دار الإسلام، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان۔

وہی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو ہمیں حاصل ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو ہم پر ہیں۔ انہیں مذہبی آزادی حاصل رہے گی اور چونکہ وہ ہمارے جہادی کاموں میں حصہ لینے اور سرزمین کے دفاع سے مستثنیٰ ہوں گے اس لیے اس کے بدلے وہ ہمیں جزیہ دیں گے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ یہ کافر لوگ جزیہ اس لیے دیتے ہیں کہ ان کی املاک بھی ہماری املاک کی طرح محفوظ ہوں گی اور ان کا خون بھی ہمارے خون کی طرح قابل احترام ہو گا۔(۱)

۳۔ کبھی جنگ کا خاتمہ دشمن کا علاقہ فتح کرنے کی صورت میں بھی ہوتا ہے: اس صورت میں دشمن کا علاقہ دارالاسلام میں شامل ہو جاتا ہے اور اسلامی ریاست کی اطاعت تسلیم کرنے والوں کو وہی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں ۔ اسی طرح ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو مسلمانوں پر عائد ہیں۔ ایسا تب ہوتا ہے جب یہ جنگ اسلامی اصولوں کے مطابق جائز ہو۔ اس میں یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کی یہ فتح مکمل اور مستقل ہو اور جنگی کارروائیاں ختم ہو چکی ہوں۔

یاد رہے کہ بین الاقوامی طور پر فتح کو غیر قانونی سمجھنے کی سوچ موجودہ زمانے کے آخری سالوں میں اس وقت وجود میں آئی جب غیر دفاعی جنگ کو ممنوع قرار دیا گیا اور وہ بھی صرف نظریاتی طور پر، عملی طور پر نہیں۔(۲)

فتح کے بعد مفتوحہ زمین پر پراپرٹی ٹیکس عائد کر کے اسے بالعموم اصل مالکان ہی کے قبضہ میں رہنے دیا جاتا ہے۔ یہ ٹیکس خراج ہے،جیسا کہ حضرت عمرؓ نے سواد عراق، شام، اور مصر میں کیا تھا اور دوسرے صحابہ نے اس فیصلے کو برقرار رکھا جس کی وجہ سے یہ اجماعی فیصلہ بن گیا۔

۱۔ نصب الرایۃ ۳:۳۸۱

۲۔ آثار الحرب، ص ۳۸۷ و ما بعد

مفتوحہ علاقے کے باشندے معاہدۂ ذمہ کے تحت مسلمانوں کے ساتھ منسلک رہتے ہیں۔ معاہدۂ ذمہ کے بغیر بھی ان کا مسلمانوں سے منسلک ہونا ممکن ہے۔ وہ معاہدۂ ذمہ کی بجائے معاہدۂ دوستی کی بنیاد پر مسلمانوں سے وفاداری کا اِعلان کر کے کسی مالی ذمہ داری کے بغیر یہ مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

بین الاقوامی جنگی قانون کے تحت فاتح ملک کو مفتوحہ علاقہ پر ہر طرح کے سیاسی، انتظامی، قانونی اور عدالتی اختیارات اور حالیہ تمام ریاستی اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں اور مفتوحہ علاقہ ایک طرح سے فاتح ملک کا حصہ قرار پاتا ہے۔

۴۔ کبھی جنگ اس طرح بھی ختم ہو جاتی ہے کہ لڑائی چھوڑ دی جائے یا پوری فوج اس وقت پسپا ہو جائے جب سالار لشکر مناسب سمجھے کہ جنگ سے پسپائی بہتر ہے۔ چاہے وہ اس لیے ہو کہ فطری حالات کے پیش نظر فوج کا اس علاقے میں ٹھہرنا خطرناک ہو، یا اس لیے کہ اگر جنگ جاری رکھی جائے تو کوئی اہم مفاد چھوٹ جائے گا، یا اس لیے ہو کہ فوج کو دشمن کی برتر طاقت سے محفوظ رکھا جائے جیسا کہ شام میں غزوۂ مؤتہ کے موقع پر خالد بن ولید نے فوج کو واپس کھینچ کر رومیوں کی بڑی فوج کا سامنے کرنے سے بچا لیا تھا۔ دیگر کئی مواقع پر بھی مسلمانوں نے ایسا کیا ہے جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔

لڑائی چھوڑنے سے لڑائی صرف مادی اور عملی نقطۂ نظر سے ختم ہو جاتی ہے۔ مگر شرعی نقطۂ نظر سے مستقل جنگ کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ مطلب یہ کہ جنگی صورت حال اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک فتح حاصل نہ ہو، یا دشمن اِسلام کو قبول نہ کر لے، یا معاہدہ امن کے لیے تیار نہ ہو۔

۵۔ آخری بات یہ کہ پر امن طریقے سے بھی جنگ کا خاتمہ ممکن ہے، اور وہ یہ کہ برسرِ پیکار طرفین یا اَطراف اپنے قضیے کو کسی اور شخصیت یا ادارے کے سامنے پیش کرنے پر اتفاق کر لیں تا کہ وہ ان کا فیصلہ کر دے۔ ہمارے فقہاء کے الفاظ میں: ھو

تولیةالخَصمینِ حاکماً یَحکم بینهما، فیکون الحَکَم فیما بین الخصمَین کالقاضي في حق الناس کا فة، وفي حق غیرهما کمنزلة المصلح ۔(۱)(تحکیم یہ ہے کہ مخالف فریقین کسی شخص کو اپنے لیے ایک ثالث بنا لیں جو ان کے جھگڑے کا فیصلہ کردے۔ یہ ثالث فریقینِ جنگ کے لیے اس حیثیت کا مالک ہوگا جو حیثیت عام لوگوں کے درمیان قاضی کی ہوتی ہے،البتہ یہ فیصلہ فریقین کے علاوہ دوسرے لوگوں کے حق میں صلح کرانے والے کا فیصلہ قرار پائے گا۔) مسلمانوں کے ساتھ ثالثی میں غیرمسلموں کو شریک کرنے میں بھی کوئی شرعی رکاوٹ نہیں۔ فقہاءِ مالکیہؒ نے کہا ہے کہ جب غیرمسلموں سے خوف ہو تو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ثالثی کردار ادا کرنے کے لیے غیرمسلموں کے ساتھ معاہدۂ صلح کرنا جائز ہے۔(۲)

یہودِ بنوقریظہ پچیس دن تک محاصرے میں رہنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کروانے پر تیار ہو گئے تھے تو آپؐ نے ان کی ثالثی کا کام قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ کے سپرد کیا تھا۔ یہودیوں نے بھی ان کو ثالث کے طور پر قبول کیا، اس لیے کہ زمانہ جاہلیت میں اوس اور بنوقریظہ باہم حلیف رہے تھے۔ چناں چہ سعدؓ نے فیصلہ سنایا کہ بنوقریظہ کے لڑنے والے مرد قتل کر دیئے جائیں، ان کی اَملاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں، اور ان کے بیوی بچوں کو قیدی بنا لیا جائے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لقَدِ حکمتَ فیهم بحکم الله من فوق سبعة أرقعة** (تم نے ان کے بارے میں ایسا فیصلہ سنایا ہے جو سات آسمانوں کے اوپر سے اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔(۳)

اسلامی تاریخ میں بھی حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان مسلمانوں کے دو گروہوں کے داخلی معاملے میں ثالث بنانے کا واقعہ موجود ہے۔

۱۔ الفتاویٰ الهندیة ۳:۳۹۷،البحر الرائق ۷:۲۴

۲۔ الخرشي ۳:۴:۱۷،طبع اوّل

۳۔ سیرۃ ابن ہشام ۲:۲۳۹ وما بعد

ثالثی میں بین الاقوامی قانون کے اصولوں (یعنی حق و انصاف کے ضوابط) پر عمل کرنے میں بھی کوئی شرعی رکاوٹ نہیں کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت سعد بن معاذؓ کو بنوقریظہ کے بارے میں ثالث مقرر کرتے ہوئے ایسے اصول متعین کر دیئے تھے۔

بین الاقوامی عدالت انصاف میں ثالثی کے اصول یا تو سارے ممالک کے اتفاق رائے سے بنتے ہیں یا وہ ایسی روایات اور رواج ہوتے ہیں جن پر بین الاقوامی برادری کاربند ہوتی ہے اور یا وہ عدل و انصاف کا کوئی ضابطہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی ضابطہ مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچائے تو جیسا کہ بین الاقوامی طور پر طے پا چکا ہے، مسلمانوں کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے نزاع کو مذکورہ عدالت انصاف میں پیش ہی نہ کریں۔

افراد اور اَملاک پر جنگ کے اثرات

دشمن کے افراد اور اَملاک پر جنگ کے بہت بڑے اثرات مرتب ہوتے ہیں:

ا۔ دشمن کے افراد پر جنگ کے اثرات

یہ اثرات قیدیوں کے معاملے میں تو واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں کہ رواج یہی چلا آ رہا ہے کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد دو فریقوں میں سے ہر ایک کے کچھ افراد دوسرے فریق کے قبضے میں آ جاتے ہیں، جنہیں جنگی قیدی شمار کیا جاتا ہے۔

قیدیوں سے سلوک

دشمن کے قیدیوں سے نرمی، مہربانی، انسانی ہمدردی، عزت، نیکی اور احسان کے سلوک میں مسلمان فکری اور عملی دونوں لحاظ سے ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: استوصوا بالأساریٰ خیرا (قیدیوں کے بارے میں میری نصیحت ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔)(۱) امام احمدؒ کی روایت کے مطابق

۱۔ منتخب کنزالعمال (بحوالہ مسند احمد) ۲:۳۱۳

ابوعزیز بن عمیر نے بتایا کہ مجھے ایک انصاری شخص نے قیدی بنا رکھا تھا تو میرے بھائی معصب بن عمیرؓ میرے پاس سے گزرے اور انصاریؓ سے کہا: اسے خوب کس کے باندھنا، اس کی ماں دولت مند ہے۔ ابوعزیز نے مزید بیان کیا کہ جب مجھے بدر سے پکڑ کر مدینہ لائے تو میں انصار کے ایک گروہ کے قبضے میں تھا۔ جب بھی ان کا دوپہر یا رات کا کھانا لایا جاتا وہ مجھے خاص طور پر روٹی کھلاتے، اور خود کھجوریں کھاتے، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمارے بارے میں اسی طرح کی ہدایات دی ہوئی تھیں۔ ان میں سے جس کے ہاتھ میں بھی روٹی کا ٹکڑا پہنچ جاتا وہ اسے مجھے پکڑا دیتا، مجھے شرم آتی اور میں وہ ٹکڑا ان میں سے کسی کو واپس کر دیتا لیکن وہ اسے ہاتھ لگائے بغیر واپس کر دیتا۔(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً. إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُوراً﴾

[الدھر:۸–۹]

اور کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین، یتیم اور اسیر کو اور کہتے ہیں کہ ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکرگزاری۔

اسی بناء پر فقہاء کہتے ہیں کہ قیدی کو بھوک اور پیاس وغیرہ کی سزا دینا جائز نہیں۔ اس لیے کہ اس سزا کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بات بھی ہو چکی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوقریظہ کے بارے میں اس وقت فرمایا جب شدید گرم دن میں گرمی کا بڑا زور پڑ گیا کہ: لَا تجمعوا علیھم حر ھذا الیوم وحرّ السلاح، قيّلوھم حتی یبردوا(۲)(ان قیدیوں پر آج دن کی گرمی اور ہتھیاروں کی گرمی دونوں جمع نہ دو۔ بلکہ انہیں آرام کرواؤ تاکہ ٹھنڈے ہو جائیں۔)

۱۔　مجمع الزوائد ۶:۸۶

۲۔　شرح السیر الکبیر ۲:۲۶۴

کافی عرصے تک مسلمانوں کی تاریخ میں یہی طریقہ چلتا رہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے قیدیوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا۔ چناں چہ شروع شروع میں قیدی کو مسجد میں اس وقت تک باندھ دیا جاتا جب تک اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو جاتا، یعنی یا تو وہ اسلام قبول کر لیتا، یا اسے بطورِ اِحسان بلامعاوضہ چھوڑ دیا جاتا یا فدیہ لے کر رہا کردیا جاتا، یا پھر جنگی قیدیوں کے تبادلہ کے طور پر رہا کر دیا جاتا۔ قید کے دوران اسے مناسب خوراک، پانی، لباس، فراہم کیا جاتا اور اس کا اچھی طرح علاج کیا جاتا۔ قیدی کو فوجی راز اگلنے پر مجبور نہ کیا جاتا۔(۱) عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دورِ خلافت میں بیزنطی رومیوں کے ساتھ مسلمان اور غیر مسلم قیدیوں کے مسائل اور ضروریات کے بارے میں گفت و شنید کی جو سابقہ اموی خلفاء کے ادوار میں ایشیائے کوچک میں کیے گئے حملوں کے بعد پیش آئے تھے۔ (۲)

صلیبی جنگوں کے دوران قیدیوں کے ساتھ صلاح الدین ایوبی کا حسن سلوک تو عفو ودرگزر اور بلند کردار کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ ان کے پاس کچھ عورتیں آئیں اور اپنے شوہروں اور بچوں کی رہائی کے لیے واسطے دیئے۔ صلاح الدینؒ اس سے بے حد متاثر ہوئے اور حکم دیا کہ قیدیوں کو رُہا کر دیا جائے اور انہیں ان کے اعزہ کے پاس بھیج دیا جائے۔ ان میں سے جو یتیم تھے اور جو بیوائیں تھیں ان میں زکوٰۃ و صدقات تقسیم کیے جائیں۔ نیز انہوں نے زیارات کی غرض سے آئے ہوئے مسیحی اطباء کے ہاتھوں زخمیوں اور بیماروں کا خاطر خواہ علاج کروایا۔(۳)

لیکن اس کے برعکس صلیبی عیسائی، جنگی قیدیوں کو قتل کر دیا کرتے تھے، جیسا کہ شیر دل انگریز سپہ سالار رچرڈ نے بیت المقدس کے بالکل سامنے تین ہزار مسلمانوں

۱۔ آثار الحرب، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، ص ۴۰۸ وما بعد

۲۔ التاریخ السیاسی للدولۃ العربیۃ، ڈاکٹر عبدالمنعم ماجد۲: ۲۶۸

۳۔ تاریخ الإسلام السیاسی، ڈاکٹر حسن ابراہیم ۴: ۱۱۲، طبع اوّل

کو شہید کر دیا۔ صلیبیوں نے پہلی صلیبی جنگ میں ستر ہزار سے زائد مقامی باشندوں کو قتل کیا تھا۔

بین الاقوامی قانون نے قیدیوں سے رحمدلانہ سلوک کا قانون اسلام ہی سے مستعار لیا ہے۔ چناں چہ اس قانون کی رو سے قیدیوں کی زندگی کو تحفظ دینا ضروری قرار دیا گیا ہے، اور مہذب انسانیت کے تقاضوں کے تحت قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ قیدیوں کے ساتھ سلوک کے معاملے کو ہیگ میں ۱۹۰۷ء کے زمینی جنگ کے چارٹر کی دفعات ۲۰-۴ اور دوسرے جنیوا کنونشن منعقدہ ۱۹۲۹ء و ۱۹۴۹ء کے اعلامیہ میں بھی اسے شامل کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی قانون کی رو سے قید کو سزا نہیں سمجھا گیا بلکہ اسے ایک غیر مسلح دشمن کے مقابلہ میں ایک احتیاطی تدبیر قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے ریاستوں کے درمیان جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک میں سوچی سمجھی سکیم کے تحت سختی، یا اذیت ناک بے توجہی کا بکثرت دخل رہتا تھا۔ قوموں میں یہ سوچ کہ جنگی قیدی کوئی مجرم نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ مجرموں والا سلوک کیا جائے، اٹھارہویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئی۔(۱)

فقہاء کے نزدیک جنگی قیدیوں کا انجام

ہمارے فقہاء کی رائے میں جنگی قیدیوں کا انجام مسلمان قیادت کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ جیسے مناسب سمجھے مندرجہ ذیل طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کر لے۔ احناف کے نزدیک وہ طریقے یہ ہیں:(۲) یا تو انہیں قتل کر دیا جائے، یا غلام بنا لیا جائے، یا مسلمانوں کے ذمہ پر آزاد کر کے چھوڑ دیا جائے۔ سوائے عرب مشرکین اور مرتدین کے، کہ انہیں نہ تو غلام بنایا جائے گا، نہ ذمی۔

۱۔ قانون الحرب والحیاد، محمود سامی جنینہ، ص ۲۷۷۔ القانون الدولي، ابو ہیف، ص ۶۱۸، القانون الدولي، حافظ غانم، ص ۶۰۳

۲۔ شرح السیر الکبیر ۲:۲۶۱ وما بعد، ۳:۲۸۴، المبسوط ۱۰:۶۴، ۲۴:۱۳۸، البدائع ۷:۱۱۹، فتح القدیر والعنایۃ ۴:۳۰۵

احنافؒ کے سوا دوسرے فقہاء کے نزدیک یہ چار طریقے ہیں:(۱)

۱۔ قتل کرنا، ۲۔ غلام بنانا، ۳۔ احسان کے طور پر رہا کرنا یا فدیہ لے کر رہا کرنا۔ ۴۔ مسلمان قیدیوں کے ساتھ تبادلہ کر کے رہا کرنا۔

مالکی فقہاء نے ایک پانچویں طریقے کا اضافہ بھی کیا ہے۔(۲) اور وہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ ذمی بنانے کا معاہدہ کر لیا جائے اور ان سے جزیہ وصول کیا جائے۔ تاہم ظہور اسلام سے پہلے ان میں سے کسی ایک طریقے کے انتخاب کے لیے اس وقت کے عرف و رواج کا لحاظ رکھاجاتا تھا۔ جب اسلام آیا تو اس نے معاملہ بالمثل (اَدلے کا بدلہ) کے طور پر یہ طریقے برقرار رکھے، مگر جہاں تک قیدیوں کو قتل کرنے کا تعلق ہے تو مسلمانوں کے ہاں اِس کی نوبت کہیں خال خال ہی آئی ہوگی، اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی ہے تو نہایت محدود تعداد میں ہوا۔ مثال کے طور پر غزوۂ بدر کے موقع پر دو قیدیوں کو قتل کیا گیا اور غزوۂ احد کے موقع پر صرف ایک کو قتل کیا گیا۔ البتہ بنوقریظہ یہودیوں کو ثالث کے فیصلے کے نتیجے میں قتل کیا گیا۔ فتح مکہ کے موقع پر صرف آٹھ آدمیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا، اور وہ بھی مخصوص حالات کی وجہ سے کہ ان لوگوں نے دشمنی کی انتہا کر دی تھی اور اذیت دینے میں بہت آگے نکل گئے تھے یا بار بار عہدشکنی کرتے رہے اور مسلمانوں کو بے وقعت سمجھ کر ان کا مذاق اڑاتے رہے۔ مقصد یہ تھا کہ مادۂ فساد ختم کیا جائے اور برائی کی جڑ کو کاٹ دیا جائے۔ اگر فتنہ کی شہ رگ نہ کاٹی جاتی تو یہ فتنہ مستقل طور پر موجود رہتا۔

دوسری طرف ابھی تک حوالات اور جیلوں میں چوری چھپے زہرخورانی اور اذیت دینے وغیرہ کی صورت میں سزائیں دی جا رہی ہیں۔

۱۔ الأمّ، الشافعي ۴:۶۸، ۱۷۶، مغني المحتاج ۴:۲۲۸، کشاف القناع ۳:۴۰، اختلاف الفقهاء، ابن جریر طبری، ص ۱۴۲

۲۔ الدردير والدسوقي ۲: ۱۶۹، الخرشي ۳: ۱۵۰-۱۵۳

اسلام مقتولین کی میتوں کا بھی احترام کرتا ہے۔ اس ضمن میں مقتول کی میت دشمن کے حوالے کرنے میں کوئی مانع نہیں، جیسا کہ غزوۂ خندق کے بعد نوفل بن عبداللہ کی میت حوالے کر دی گئی تھی۔ اسی طرح اسلام کی رو سے مقتول کا مثلہ کرنا حرام ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں کو ہدایت کرتا ہے کہ مقتولین کی میتوں کو زمین پر چھوڑنے کی بجائے قبروں میں دفن کیا جائے جیسا کہ غزوۂ بدر کے بعد مشرکین کو قلیبِ بدر میں دفن کیا گیا تھا۔ مقتولین کی لاشیں اٹھانے کے لیے اسلام جنگ روکنے کی بھی اجازت دیتا ہے اور زخمیوں اور بیماروں کا علاج کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور مسلمان زخمی اور بیمار جنگی قیدیوں پر حملہ نہیں کرتے۔(۱)

باقی رہا غلام بنانا تو یہ بھی معاملہ بالمثل تھا، جسے ان لوگوں کے عمل کے جواب میں اختیار کیا گیا تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:﴿فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ﴾ [البقرة: ۱۹۴](لہذا جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو)۔نیز ارشاد ہے:﴿وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ﴾ [البقرة: ۱۹۴] (اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہوگا)۔

یہ بھی صرف ان حالات میں جائز ہے جب کافر مسلمان قیدیوں کو غلام بنا لیں۔ اس صورت میں اگر مسلمان ان کے قیدیوں کو غلام نہیں بنائیں گے تو وہ لوگ اپنے اس رویے سے باز نہیں آئیں گے۔

غلام بنانے کا رواج چوں کہ اس وقت کی معاشی اور معاشرتی زندگی میں اہم ستون کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے اِسلام نے یک دَم اِس کی حرمت کا فیصلہ نہیں دے دیا بلکہ اس نے اِس سلسلے میں انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے میں فعال اور مضبوط کردار ادا کیا۔ چناں چہ اِس نے غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ انسان بنیادی طور پر آزاد ہے اور غلامی ایک عارضی حالت ہے۔

۱۔　آثار الحرب، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، ص ۴۷۵-۴۹۲

اِسلام نے لوگوں کو بتایا کہ معاشرے میں ظلم کی موجودگی کا احساس پیدا کرنا ضروری ہے کیوں کہ فکری اور عملی طور پر زیادہ اہمیت ظلم کی موجودگی کی نہیں بلکہ اہم ترین چیز یہ ہے کہ لوگوں کو ظلم کا احساس ہو جائے اور وہ اس کے خاتمے کے لیے سوچیں۔ اسی شعور اور احساس نے غلاموں کی آزادی کے فیصلے اور غلامی کو ممنوع قرار دینے کی راہ ہموار کی۔ چناں چہ سلطنتِ عثمانیہ نے غلامی کے خاتمے کے پروگرام کی خوش دلی سے تائید کی اور اس پر بہت اطمینان کا اظہار کیا کیوں کہ دِینِ اسلام حریت اور آزادی کا درس دیتا ہے۔

اگرچہ ۱۸۱۵ء میں ویانا کانفرنس نے غلاموں کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دے دیا تھا اور ۱۹۴۹ء کے جنیوا کنونشن نے بھی غلام بنانے کو ممنوع قرار دے دیا تھا مگر یورپ اور امریکہ کے اکثر ممالک ابھی تک سفید فام اور سیاہ فام میں امتیاز روا رکھے ہوئے ہیں۔ افریقہ اور فلسطین میں استعماری پالیسی کو اسی تفریق نے الجھا رکھا ہے۔ امریکہ میں سیاہ فاموں کے ساتھ اس قدر برا سلوک کیا جا تا ہے کہ انسانیت کا احترام ہی ختم ہو جاتا ہے۔ آخری عالمی جنگ میں فاتح ملکوں نے جرمن قیدیوں کو ابھی تک رہا نہیں کیا اور ان سے بلامعاوضہ سخت محنت لی جاتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں نازیوں نے لاکھوں لوگوں کو قتل کیا اور قتل کرنے سے قبل وہ انہیں سخت ترین اذیتیں دیتے رہے۔(۱)

چوں کہ قیدی کا قتل صرف استثنائی صورت رہی ہے جیسا کہ ہم اِسلامی تاریخ کے حوالے سے بیان کرچکے ہیں، اور عالمی سطح پر غلامی بھی ممنوع ہوچکی جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا، لہٰذا اب صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ قیدیوں کے معاملے میں قرآن کریم کے طے کردہ دائمی قانون کو اپنایا جائے اور وہ یہ ہے کہ یا تو قیدی کو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے اور یا فدیہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے۔ حضرات عبداللہ بن عمرؓ، سعید بن جُبیرؒ

۱۔ القانون الدولي، ڈاکٹر ابوہیف، ص ۴۷، العلاقات السیاسیة الدولیة، ڈاکٹر احمد العمري، ص ۴۹-۱۲۹، آثار الحرب، ص ۴۴۰ و ما بعد۔

حسن بصریؒ اور عطاءؒ کا کہنا ہے کہ قیدی کو دو میں سے ایک طریقے سے رہا کیا جائے: یا تو احسان کے طور پر، یا فدیہ لے کر۔ان دو طریقوں کے علاوہ ان کے لیے اور کوئی تیسرا طریقہ نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً﴾ [محمد: ۴](تب قیدیوں کو مضبوط باندھو، اس کے بعد تمہیں اختیار ہے احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرو)۔ اور قیدیوں کو قتل کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ عمل ہے۔(۱)

۲۔ دشمن کی اَملاک پر جنگ کا اثر

ہمارے فقہاء نے مالِ فَے اور غنیمت کی بحث میں جو تفصیلات بتائی ہیں وہ اس طرح ہیں کہ فَے اس مال کو کہا جاتا ہے جو لڑائی کے بغیر پرامن طریقے سے دشمن سے لیا جاتا ہے، جیسے جزیہ اور خراج وغیرہ (۲)۔ غنیمت ایسے مال کو کہا جاتا ہے جو جنگ میں دشمن کو زیر کرکے بزورِ بازو حاصل کیا جائے۔ جنگی مال غنیمت یا تو منقولہ املاک کی شکل میں ہوتا ہے جیسے سامان اور کتابیں وغیرہ، یا غیرمنقولہ املاک کی صورت میں ہوتا ہے جیسے زمین اور جائداد وغیرہ ۔ فی الجملہ یہ بات طے شدہ ہے کہ جو علاقہ فتح کیا جائے اس میں موجود منقولہ اور غیرمنقولہ تمام املاک کی ملکیت فاتح لوگوں کو منتقل ہو جاتی ہے۔(۳)

الف: منقولہ اَملاک

اسلام میں غنیمت سے حاصل شدہ منقولہ اَملاک کو پانچ حصوں میں بانٹ دیا جاتا تھا جن میں سے ایک حصہ بیت المال کا ہوتا تھا جسے درجِ ذیل آیتِ کریمہ کے مطابق پانچ طرح کے لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا:

۱۔ بداية المجتهد ۱:۳۰۴، المغني ۸:۳۷۲ وما بعد

۲۔ بعض فقہاء نے بغیر جنگ ہاتھ لگنے والے تمام اموال و اَملاک: جزیہ، خراج اور مالِ غنیمت وغیرہ کو فَے میں شمار کیا ہے۔تفسیرِ قرطبی، الأنفال:۴۱، ۷:۱؛ لسان العرب(فیأ)۔ از اِکرام الحق یٰسین

۳۔ أموال الحربيين، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی۔ مقال في الموسوعة الفقهية الكويتية.

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ [الأنفال: ۴۱]

اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

بقیہ چار حصے جہاد میں حصہ لینے والوں میں بانٹ دیئے جاتے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے وضاحت فرمائی: إنما الغنيمة لمن شهد الوَقعة (مالِ غنیمت ان لوگوں کا حق ہے جنہوں نے جہاد میں حصہ لیا)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین کے دور میں اور بعد میں بنوامیہ اور بنوعباس کے ادوار میں بھی مالِ غنیمت کو مجاہدین میں بانٹا جاتا رہا کیوں کہ بلااختلاف یہ صرف مجاہدین کا حق ہے اور جمہور فقہاء کے نزدیک مسلمان حکمران کو اس بارے میں کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔(۱)

لیکن آج کل چونکہ باقاعدہ افواج کا نظام قائم ہے اور سرکاری خزانے سے انہیں تنخواہیں دی جا رہی ہیں لہذا سیاسہ شرعیہ کے اصول اور قومی مفادات کے انتظام والنصرام کے لیے مصالحِ مرسلہ کے پیشِ نظر مالِ غنیمت پورے کا پورا ریاست کا حق قرار پاتا ہے۔ افواج کے سپاہیوں کو اس میں سے کچھ بھی نہیں دیا جاتا، سوائے اس کے کہ کسی خدمت کے صلے یا انعام کے طور پر کسی کو کچھ دے دیا جائے۔ کیوں کہ قومی مفادات کے انتظام و انصرام کے اسالیب وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ طریقہ امام مالکؒ کی رائے کے مطابق ہے کہ ان کے نزدیک مالِ غنیمت کی تقسیم حاکمِ وقت کا صوابدیدی اختیار ہے۔ شیخ فزاری کی بھی یہی رائے ہے جو کہ شافعیہؒ کے بڑے

۱۔ الأحكام السلطانية، الماوردي، ص ۱۴۱،الأحكام السلطانية، ابو یعلیٰ، ص ۱۲۰، البدائع ۷:۱۱۸،الدردير والدسوقي۲:۱۷۴-۱۷۷، مغني المحتاج۳:۱۰۲،زادالمعاد ۳:۲۱۷

علماء میں سے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ: ''حاکم منقولہ اور غیر منقولہ اموال و اَملاکِ غنیمت کو تقسیم کرنے یا اس کے پانچ حصے بنانے کا پابند نہیں ہے، بلکہ اگر وہ کسی سپاہی کو کچھ بھی نہ دے تو وہ حق بجانب ہوگا''۔(۱) بنابریں آیتِ کریمہ ﴿وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَیْءٍ﴾ کا مفہوم یہ نہیں کہ مالِ غنیمت کو تقسیم کرنا فرض ہے، بلکہ اس میں پانچویں حصے کو متعینہ مصارف میں خرچ کرنے کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

دیگر اقوام کے عرف کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقہاء بھی دشمن کے ذاتی اموال اور قومی اَملاک میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ اس کے بارے میں عام تصور یہی تھا کہ جنگ دو ریاستوں کے شہریوں کے درمیان مقابلے کا نام ہے۔اور اسی تصور کے تحت اٹھارویں صدی عیسوی تک یہی نظریہ رائج تھا کہ جس علاقے پر حملہ کیا جائے، وہ اور اس کے تمام اموالِ منقولہ و اَملاکِ غیر منقولہ مالِ مباح ہیں اور حملہ آور بن کر آنے والی افواج کو اسے مالِ غنیمت کے طور پر لے لینے کا حق حاصل ہے۔

بعد میں باقاعدہ افواج تشکیل پاجانے کی بنا پر یہ اصول بدل دیا گیا۔ اِس تبدیلی میں اِس خیال کا بھی خاصا دخل رہا کہ جہاں تک ممکن ہو جنگی اخراجات کا بوجھ افراد پر نہیں بلکہ حکومتوں پر ڈالا جائے۔ اب فاتح افواج کے افراد کو دشمن کی سرزمین پر موجود املاک لے لینے کی اجازت باقی نہیں رہی، سوائے اس کے کسی خاص وجہ سے کسی کو کچھ مل جائے۔ چناں چہ یہ ضابطہ بن گیا کہ مفتوحہ حکومت کی منقولہ املاک میں سے جو چیز فوجی مقاصد کے لیے مناسب ہو اسے لے لیا جائے گا، اور باقی جنگ کا مالِ غنیمت یعنی دشمن فوج کے پاس یا میدانِ جنگ میں جس قدر اسلحہ، گھوڑے اور دیگر سامان جنگ ہو وہ فاتح ریاست کے لیے مالِ غنیمت ہوگا۔البتہ مفتوح ملک کے افراد کے پاس موجود منقولہ اور غیر منقولہ املاک کا چھین لینا یا حملہ آور ملک کے مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔(۲)

۱۔ مخطوط الرخصة العميمة فی حكم الغنيمة ، الفزاري، ورقہ، ۲۴۳ ب۔

۲۔ قانون الحرب والحياد ، ڈاکٹر جنينة، ص ۲۸۳، ۲۸۵-۲۹۱

اسلام کی رو سے دشمن ملک کی سرکاری املاک اوروہاں کے لوگوں کی ذاتی املاک میں مذکورہ بالا فرق کوملحوظ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس لیے کہ لوگوں کی ذاتی املاک کو بطور غنیمت لینے کا سبب اب موجود نہیں کیوں کہ یہ لوگ لڑنے والے نہیں ہوتے۔ نیز اس لیے کہ جنگوں میں ہر زمانے کا رواج معتبر ہوتا ہے اور معاملہ بالمثل کے اصول کے مطابق جو کچھ مد مقابل کرے اس کے ساتھ وہی کچھ کیا جاتا ہے۔

لیکن ان اصولوں کا اس واقع کے ساتھ کیا واسطہ جو کچھ یہودیوں نے فلسطین میں کیا۔ انہوں نے فلسطینیوں کی ذاتی املاک چھین لیں، انہیں اپنے گھروں سے بے دخل کر کے باہر نکال دیا اور ان کی زمینوں بلکہ ہر چیز پر ہی قبضہ کر لیا۔ تو جس طرح دشمن ہمارے ساتھ کر رہا ہے ہمیں بھی چاہیے کہ اس کے ساتھ اسی طرح کریں۔

ب: دشمن کی جائیدادیں

جب مسلمان دشمن کے علاقہ پر قبضہ کر لیں اور اس کی دیگر اَملاک: زمین، جائداد، عمارات، باغات اور کھیت وغیرہ بھی ان کے قبضہ میں آ جائیں تو یہ ساری چیزیں مالِ غنیمت بن جاتی ہیں۔ ایسی مقبوضہ زمینیں تین طرح کی ہوتی ہیں:

۱۔ ایسی زمین جو بزورِ قوت قبضے میں لی گئیں۔

۲۔ ایسی زمین جسے دشمن نے خود خالی کر دیا اور اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

۳۔ ایسی زمین جس کا انتظام معاہدے کے تحت مسلمانوں کو مل گیا۔(۱)

اوّل: طاقت سے فتح کی ہوئی زمین

بین الاقوامی قانون کی رو سے اگر کوئی علاقہ فتح ہوجائے تو اس کی جائیدادوں کی ملکیت فاتح ریاست کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ ماضی میں فتح کو ریاستی خصوصیات

۱۔ الأحكام السلطانية، الماوردي، ص ۱۳۲ وما بعد، ابو يعلیٰ، ص ۱۳۰ وما بعد

کے حصول کا ذریعہ تسلیم کیاجاتارہا ہے۔ لیکن ۱۹۱۹ء سے جس قدر بین الاقوامی معاہدات ہوئے ہیں ان کے مطابق فتح کو ریاستی حیثیت کے حصول کا جائز ذریعہ تسلیم نہیں کیاجاتا۔ باقی جہاں کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر فتح کے بغیر ہی قبضہ کرلے تو اس صورت میں بین الاقوامی قانون افراد کی ذاتی املاک اور مقبوضہ ملک کی سرکاری املاک میں فرق کرتا ہے۔ اس کے مطابق قابض ملک کو افراد کی اَملاک پر قبضہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے، جب کہ مقبوضہ ملک کی سرکاری اَملاک کے صرف استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔(۱)

اسلامی شریعت کی رُو سے اگر کوئی علاقہ فتح ہوتا ہے تو فتح کے ساتھ ہی وہاں کے باشندوں کی ملکیت ختم ہوجاتی ہے اور قبضہ مکمل ہونے کے ساتھ ہی وہاں کی جائدادوں کی ملکیت فقہاء کی ایک جماعت کے نزدیک فاتحین کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حامیوں میں مالکیہؒ، حنابلہؒ، امامیہ اور زیدیہ شامل ہیں۔ جب کہ شافعیہؒ کے نزدیک ان کی ملکیت قبضہ ہو جانے کے بعد تقسیم ہو جانے یا ملکیت اختیار کرلینے سے فاتح ملک کی طرح منتقل ہوتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ ملکیت فاتح ملک کی طرف اس وقت منتقل ہوتی ہے جب ان جائدادوں کو باقاعدہ دارالاسلام میں شامل کردیا جائے۔(۲)

بزورِ طاقت فتح کیے ہوئے علاقے کی غیرآباد زمینوں کے بارے میں اسی رائے پر عمل چلا آرہا ہے جس کا اظہار حضرت عمرؓ نے کیا تھا اور دوسرے صحابہؓ نے ان

۱۔ قانون الحرب، ڈاکٹر جنینة،ص ۱۸۶، القانون الدولي، ابوہیف،ص ۳۱۸، القانون الدولی، حافظ غانم،ص ۳۳۳، ۶۰۶

۲۔ ان تینوں آراء کے لیے ملاحظہ ہو۔ القواعد، ابن رجب،ص ۱۸۹، ۴۱۱ وما بعد، المغني ۸: ۴۲۲، تأسيس النظر، الدبوسی،ص ۵۷، الخرشي ۳: ۱۲۸، طبع دوم، مغني المحتاج ۴: ۲۳۴، المهذب ۲: ۲۴۱، البحر الزخار ۲: ۲۱۵، مفتاح الكرامة ۷: ۷

سے اتفاق کیا تھا، اگر چہ اس بارے میں بھی فقہاء سے چار آراء منقول ہیں:(۱)

چناں چہ جب اسلامی فتوحات بہت پھیل گئیں اور شام، مصر، سواد عراق اور خراسان کے علاقے فتح ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے مناسب سمجھا کہ اس زمین کو اس کے مالکان کے پاس ہی رہنے دیا جائے اور اس کے عوض ان پر دو طرح کے ٹیکس عائد کیے جائیں۔ افراد پر تو ذمّی ہونے کے ناطے جزیہ عائد کیا جائے اور زمین پر خراج عائد کیا جائے، کیوں کہ اس کی حیثیت خراجی تھی، عشری نہیں تھی۔(۲) مطلب یہ کہ اِس کو مسلمانوں کی قومی ملکیت اوروقف قرار دے دیا گیا۔یوں زمین کی ملکیت تو اِسلامی حکومت کے پاس رہی اور اس کے منافع (پیداوار وغیرہ) کے مالک اس میں کام کرنے والے بن گئے۔

اس رائے کی بنیاد پر ﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ﴾ کا تعلق صرف منقولہ اموال کے ساتھ رہ جاتا ہے۔ چنانچہ منقولہ اموال کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا اور سورہ الحشر کی آیات ۶-۱۰ ﴿وَمَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾ کا تعلق صرف زمین کے ساتھ رہ جاتا ہے۔

۱۔ آثار الحرب، ص ۵۵۷، نظام الإسلام، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، ص ۳۸۸، ان آراء کا خلاصہ یہ ہے:
(۱) مفتوحہ زمین کو منقولہ غنائم کی طرح تقسیم کیا جائے۔ ﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ﴾ کے مطابق پانچواں حصہ نامزد لوگوں میں تقسیم کیا جائے اور بقیہ چار حصے مجاہدین میں بانٹ دیئے جائیں۔ یہ رائے شافعیہؒ اور ظاہریہؒ کی ہے۔
(۲) زمین قبضے آتے ہی تمام مسلمانوں کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔ حاکم کی طرف سے اسے وقف بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ رائے امامیہ اور مشہور مذہب کے مطابق مالکیہؒ کی ہے۔
(۳) مسلمانوں کا حاکم جو مناسب سمجھے فیصلہ کرے۔ وہ چاہے تو اسے تقسیم کر دے، اور چاہے تو وقف کر کے ان پر مستقل خراج عائد کر دے۔ یہ رائے حنابلہؒ کی ظاہرِ روایت کے مطابق ہے۔
(۴) مسلمان حاکم کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو اسے تقسیم کر دے اور چاہے تو زمین پر خراج اور افراد پر جزیہ عائد کر کے اسے پرانے مالکان کے پاس ہی رہنے دے۔ یہ رائے احنافؒ اور زیدیہ کی ہے۔

۲۔ کتاب الخراج، ابویوسف، ص ۲۴، ۲۷ وما بعد، ۳۵، ۶۸ وما بعد۔ کتاب الأموال، ابو عبید، ص ۵۷ وما بعد، فتوح البلدان، ص ۲۷۵، شرح السیر الکبیر ۳:۲۵۴

حضرت عمرؓ کی رائے سے تمام صحابہؓ نے جو اتفاق کیا، اس میں حکمت یہ تھی کہ مجاہدین کی زراعت میں مشغولیت کی وجہ سے جہادی عمل میں فرق نہ آجائے۔ اور دوسری بات یہ کہ امیر المؤمنینؓ اِس تدبیر سے بیت المال کے لیے آمدن کا ایک مستقل ذریعہ قائم کرلیں گے جس سے رفاہِ عامہ کے کاموں: راستے اور پل وغیرہ بنانے، نیز فوجیوں کی تنخواہوں، اسلحہ اور جنگی ساز و سامان وغیرہ کے اخراجات اِس سے نکل آئیں گے۔ حضرت عمرؓ نے سورۂ حشر کی آیات پڑھنے کے بعد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس مالِ فَے میں تمہارے ساتھ ان کو بھی حصہ دار بنا دیا ہے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ اگر اس وقت یہ زمین تم میں تقسیم کر دی جائے تو ان کے لیے کچھ نہیں بچے گا اور اگر میں زندہ رہا تو چرواہے کو بھی اس مالِ فَے میں سے اپنا حصہ مل کر رہے گا جبکہ اس کا خون اس کے چہرے ہی میں ہوگا۔(۱)

دوم: ڈر کر بھاگ جانے والے دشمن کی اراضی

عرفِ عام میں ایسی اراضی کو ہی فَے کہا جاتا ہے، یعنی ایسا مال جو برسرِپیکار کافروں سے جنگ کیے بغیر مل جائے۔ اس میں نہ گھوڑے دوڑانے پڑیں، نہ اونٹ۔ جزیہ اور تجارتی عشر وغیرہ اس مال میں شامل ہیں۔(۲)

بین الاقوامی قانون نے ایسی زمین کو بزورِ طاقت فتح کی گئی زمین کے حکم میں شامل کیا ہے۔ اسلام کی رو سے بھی ایسی زمین قبضے میں آتے ہی اس کی ملکیت بیت المال کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور یہ ریاست کی ملکیت شمار ہونے لگتی ہے۔ ہمارے فقہاء کے الفاظ میں یہ زمین قبضے میں آتے ہی تمام مسلمانوں کے لیے وقف بن جاتی ہے اور جو مسلمان یا معاہد (غیر مسلم) اس پر کاشت کاری کرے، حاکم وقت اس

۱۔ کتاب الخراج، ابو یوسف، ص ۲۴

۲۔ أحکام أهل الذمة، ابن قیم، ص ۱۰۶، بدایة المجتهد ۱:۳۸۹، المهذب ۲:۲۴۷، نهایة المحتاج ۵:۱۰۵

پر خراج مقرر کردیتا ہے۔ یہ وقف اس لیے بن جاتی ہے کہ اس کا شمار مالِ غنیمت میں نہیں ہوتا بلکہ یہ فَے کے حکم میں ہوتی ہے، اسی وجہ سے مسلمانوں کا مشترکہ حق قرار پاتی ہے۔(۱)

فَے کا جو مال منقولہ ہو، جمہور علماء کے نزدیک وہ بھی وقف ہوگا اور عام مسلمانوں کے رفاہی کاموں میں خرچ کیا جائے گا، یعنی وقت کا حاکم جیسا مناسب سمجھے گا اسی طرح خرچ کرے گا۔

فقہاءِ شافعیہؒ کا کہنا ہے کہ منقولہ اموال، غنیمت کی طرح پانچ حصوں میں تقسیم ہوں گے کیوں کہ فَے والی آیت کریمہ ﴿وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ……﴾ مطلق ہے، جب کہ غنیمت والی آیت﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ﴾ مقید ہے۔ اورچوں کہ ان دونوں کا حکم ایک ہی ہے ، اور وہ یہ کہ مال دشمن کی ملکیت سے نکل کر مسلمانوں کی ملکیت میں آرہا ہے، اگرچہ ان دونوں صورتوں کے اسباب مختلف ہیں: ایک لڑائی کے نتیجے میں آرہاہے اور دوسرا لڑائی کے بغیر۔ لہذا شافعیہؒ اور ان کے ہم خیال فقہاء کے نزدیک حکم ایک ہونے کی وجہ سے اس مطلق کو مقید پر ہی محمول کیاجائے گا ۔(۲)

تاہم جمہور کی رائے زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ امام مالکؒ نے حضرت عمرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آپؓ نے فرمایا: '' بنو نضیر کے اموال ان اموال فَے میں شامل تھے جن کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں نے اونٹ اور گھوڑے نہیں دوڑائے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہوا کرتے تھے، جن میں سے حضورِ اکرم صلی

۱۔ فتح القدیر ۴:۳۵۳، کتاب الخراج، ص ۲۳، الدردیر والدسوقي ۲:۱۷۵، القوانین الفقهية، ص ٦٢ ،الأحکام السلطانية، الماوردي، ص ۱۳۳،الأحکام السلطانية، ابویعلیٰ، ص ۱۳۲، مغني المحتاج ۳:۹۹، کشاف القناع ۳:۷۵

۲۔ مغني المحتاج ۳: ۹۳، زادالمعاد ۳:۲۲۰،القوانین الفقهية، ص ۱۴۸

علیہ وسلم اپنے اہل خانہ کی سال بھر کی ضروریات پوری کرتے اور جو بچ جاتا اس کو جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کے لیے اسلحہ اور گھوڑوں وغیرہ پر خرچ کرتے تھے ۔ (۱) چناں حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا کہ ''یہ اموال صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص تھے'' جمہور کی اس رائے کی تائید کرتا ہے کہ فئے کو پانچ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔

سوم: معاہدے کے ذریعے فتح کی گئی اراضی

اس کا حکم معاہدۂ صلح کی روشنی میں متعین ہوتا ہے۔ اسی میں اس کا تذکرہ ہوتا ہے کہ زمین مسلمانوں کی ہوگی یا سابقہ مالکان کی ہوگی جیسا کہ یمن اور حیرہ کی زمین کے بارے میں طے پایا۔ پہلی صورت میں زمین مسلمانوں کے لیے وقف بن جائے گی جس طرح لڑائی سے ہاتھ آنے والی زمین بنتی ہے اور وہ دارالاسلام کا حصہ بھی بن جائے گی جس طرح علاقہ خالی کرکے چلے جانے والوں کی زمین بنتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو فتح کیا اور خیبر والوں سے یہ معاہدہ کیا کہ یہاں کی زمین کو آباد کرتے رہو اور اس کی نصف پیداوار تمہیں ملتی رہے گی۔ یوں وہ زمین ان کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی ہوگئی تھی۔ بنو نضیر کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ مدینہ سے چلے جاؤ تو اونٹوں پر جتنی چیزیں اور مال لے کر جا سکو لے جاؤ، سوائے اسلحہ کے۔ چناں چہ وہ مالِ فئے قرار پایا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا۔

ایسی زمینوں پر خراج عائد کیا جاتا ہے، جو کہ اس پر ہمیشہ عائد رہتا ہے۔ چناں چہ اگر کوئی مسلمان بھی ایسی خراجی زمین خرید لے تو اس زمین کا خراج دینے کا پابند رہے گا۔ کیوں کہ یہ خراج اس زمین سے فائدہ اٹھانے کا معاوضہ سمجھا جاتا ہے۔ اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔(۲)

۱۔ شرح مسلم، نووي ۱۲: ۷۰

۲۔ المدونة ۳: ۲۶، المنتقیٰ شرح الموطا ۳: ۲۱۹، الخرشي ۳: ۱۴۹، کشاف القناع ۳: ۷۵، المحرر في الفقه الحنبلي ۲: ۱۷۹، أحکام اهل الذمه، ابن القیم، ص ۱۰۶

دوسری صورت میں زمین تو معاہدے کے مطابق سابق مالکان کی ملکیت میں رہے گی۔ اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ جب تک وہ لوگ معاہدے کے پابند رہیں گے اس وقت تک مسلمان بھی اس کی شرائط پر پورا اترنے کی پابندی کریں گے۔ البتہ زمین پر خراج عائد کیا جائے گا جو کہ بیت المال میں جمع ہوگا(۱)۔ اور یہ خراج ان کی طرف سے جزیہ سمجھا جائے گا۔ لہذا وہ لوگ جب بھی اسلام قبول کریں گے، جمہور فقہاء اور امامیہ کے نزدیک یہ خراج ان سے ساقط ہو جائے گا۔(۲)اس کی دلیل یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عمال کو لکھ بھیجا تھا کہ: جس زمین کے مالکان اسلام قبول کر لیں ان پر کوئی خراج عائد نہیں ہوگا۔

لیکن احنافؒ اور زیدیہ کے نزدیک اسلام قبول کرنے سے خراج ساقط نہ ہو گا کیوں کہ اس میں ٹیکس کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور سزا کا بھی جو کفر کے بدلے میں انہیں دی جاتی ہے۔ لہذا پہلے سے لگا ہوا یہ ٹیکس مسلمان ہونے کے بعد بھی بدستور لاگو رہے گا، البتہ اگر کوئی پہلے سے مسلمان ہو تو اس پر خراج عائد نہیں کیا جائے گا۔(۳)

ایسے لوگوں کا علاقہ شافعیہؒ اور بعض حنابلہؒ کے نزدیک **دارالعھد** یا **دار الصلح** یعنی معاہدے والا علاقہ سمجھا جائے گا۔(۴) جب کہ باقی فقہاء کے نزدیک صلح کے ساتھ لیا جانے والا علاقہ دار الاسلام قرار پاتا ہے اور اِس کے باشندے ذمی بن جاتے ہیں جن سے جزیہ وصول کیا جاتا ہے۔

۱۔ كتاب الخراج، ص ۶۳ ۔ تبيين الحقائق۳:۲۷۴،الدر المختار۲:۵۳، الدردير والدسوقي، ۲:۱۷۵،القوانين الفقهية، ص ۱۴۸، كتاب الأم۴:۱۰۳، ۱۹۳،أحكام أهل الذمة، ص ۱۰۵

۲۔ المحرر فى الفقه الحنبلي ۲:۱۷۹، المختصر النافع في فقه الإمامية، ص ۱۱۴

۳۔ التلويح على التوضيح في أصول الحنفية ۲:۱۵۲

۴۔ الأحكام السلطانية، الماوردي، ص ۱۳۳، الأحكام السلطانية، ابو يعلىٰ، ص ۱۳۳، كشاف القناع ۳:۷۵

موجودہ بین الاقوامی تعلقات میں بھی جائز ہے کہ دو ریاستوں کے درمیان کوئی ایسا معاہدہ طے پا جائے جس میں ہر ایک کے حقوق اور فرائض متعین کیے گئے ہوں اور باہمی تعلقات کی حدود متعین ہوں اور ایک ریاست اپنے کسی حق سے دست بردار ہو جائے۔ (۱) البتہ اسلامی قانون اور بین الاقوامی قانون میں یہ فرق یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں معاہدہ کرنے کا مقصد نہ معاشی فوائد کا حاصل کرنا ہوتا ہے اور نہ استعمار کو وسعت دینا، بلکہ اِسلام میں معاہدے کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ علاقے کے لوگوں کو آزادانہ طور پر اسلام کو دیکھنے اور اِس میں غور کرنے کا موقع ملے۔

یہ بھی یاد رہے کہ خراج یا جزیہ عائد کرنا اسلام کی ایجاد نہیں ہے۔ یہ تاریخ کے پہلے زمانوں میں رہا اور بعد میں بھی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سمندری راستے سے تجارت کرنے والے یورپی ممالک، غیر مہذب افریقی ممالک کو اسی طرح کا خراج دیا کرتی تھیں تاکہ وہ سمندری ڈاکوؤں سے ان کی حفاظت کریں۔

بین الاقوامی قانون کے ماہرین سمجھتے ہیں کہ صرف جزیہ دینے کی پابندی سے کسی ملک کی خود مختاری میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اگرچہ اس سے اس کی عزتِ نفس میں کچھ کمی ضرور آجاتی ہے۔(۲)

۱۔ القانون الدولي، حافظ غانم، ص ۲۱۶، قانون الحرب والحياد، سامي جنينة، ص ۴۴۶۔
القانون الدولي العام، جنينة، ص ۱۳۲

۲۔ القانون الدولي العام، ڈاکٹر سامی جنینہ، ص ۱۳۲

دوسرا باب

حالت اَمن میں بین الاقوامی تعلقات

یہ باب چار ابحاث پر مشتمل ہے۔

پہلی بحث

اسلام کے خارجہ تعلقات کی بنیاد امن ہے، جنگ نہیں

جمہور فقہاء مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے اسی تصور سے متاثر نظر آتے ہیں جو فقہی اجتہاد کے زمانے یعنی دوسری صدی ہجری میں ایک حقیقت ہوا کرتا تھا۔ چناں چہ فقہاء کے ہاں اِن تعلقات کا تذکرہ اِسلامی فتوحات اور کامرانیوں کے تخیل سے سرشار نظر آتا ہے جس کی تشکیل اِسلامی عظمت وشوکت، پوری دنیا میں فریضۂ دعوتِ اسلام سے سرفراز ہونے کے جذبے اور اسلام کی عالمگیریت کے اصولوں پر ہوئی۔ انہی تصورات میں انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ:

غیر مسلموں کے ساتھ بیرونی تعلقات کی بنیاد امن نہیں بلکہ جنگ ہے، سوائے صلح کی صورت حال کے جو ایمان لانے یا امان دینے کے نتیجے میں پیدا ہو جاتی ہے(۱)۔

اور یہ کہ جہاد ایک دائمی فریضہ ہے جس کو امان اور جنگ بندی کے معاہدے کی بناء پر چھوڑا نہیں جا سکتا، سوائے اس کے کہ تیاری کی خاطر کچھ توقف کرلیا جائے، جیسے مسلمانوں کی کمزوری اور دشمن کی قوت کی حالت میں۔ نیز یہ کہ اسلام کی طرف دعوت کے دو طریقے ہیں: زبان سے دعوت اور شمشیر سے دعوت۔ جس شخص کو زبانی دعوت پہنچے اور وہ اسلام کو قبول نہ کرے تو اسے اسلحہ سے دعوت دینا ضروری ہوجاتا ہے۔

نیز یہ کہ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہے: ایک دارالاسلام اور دوسرا دارالحرب۔(۲)

۱۔ کتاب الأم ۴:۱۱۰، آثار الحروب، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، ص ۱۳۰ وما بعد

۲۔ السیاسة الشرعية، عبدالوہاب خلاف، ص ٦٦ وما بعد، العلاقات الدولية في الإسلام، محمد ابوزہرہ، ص ۴۷، أحكام القانون الدولي في الشريعي، ڈاکٹر حامد سلطان، ص ۱۱، وما بعد

دارالاسلام دنیا کا وہ حصہ ہے جہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور وہاں کے باشندگان مسلمانوں کی امان کی وجہ سے مامون ہوں، چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، جب کہ دارالحرب دنیا کا وہ حصہ ہے جہاں اسلامی قوانین نافذ نہ ہوں اور لوگ مسلمانوں کی امان میں نہ رہ رہے ہوں۔ ان فقہاء کا یہ دعویٰ ہے کہ آیت کریمہ: ﴿وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَافَّةً﴾ (اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں) اور ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ﴾(۱)(پس جب حرمت کے مہینے نکل جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ، انہیں پکڑو اور گھیرو) نے قرآن کریم کی ان ایک سو چوبیں آیات کو منسوخ کر دیا ہے جن میں کافروں سے درگزر کرنے کی تلقین کی گئی تھی کیوں کہ کافروں سے لڑنا اس وقت ممنوع تھا۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اُس حکم کو منسوخ کر دیا۔(۲)

حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی بنیاد ہی امن ہے۔ جنگ تو ایک عارضی حالت ہے جو انسانوں پر طاری ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں کے ہاں جنگ کی حالت طاری ہونے کا سبب یا تو شر اور ظلم ہوتا ہے جس کا خاتمہ مقصود ہوتا ہے یا تبلیغِ دین کے تحفظ کے لیے اس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔(۳) غلبہ پانے کی خواہش یا مذہبی اختلاف ان کے ہاں جنگ کی بنیاد نہیں ہوا کرتے، جیسا کہ فقہاءِ کرام نے سمجھ لیا۔ اسلام کی طرف دعوت پہلے تو دلیل اور حجت کے ساتھ ہی دی

۱۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ تین آیات جن سے کافروں سے درگزر کرنا منسوخ کر دیا گیا: سورۂ توبہ کی آیات نمبر ۵، ۲۹ اور ۳۶ ہیں۔

۲۔ الناسخ والمنسوخ فی القرآن الکریم، ابوجعفر النحاس، ص ۱۶۸، زادالمعاد ۲:۸۱، الناسخ والمنسوخ، ابن خزیمہ، ص ۲۶۴، تفسیر الطبری ۱:۱۰۸، تفسیر القرطبی ۸:۴۳، تفسیر ابن کثیر ۴:۱۱۷، آثار الحرب، ڈاکٹر وہبہ زحیلی، ص ۱۱۲

۳۔ اختلاف الفقہاء، طبری، تحقیق ڈاکٹر شخت، ص ۱۹۵

جاتی ہے، تلوار اور نیزے سے نہیں۔(۱)اس لیے کہ اسلام کا جھکاؤ ہمیشہ امن کی طرف ہوتا ہے، جنگ کی طرف نہیں۔ بین الاقوامی قانون کے ماہرین بھی یہی کہتے ہیں کہ قوموں کے درمیان فطری صورت حال امن کی صورت حال ہے، جنگ تو ایک وقتی اور عارضی حالت ہوتی ہے، چاہے اس کی وجہ کوئی بھی ہو۔(۲)

اسی رائے کی طرف امام ثوریؒ اور اوزاعیؒ کا بھی میلان ہے اور درج ذیل دلائل کی بناء پر قانون کی عمومی روح کا مفہوم بھی یہی بنتا ہے۔

قرآنی آیات

قرآن کریم میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی بنیاد امن پر قائم ہے، سوائے اس کے کہ کہیں جارحیت کا سامنا کرنا ہو تو جان کے دفاع اور زندگی کی بقاء کی خاطر جنگ لڑنی پڑجاتی ہے یا کسی متوقع حملے سے بچنے کے لیے پہل کرنی پڑتی ہے،تو یہ بھی دفاع ہی کی ایک قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّهِ﴾ [الأنفال:٦١](اور اے نبی! اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو)۔ اسی طرح ارشاد ہے:﴿حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا﴾ [محمد: ۴](تا آں کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے)۔

عالمی امن کا اصول قرآن کریم نے یوں بیان کیا ہے:﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ ادْخُلُواْ فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلاَ تَتَّبِعُواْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾ [البقرة: ۲۰۸](اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے)اورفرمایا:﴿وَلاَ تَقُولُواْ لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلاَمَ لَسْتَ مُؤْمِناً تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِندَ اللّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ﴾ [النساء: ۹۴]

۱۔ السیاسة الشرعیة، خلّاف، ص ۸۳

۲۔ اوپنہایم، لوٹر باخت ۲: ۲۶۷، ۵۲۶

(اور جو تمہاری طرف سلام سے تقدیم کرے اسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے، تم جیتی دنیا کا اسباب چاہتے ہو تو اللہ کے پاس بہتیری غنیمتیں ہیں)۔ قرآن کریم نے آیتِ کریمہ ﴿فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا﴾ [النساء: ۹۰] (لہذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے) میں واضح طور پر یہ بتا دیا ہے کہ مسلمان امن و سلامتی، محبت اور سکون کے ساتھ وابستہ رہیں۔ یہی بات اس آیت میں بھی بتا دی گئی ہے: ﴿لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ [الممتحنة: ۸] (اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔(۱)

جن آیات میں جہاد کی دعوت دی گئی ہے ان سب کو کوئی آیت چھوڑے بغیر ایک دوسری کے ساتھ ملا کر سمجھنا ضروری ہے۔ ان آیات کا مجموعی مفہوم یہ بتاتا ہے کہ جہاد اپنے اصلی سبب تک محدود ہے جس کی وجہ سے شریعت میں جہاد کا حکم آیا۔ وہ سبب درجِ ذیل دو باتوں میں سے ایک ہوسکتا ہے:

ا۔ظلم کا ازالہ: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾ [الحج: ۳۹] (اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے)

۱۔ ان آیات کے مفہوم کا اطلاق ان یہودیوں پر نہیں ہوتا جنہوں نے فلسطین کی سرزمین پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ انہیں اسلامی علاقوں میں بسانا جائز نہیں بلکہ ہو سکے تو، طاقت حاصل ہوتے ہی، یا تو انہیں نکال باہر کیا جائے یا اس شرط کے ساتھ اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے کہ وہ مسلمانوں کی حکمرانی اور ان کے حکم کے ماتحت رہنے پر راضی ہوں گے۔ امن سے ان کافروں کے ساتھ رہنے کا حکم ہے جو اسلامی علاقے سے باہر رہ رہے ہوں۔

۲۔فساد کی جڑ کاٹنا: فساد مٹانے اور اسلام کی تبلیغ کو تحفظ دینے کے لیے جنگ کرنے کا ذکر اِس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَإِنِ انتَهَوا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِيْنَ﴾ [البقرة: ۱۹۳](تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا کسی پر دست درازی روا نہیں)

جن آیات میں جنگ کرنے کا غیر مقید حکم دیا گیا ہے جیسے ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ [البقرة: ۱۹۱] (اور ان کو جہاں پاؤ قتل کر دو)، تو ان کا مطلب انہیں آیات کی روشنی میں سمجھا جائے گا جن میں ظلم کی وجہ سے جنگ کی اجازت دی گئی ہے، جیسے:﴿وَقَاتِلُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ [البقرة: ۱۹۰](اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو، کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ظالموں سے جنگ لڑنا اس لیے لازم کر دیا ہے کہ ان کے ظلم کا ازالہ ہو جائے اور ان کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹیں دور ہوجائیں، یہاں تک کہ تبلیغِ اِسلام اور لوگوں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ رہے اور دِین اللہ ہی کے لیے ہوجائے۔ یہ ایک طے شدہ فقہی اصول ہے کہ اگر سبب میں مماثلت ہوتو مطلق حکم کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے ، یعنی جس آیت میں زیادتی ہونے یا نہ ہونے کے تذکرے کے بغیر مطلق جہاد کا حکم ہے اسے اس آیت سے مقید سمجھا جائے گا جس میں یہ حکم ہے ہم اُس سے لڑیں جو ہم سے لڑتا ہے۔

رہیں وہ آیات جن میں کافروں کے ساتھ دوستی کرنے سے روکا گیا ہے تو ان کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے ساتھ امن سے نہ رہیں اور ان کے ساتھ بھلائی نہ کریں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ کافروں کو رازدار دوست نہ بناؤ کہ جن سے مدد حاصل کرنے لگو اور ان پر اعتماد کرنے لگو جس کے نتیجہ میں وہ مسلمانوں کے اندرونی رازوں سے واقف ہو جائیں۔

اس طرح امن و سلامتی کے ساتھ رہنے کا حکم دینے والی آیات منسوخ نہیں بلکہ طالب عمل قرار پائیں گی اور جنگ لڑنے کا حکم اس صورت کے متعلق ہوگا جس میں کافر امن کی طرف رجحان نہ رکھتے ہوں اور عفو و درگزر کرنے کا حکم دینے والی آیات پر اس وقت عمل کیا جائے گا جس وقت کافر مسلمانوں پر ظلم و زیادتی نہیں کریں گے جیسے کہ اسلامی پالیسی کا تقاضا ہے۔

احادیث نبویہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی اصل میں امن و سلامتی کی طرف دعوت دیتی ہیں، جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے: یَا أیھا الناس لا تتمنوا لقاء العدوّ وَسلُوا اللّٰہَ العافیة......(۱) (لوگو! دشمن سے لڑنے کی آرزو مت کرو اور اللہ سے امن و سلامتی کی دعا مانگا کرو)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کا دائرہ حق و انصاف اور اسلام کی طرف دعوت دینے تک محدود رکھتے ہوئے فرمایا تھا: من قاتل لتکون کلمة اللہ ھي العُلیَا فھوَ في سبیل اللہ (جو اس لیے جنگ لڑے کہ اللہ کا دین سربلند ہو جائے تو وہی اللہ کی راہ میں ہوگا)۔(۲)

جہاں تک دوسری احادیث کا تعلق ہے، جیسے:بعثت بین یدی الساعة بالسیف حتی یعبد اللّٰہ تعالیٰ وحدہ' لا شریك له، و جُعل رزقي تحت ظل رمحي و جعل الذل والصغار علی من خالف أمري۔(۳)(مجھے قیامت سے پہلے تلوار کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے یہاں تک کہ اللہ واحد لاشریک کی عبادت کی جائے، میرا رزق میرے نیزے کے سائے تلے کر دیا گیا ہے، اور جو میرے طریقے کی خلاف ورزی کرے اس کے لیے ذلت اور نامرادی مقدر کردی گئی ہے) تو ان سے مراد تبلیغِ اِسلام کے

۱۔ کنز العمال (بحوالہ احمد) ۴:۳۲۳

۲۔ احمد، بخاری، مسلم اور ابوداؤد وغیرہ دیگر محدثین بحوالہٗ ابوموسیٰ اشعریؓ

۳۔ احمد، ابویعلیٰ، طبرانی بحوالہٗ عبداللہ بن عمرؓ

دفاع کے لیے جہاد کی اہمیت بیان کرنا ہے۔ چناں چہ اگر کافروں کی طرف سے جارحیت نہ ہو مسلمانوں کو جہاد کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اسی طرح ارشادِ نبوی: امرت أن أقاتِل الناس حتّٰی یقولوا لا الٰه إلا اللّٰه...... (۱)(مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں، یہاں تک کہ وہ لا الٰه الا اللّٰه کہیں) سے مقصود تمام علماء کے نزدیک صرف مشرکینِ عرب ہیں۔(۲)

رہی یہ بات کہ دین کی طرف دعوت کے دو طریقے ہیں: ''ایک زبان اور دوسرا تلوار'' تو یہ مقولہ لوگوں کے عقائد اور نظامِ زندگی کی اصلاح کے لیے ہے، کیوں کہ دعوت کا جو اسلوب قرآن کریم نے بتایا ہے، یہ اس سے مناسبت نہیں رکھتا۔ قرآنی اُسلوب یہ ہے کہ دین کی دعوت کے لیے حجت اور دلائل سے کام لیا جائے، نیز معقول اور مناسب بات کے ذریعے لوگوں کو اسلام کے بارے میں مطمئن کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ادْعُ إِلِى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ [النحل: ۱۲۵](اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو)۔جبر و اکراہ اور زبردستی سے کام لینا تبلیغِ اسلام کے شرعی اسالیب میں سے نہیں۔ اس لیے کہ دین کی اساس ایمان بالقلب اور رضا و رغبت کے ساتھ عقیدہ اختیار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ [البقرة: ۲۵٦] (دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے صاف طور پر الگ ہو چکی ہے)۔

جہاں تک ارشادِ باری تعالیٰ﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ﴾ [الأنفال: ٦۰] (اور جہاں تک تم لوگوں کا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت ان کے مقابلے

۱۔ بخاری، مسلم بحوالۂ ابوہریرہؓ

۲۔ فتح الباري ۱:٦۴، القسطلاني، شرح البخاري ۱:۱۰٦، سنن نسائی ٦:۲

کے لیے مہیا رکھو) کا تعلق ہے تو اس سے مقصود حملے کی طمع کرنے والے دشمن کو مرعوب اور خوفزدہ رکھنا ہے۔ جیسا کہ امام رازیؒ نے بیان کیا ہے۔(۱)

اسلامی جنگیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال تک مکہ میں پرامن طور پر اللہ کے دین کی دعوت دی۔ مدینہ میں بھی آپؐ نے پر امن دعوت ہی کو جاری رکھا، اگر مشرکین کی طرف سے بغاوت نہ ہوتی تو امن و اَمان ہی جاری رہتا اور اسلام کبھی بھی تلوار نہ اُٹھاتا۔ اسلام اپنی اُس قوت، وضاحت، سادگی، معقولیت اور اِنسانی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کی بنا پر پھیلا جو اِس کے مزاج میں مجسم ہوکر رہ گئی ہے۔ فکر و عقیدے کے لحاظ سے اِسلام کا پھیلنا اور چیز ہے اور مسلمانوں اور اسلامی ریاست کا دفاع اور بات ہے۔ ان دونوں میں واضح فرق ہے۔ چناں چہ بین الاقوامی سطح پر اِسلام کی موجودگی کا تقاضا ہے کہ اِس کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے اور اِسے ہر قسم کی جارحیت سے بچایا جائے۔ مسلمانوں کے دشمنوں کے مقابلے میں اِسلامی جہاد کے اعلان کا پس منظر یہی تھا۔ باقی جہاں تک قبول اِسلام کا تعلق ہے تو اسے اِطمینانِ قلب اور اَمن پسندی کے داعیے سے قبول کیا جاتا رہا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر زبردستی کسی سے اِسلام قبول کروالیا جائے اور اِس کے بعد بھی اس کا اپنا دِل اِس دین سے مطمئن نہ ہو تو کون ہے جو اسے اس پر قائم رہنے کے لیے مجبور کرسکتا ہے، کیوں کہ عقیدہ تو دِل میں ہوتا ہے اور دِلوں کا حال اللہ علاّم الغیوب کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگیں جن میں آپکے ستائیس غزوات اور دیگر سرایا شامل ہیں ، وہ صرف اس لیے لڑی گئی تھیں کہ خطرات کو شدید ہونے سے پہلے ختم کیا جائے کیوں کہ مکہ کے کافر ظلم کرنے میں حد سے بڑھ گئے تھے۔

۱۔ التفسیر الکبیر ۴: ۳۷۷

حضرت علیؓ نے فرمایا: جس قوم سے اس کے گھر میں لڑا جائے وہ قوم رسوا ہو جاتی ہے۔ چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مشرکین سے تب جا کر جنگ کی جب انہوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو ہر طرح کی اذیت اور تکلیف پہنچائی اور کھلی دشمنی کا مظاہرہ کیا، مسلمانوں کو وطن چھوڑ دینے پر مجبور کیا، انہیں بھوک اور مار پیٹ کی سزائیں دیں، ان کے سینے پر پتھر رکھے اور طرح طرح کی اذیتیں دیں، یہاں تک کہ ان لوگوں نے حبشہ والوں سے مسلم مہاجرین حوالے کرنے کا یوں مطالبہ کیا جیسے آج کل مجرموں کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان لوگوں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اچانک حملہ کر کے شہید کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جیسا کہ اس پر تاریخ گواہ ہے۔(۱)

ہوازن والے بنو ثقیف اور دیگر قبائل کے ساتھ مل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ لڑنے کے لیے آئے تھے۔(۲) یہودیوں نے وہ معاہدہ توڑ دیا تھا جو انہوں نے ہجرت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا۔(۳) بنو قینقاع جو تھے، انہیں غزوۂ بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی بری لگی تو انہوں نے اپنے حسد اور کینے کا برملا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا اور عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس المنافقین کے حلیف بن گئے تھے۔ انہوں نے ایک انصاری خاتون کی بے پردگی کی تھی اور جب ایک مسلمان شخص نے اس عورت کو چھڑانا چاہا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا تھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں ان سے بات کی تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دھمکی دی اور کہا: **لا يَغرَّنكَ أنك لقيتَ قوماً لا عِلمَ لهم بالحرب، فأصبتَ منهم فرصة، إنا والله لئن حاربناكَ لتعلمُنَّ أنَّا نحنُ الناس** (کہیں اس دھوکے میں نہ رہنا کہ تمہارا ایسے لوگوں سے سامنا ہوا جنہیں

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ۱:۳۵۴ وما بعد، زادالمعاد ۲:۳۸ وما بعد، ۴۳، ۴۵، ۵۲
۲۔ زادالمعاد ۲:۱۸۵
۳۔ زادالمعاد ۲:۷۱ وما بعد

جنگ کرنا آتی نہیں تو تمہیں انہیں نقصان پہنچانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ ہم لوگ! اللہ کی قسم اگر ہم نے تم سے جنگ لڑی تو تم دیکھ لو گے کہ لوگ تو ہم ہی ہیں۔ اسی طرح معاہدہ توڑنے میں بھی انہوں نے پہل کی اور قلعہ بند ہو گئے۔ چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا زبردست محاصرہ کیا۔ ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا اور وہ اپنی جانوں، اپنی املاک، نیز عورتوں اور بچوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تسلیم کرنے کی شرط پر قلعوں سے باہر آئے، ایسے منافقین کے ایک سردار نے ان کی سفارش کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خاطر چھوڑ دیا اور ان سے کہا کہ مدینہ سے نکل جاؤ، چناں چہ وہ شام کے علاقے اَذرِعات (۱) کی طرف چلے گئے۔(۲)

بنو نضیر جو تھے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ جس دیوار کے ساتھ آپؐ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے، انہوں نے اس کے پیچھے سے آپؐ پر پتھر لڑھکانے کا پروگرام بنایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چند آدمیوں کے ساتھ ان کے ہاں اس لیے تشریف لے گئے تھے کہ بنو عامر کی شاخ بنو کلاب کے دو آدمیوں کی دیت جمع کرنے میں ان سے تعاون حاصل کریں جنہیں عمرو بن امیہ ضمریؓ نے قتل کیا تھا۔ بنو نضیر اور بنو عامر میں حلیفانہ معاہدہ موجود تھا۔ اس سازش کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ وہاں پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن سے لڑنے کی تیاری کرنے اور ان کی طرف پیش قدمی کا حکم فرمایا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ

۱۔ شام میں ایک علاقے کا نام ہے، اس کو بعض اوقات یذرعات بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ سرزمین بلقاء اور اردن کے دارالحکومت عمان کے قریب تھا۔ اس وقت یہ علاقہ موجودہ ملکِ شام میں اردن کی شمالی حدود کے قریب ہے۔ یہاں کی شراب مشہور ہوتی تھی، پھر اس کی طرف نسبت سے بہت سے اہلِ علم بھی اَذرعی مشہور ہوئے۔ مختار الصحاح، زین الدین رازی ۱: ۱۰۷، معجم البلدان ۱: ۱۳۰، المحکم لابن سیدہ ۱: ۳۳۸، مراصد الإطلاع ۱: ۴۷۔ از اکرام الحق یٰسین۔

۲۔ سیرۃ ابن ھشام ۲: ۴۷ وما بعد، زادالمعاد ۲: ۷۱

علیہ وسلم نے ان کی طرف پیش قدمی کی تو یہ لوگ قلعہ بند ہو گئے۔(۱) چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کے کھجوروں کے باغات کاٹ ڈالنے اور جلا دینے کا حکم دیا اور بعدازاں انہیں مدینہ سے جلاوطن کر دیا۔(۲)

یہودیوں میں سے بنو قریظہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن اور کٹر کافر تھے۔ جنگِ احزاب کے موقع پر غزوۂ خندق ۵ھ میں انہوں نے مشرکینِ مکہ کے ساتھ حلیفانہ معاہدہ کیا۔ پہلے غزوۂ بدر کے موقع پر انہوں نے مسلمانوں کے خلاف مشرکین کا ساتھ دیا تھا۔ ان کے سردار کعب بن اشرف نے مشرکین مکہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھڑکایا بھی تھا، یہاں تک کہ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللّهِ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ فَهُمْ لاَ يُؤْمِنُونَ. الَّذِيْنَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لاَ يَتَّقُونَ. فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ﴾ [الأنفال:۵۵-۵۷]

۱۔ صفر سن ۴ ہجری میں مقام رجیع پر دس قراء صحابہ کی کفار کے ہاتھوں دھوکے سے شہادت کے بعد اسی مہینے میں بنو عامر نے ستر قراء صحابہ کو بغرضِ تعلیم دعوت دے کر بیر معونہ کے مقام پر شہید کردیا۔ان میں سے صرف ایک صحابی عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ بچ پائے تھے۔عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو واپسی راستے پر بنو عامر کی شاخ بنو کلاب کے دو آدمی ملے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کے بدلے میں انہیں قتل کردیا۔ ان دونوں کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لکھا ہوا امان نامہ تھا، مگر عمرو رضی اللہ عنہ کو معلوم نہیں تھا۔ جب انہیں امان کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے ان کی دیت ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کے عرب کے رواج کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں اور ان کے حلیف یہودیوں سے دیت جمع کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ اسی سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے دیار میں گئے تو انہوں نے بظاہر بہت گرم جوشی سے استقبال کیا اور تعاون کا یقین دلایا۔ مگر آپس میں مشورہ کرکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش تیار کی جیساکہ اس کتاب میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ الرحيق المختوم، مأساة بئر معونة۱:۲۶۸۔ اکرام الحق یٰسین۔

۲۔ سيرة ابن هشام۲:۱۹۰ وما بعد، زادالمعاد ۲:۱۷ وما بعد

یقیناً اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والی مخلوق میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا پھر کسی طرح وہ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ لوگ جن کے ساتھ تو نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر بار پر اسے توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے۔ اور اگر تم انہیں کہیں لڑائی میں پاؤ تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے پس ماندوں کو بھگاؤ۔ عجب نہیں کہ انہیں اس سے عبرت ہو۔

چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا پچیس دنوں تک محاصرہ کیا، یہاں تک کہ یہ لوگ محاصرے سے تنگ آ گئے اور ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے رعب ڈال دیا۔ پھر انہوں نے اپنی مرضی سے سعد بن معاذؓ کی ثالثی کو قبول کیا اور انہی کے فیصلے پر قتل کر دیئے گئے۔(۱)

خیبر کے یہودی: یہی لوگ غزوۂ خندق کا سبب بنے تھے جو مسلمانوں پر بڑا سخت دھاوا تھا۔ لہذا ۷ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے لڑنے کے لیے نکل پڑے اور ان کے قلعہ جات کو فتح کرالیا۔ فتح کی رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا حضرت علیؓ کو دیا تھا۔ بعدازاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت وہ زمینی پیداوار، یعنی باغات کے پھلوں اور کھیتوں کی فصلوں کی نصف پیداوار، مسلمانوں کو دیا کریں گے اور یہ کہ اگر مسلمان چاہیں گے تو یہودیوں کو یہاں سے نکلنا پڑے گا۔(۲)

رومیوں اور ایرانیوں کے ساتھ جنگوں میں بھی صحابہؓ نے یہی رویہ اختیار کیا۔ ان پر حملہ آور ہونے میں بھی مسلمانوں نے کبھی پہل نہیں کی بلکہ ان ہی لوگوں نے جارحیت کی ابتدا کی تھی۔ ایرانیوں کے بادشاہ کسریٰ نے اپنے نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب کو پھاڑ ڈالا تھا اور یمن میں اپنے گورنر کو حکم دیا کہ دو آدمیوں کو بھیج کر

۱۔ سیرۃ ابن ھشام ۲:۲۳۳، زادالمعاد ۲:۷۲ وما بعد

۲۔ سیرۃ ابن ھشام ۲:۳۲۸ ما بعد، زادالمعاد ۲:۱۳۳ وما بعد

محمدؐ کا سر میرے پاس بھجوا دو۔ لیکن وہ دونوں آدمی مسلمان ہو گئے تھے، اور ان کی وجہ سے یمن کا گورنر بھی مسلمان ہو گیا تھا، جس سے پورے جزیرے کے اطراف میں اسلام پھیلا۔ اس سے ساسانی لوگ اور بھی طیش میں آ گئے اور انہوں نے اپنے پڑوس کے مسلمان قبائل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور ان پر غارت گری شروع کر دی۔

رہا رومیوں کا معاملہ تو ان کا بادشاہ ہرقل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور دعوت کو تقریباً قبول کرنے ہی والا تھا لیکن بادشاہت پر دین حق کو ترجیح نہ دے سکا، اور شام میں روم کے بعض گورنروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصدوں کو قتل کر دیا اور ان کے پڑوس میں جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا انہیں قتل کرنا شروع کر دیا۔

اِسلام میں اِن تمام جنگوں اور فتوحات کی اجازت اعلیٰ ترین مقاصد کے لیے دی گئی۔ ان کی مشروعیت صرف ظلم و زیادتی کے خاتمے، مسلم وطن کے دفاع اور مذہبی آزادی کو یقینی بنانے کے لیے ہوئی۔ چناں چہ جوں ہی حالات پرامن ہوئے، یعنی دشمن نے اسلام قبول کر لیا، یا جزیہ دینے پر راضی ہوگیا یا غیر جانب دار رہنے کا پابند ہوگیا تو جنگیں ختم کردی گئیں۔

اس طرح معلوم ہوا کہ اِسلامی جنگیں غصے کی بھڑاس نکالنے یا انتقام لینے کے لیے نہیں تھیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُوا﴾ [المائدۃ: ۲] (اور دیکھو ایک گروہ نے جو تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ اس پر نہ اُبھارے کہ تم بھی ان کے مقابلہ میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو)۔ یہ جنگیں توسیعی اور استعماری عزائم کے تحت یا دوسری قوموں کی دولت چوسنے کے لیے بھی نہیں لڑی گئی تھیں، اِرشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ [القصص: ۸۳] (وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں اور

انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے)۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾ [الحج: ۴۱](یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں دسترس دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے،معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے)۔

اسی طرح یہ جنگیں اس لیے بھی نہیں لڑی گئیں کہ زمین پر بڑی طاقت بنا جائے یا اپنے اقتدار اوراثر و رسوخ کو وسعت دی جائے یا قومی ونسلی رجحان کی تکمیل کے لیے دنیا پر قبضہ جمایا جائے جیسا کہ جرمن نازیوں نے یا نپولین بونا پارٹ نے کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَن تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ﴾ [النحل: ۹۲](اور تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے) یعنی اس لیے کہ ایک قوم دوسری قوم سے زیادہ معزز، زیادہ تعداد والی اور زیادہ غلبے والی بن جائے۔

فقہاء کے نقطہ ہائے نظر

فقہاء کا فیصلہ ہے کہ جنگ کا محرک ظلم کا خاتمہ ہے، مذہبی مخالفت نہیں۔ احنافؒ کا کہنا ہے کہ انسان کی جان قابل احترام ہے تاکہ اسے اپنی شرعی ذمہ داریاں نبھانے کا موقع مل سکے، جب کہ قتل کی اباحت عارضی ہے جس کی اجازت شر کو دفع کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ فقہاءِ حنفیہؒ یہ بھی کہتے ہیں: ’’کفر اپنے وجود کے لحاظ سے کفار کے ساتھ جنگ کا سبب نہیں ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنا خون بہائے یا دوسرے کا خون بہائے مگر حق کے ساتھ۔(۱)

۱۔ اختلاف الفقہاء، طبری، ص ۱۹۵۔ تحقیق شخت

حنابلہؒ کا کہنا ہے کہ(۱) جب تک خون بہانے کا جواز پیدا ہونے کا یقین نہ ہوجائے ، اس وقت تک اصولاً خون بہانا ممنوع رہتا ہے۔ اور کمال ابن ہمام حنفیؒ نے آیتِ کریمہ ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ: اس سے معلوم ہوا کہ ہمیں کافروں سے لڑنے کا جو حکم دیا گیا ہے تو اس کا سبب ان لوگوں کا ہم سے لڑنا ہے، اور یہی اسی کا بدلہ ہے۔ اسی طرح آیتِ کریمہ ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ﴾ (اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے) کے تحت کہا ہے: اس کی تفسیر یہ ہے کہ ان کی طرف سے مسلمانوں کو مارنے پیٹنے یا قتل کرنے کے ذریعے اسلام سے پھیرنے کا فتنہ اور فساد ختم ہو جائے۔(۲)

جمہور مسلمانوں کا اس پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ بچوں، عورتوں اور مذہبی درویشوں جیسے جنگ نہ لڑنے والوں کو قتل کرنا جائز نہیں۔ اگر آہن و آتش کے ذریعے اسلام کو نافذ کرنا ضروری ہوتا تو حدیث نبوی کے ذریعے مذکورہ بالا لوگوں کو قتل کرنے سے مستثنیٰ قرار نہ دیا جاتا۔

فقہاء نے دنیا کو جو دو حصوں: دارالاسلام اور دارالحرب میں تقسیم کیا ہے تو یہ تقسیم شرعی حکم نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے یہ تقسیم واقعاتی حقائق کی بنیاد پر کی ہے جیسا کہ ہمارے استاد مرحوم شیخ محمد ابوزہرہؒ کی رائے ہے۔(۳) اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ امام شافعیؒ نے پوری دنیا کو اصل کے اعتبار سے ایک ہی دار قرار دیا ہے اور اسی بنیاد پر احکامات مرتب کرتے ہوئے دنیا کے دو داروں میں تقسیم ہو جانے کو عارضی اور وقتی معاملہ قرار دیا ہے۔(۴)

۱۔ القواعد، ابن رجب، ص ۳۲۸

۲۔ فتح القدیر ۴:۲۷۹

۳۔ نظرية الحرب في الإسلام، مقالہ، المجلة المصرية للقانون الدولي، ص۱۴، شمارہ ۱۴، سال ۱۹۵۸ء

۴۔ تأسيس النظر، الدبوسی، ص ۵۸

جو غیر مسلم قوم مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کا آغاز نہ کرے، داعیانِ اسلام اور مبلغین کو بھی نہ روکے اور وہ جس کے سامنے اپنا دین پیش کرنا چاہیں انہیں آزادی سے ایسا کرنے دے تو ایسی قوم سے لڑنا جائز نہ ہوگا، نہ ہی اس سے پرامن تعلقات ختم کرنے کی اجازت ہوگی۔ مسلمانوں کے اور ان کے درمیان امن وامان قائم رہے گا۔ یہ امن وامان نہ تو کسی مالی ٹیکس کے نتیجے میں قائم ہوگا، نہ ہی اس کی بنیاد ان کے درمیان طے پانے والا کوئی معاہدہ ہوگا، بلکہ ان کے یہ تعلقات اس اصول کی بنا پر جاری سمجھے جائیں گے کہ اِن میں اصل حالتِ امن ہی ہے۔ اب چوں کہ ایسا کوئی عارضہ پیش نہیں آیا جس سے وجہ سے یہ حالت ختم ہوتی، نہ کسی نے مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کی ہے، نہ ان کی تبلیغ میں رکاوٹ ڈالی تو یہ تعلقات اپنی اصل حالت پر ہی قائم رہیں گے۔(۱) اسلام کے بین الاقوامی تعلقات کے جن اصولوں کی طرف ہم نے اس کتاب کی تمہید میں اشارہ کیا ہے، وہ قوموں کے درمیان تعلقات کی بنیاد جنگ کو قرار دینے کی اجازت نہیں دیتے، اور نہ ہی یہ بات دعوتِ اسلام کی عظمت اور اس کی عالمگیریت سے ہم آہنگ ہے جو امن و سلامتی کے بغیر وجود پذیر نہیں ہوسکتی۔

ان ساری باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد امن و سلامتی ہے۔ ہاں اگر اسلامی علاقے یا مسلمان مبلغین پر کوئی زیادتی کی جائے یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی ایسا ظالمانہ اقدام ہو جس سے ان کے لیے دین پر قائم رہنا مشکل ہوجائے تو ایسے حالات میں جان، مال اور عقیدے کے تحفظ کے لیے جنگ ایک ضرورت بن جاتی ہے۔ اسلام کا تو لفظ ہی سلام (سلامتی) سے مشتق ہے، مسلمانوں کا تحفۂ ملاقات بھی سلام ہے، اللہ تعالیٰ کا اِسمِ گرامی بھی السلام ہے اور جنت بھی دار السلام تو زندگی بھی صرف سلام (امن وسلامتی) کے ساتھ ہی پھل پھول سکتی ہے۔

یاد رہے کہ آج کل کی سیاسی اصطلاح میں بھی سلام کا مقصد حق اور انصاف کا قیام ہے نہ کہ شکست تسلیم کرلینا۔

۱۔ أحكام القانون الدولي في الشريعة ، حامد سلطان، ص۱۱۵ بحوالۂ السياسة الشرعية ، خلاف، ص۷۴

دوسری بحث

دنیا کی دو یا تین داروں میں تقسیم

دو یا زیادہ ریاستوں کے درمیان جنگ ہو جانے پر بین الاقوامی قانون کے تحت دنیا دو طبقوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک متحارب طبقہ ہوتا ہے جس میں برسر پیکار ملک شامل ہوتے ہیں اور دوسرا غیر متحارب طبقہ جو غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ اس میں متحارب ممالک کے علاوہ بین الاقوامی برادری سے تعلق رکھنے والے باقی تمام ممالک ہوتے ہیں۔ یہ تقسیم اس تقسیم کے پوری طرح مشابہ ہے جو فقہائے اسلام نے کی ہے، یعنی دارالاسلام اور دارالحرب۔ کیوں کہ ان کے خیال میں بھی یہ تقسیم جنگ کے نتیجے میں عمل میں آتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ کی صورت میں کسی کی فتح اور کسی کی ہزیمت کے زیراثر ریاست کی حیثیت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اس تقسیم کی بنیاد پر فقہاء کے نزدیک شرعی احکامات بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ احکام کی نوعیت مختلف ہونے کا سبب مسلمانوں اور کافروں کے درمیان برپا ہونے والی جنگ کے سوا کوئی نہیں۔

آج کل جو عالمی برادری کی اصطلاح مشہور ہے اس کے متعلق اِسلام کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لیے غور کیا جائے تو دار الحرب اور دار الاسلام کی اصطلاحوں سے پہلی نظر میں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ اسلام دنیا کی متعدد خود مختار ریاستوں میں تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا جن میں سے ہر ایک کا اپنا قانون ہو۔(۱) مگر یہ بات صرف ظاہری طور پر درست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ غیر اسلامی مملکتوں میں نظامِ حکومت اور قانون الگ الگ اور مختلف ہیں۔ اسلام کی نظر میں تو یہ سب ایک ہی ہیں، یعنی شریعتِ الٰہیہ کے مخالف۔ یہ وہ بات ہے جسے اِسلام نظریاتی طور پر صحیح نہیں سمجھتا کیوں کہ اسلام تمام شرائع کی تکمیل کرنے والا ہے اور دین حق ہے۔

۱۔ القانون الدولي العام، ص ۴۲، المجتمعات الدولية الإقليمية، ص ۲۴۔ ڈاکٹر حافظ غانم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِىٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُۥ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِۦ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ [الصف: ۹] (وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ برا ہی لگے)

لیکن زمینی حقائق کے پیش نظر دیکھا جائے تو اسلام اپنی دعوت کے ابلاغ کے بعد دنیا میں مختلف مملکتوں کی موجودگی کو نہیں روکتا۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ اللہ کے پیغام کو پہنچا دیا جائے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے اور آپؐ کی امت پر ذمہ داری عائد کی گئی کہ تبلیغ دین کے کام کو جاری رکھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا: سنو! جو حاضر ہیں وہ دوسرے لوگوں تک یہ پیغام پہنچا دیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص کو پیغام پہنچے وہ اسے یہاں سننے والے سے زیادہ بہتر طور پر سمجھ لے۔(۱)

تبلیغ کا فریضہ سر انجام پا رہا ہو تو اس کے علاوہ کی معروضی صورت حال کو قرآن کریم نے اِس انداز سے تسلیم فرمایا ہے: ﴿أَن تَكُونَ أُمَّةٌ هِىَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ﴾ [النحل:۹۲] (اس لیے کہ ایک گروہ کسی دوسرے گروہ سے بڑھ چڑھ گیا ہے) (۲)۔

۱۔ بخاری، احمد، بحوالۂ ابوبکرۃ، نیل الأوطار ۳۰۸:۴

۲۔ مکمل آیت سامنے رکھنے سے پوری بات سمجھ میں آسکتی ہے، اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: اور تم اُس عورت کی طرح مت ہوجاؤ جس نے اپنے سوت کو کات کر مضبوط بنایا تھا اور پھر آپ ہی اسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ تم لوگ آپس کے معاملات میں اپنی قسموں کو مکرو فریب کا ذریعہ بناتے ہو، اس لیے کہ ایک گروہ (کسی) دوسرے گروہ سے (طاقت میں) بڑھ چڑھ گیا ہے۔[النحل: ۹۲]۔ اگرچہ زیرِ غور آخری جملے کا ترجمہ مختلف مترجمین کے ہاں مختلف ملتا ہے، مثلاً: ''تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدہ حاصل کرے'' [مولانا مودودیؒ] اور'' صرف اِس لیے کہ کچھ لوگ دوسروں سے زیادہ فائدے حاصل کرلیں''[مولانا تقی عثمانی] مگر ''اس لیے کہ ایک گروہ (کسی) دوسرے گروہ سے (طاقت میں) بڑھ چڑھ گیا ہے'' [تدریس لغۃ القرآن از ابومسعود حسن علویؒ] مؤلف کتاب کے موقف سے مطابقت رکھتا ہے۔ اکرام الحق یٰسین۔

مطلب یہ کہ ایک قوم مال، افراد اور قوت کے لحاظ سے دوسری سے بڑھ گئی ہو اور اس وجہ سے بلند مقام حاصل کرچکی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِسلام ایسے غیرمسلم ممالک کے وجود کوتسلیم کرتا ہے جو خود مختار ہوں، ان کی اپنی جغرافیائی سرحدیں ہوں اور وہ مختلف نظامہائے حکومت کے تحت چل رہے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِسلام دیگر اَدیان سے کوئی مذہبی تعصب نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ﴾[البقرۃ:۲۵۶](دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے الگ تھلگ واضح ہو چکی ہے) غیرمسلموں کے ساتھ تعلقات کی اساس جنگ نہیں جیسا کہ پہلے معلوم ہوچکا۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اِسلامی دعوت کے مزاج کی عالمگیریت اور معروضی صورت حال کوتسلیم کرنے میں فرق ہے۔ یعنی نصیحت اور چیز ہے اور واقعاتی حقیقت ایک الگ موضوع ہے۔

اس طرح پروفیسر مجید خضوری کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوجاتا ہے کہ بین الاقوامی قانون کے اِسلامی ضوابط کی بنیاد بین الاقوامی برادری کے ارکان کی باہمی رضامندی پر نہیں، بلکہ مسلمانوں کے اِس تصور پر ہے جو ان کے سیاسی، اخلاقی اور دینی مفادات کی تفسیر وفہم کے نتیجے میں اِن کے ذہنوں میں تشکیل پاچکا ہے۔(۱)

احنافؒ کے نزدیک جنگی صورتِ حال کی بنا پر اصولاً دنیا میں دو دار پائے جاتے ہیں: ایک دارالاسلام ہے اور دوسرا دارالحرب۔ امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ اصولاً دنیا ایک ہی دار ہے۔(۲)

دارالاسلام

یہ وہ علاقہ ہے جہاں پر اسلامی احکامات اور شعائر نافذ ہوں اور مسلمان وہاں اپنی قوت اور شان کے ساتھ امن وسلامتی سے رہ رہے ہوں۔ اس کا دفاع مسلمانوں پر

۱۔ السلام و الحرب في الشريعة الإسلامية ، الأستاذ خضوري، ص۴۳

۲۔ تأسيس النظر ، الدبوسي، ص ۵۸

فرض ہوتا ہے اور اس علاقے کے جو حصے دشمن نے دبا لیے ہوں ان کا واپس لینا بھی مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے، بشرطیکہ اس طرح مقصد حاصل ہو جائے۔ ورنہ پھر قریب والے اور درجہ بدرجہ دیگر ساتھ ملنے والے علاقے کے مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ اگر پھر بھی مسئلہ حل نہ ہو تو پوری دنیا کے مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ اس بناء پر فلسطین وغیرہ جو علاقے پہلے دارالاسلام کا حصہ تھے اور بعد میں ان پر دشمن نے قبضہ کرلیا تو جب بھی اسلامی قوت میسر آجائے، درانداز دشمن کو وہاں سے نکالنا فرض ہے۔

دارالحرب

یہ وہ علاقے ہیں جہاں اسلامی اقتدار کی حدود سے باہر ہونے کی وجہ سے اِسلام کے دینی اور سیاسی اَحکام نافذ نہ ہوں، یعنی ان میں وہ غیر مسلموں کے زیرِ اقتدار ہوں۔ جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے جن میں امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ بھی شامل ہیں۔ ان کے نزدیک اس رائے کی بنیاد اسلامی اقتدار کی عدم موجودگی ہے۔ مطلب یہ کہ وہ علاقہ جہاں کا حکمران مسلمان نہ ہو وہ دارالحرب ہوگا اور جہاں کا حکمران مسلمان ہوگا وہاں اسلامی اَحکام نافذ ہونے چاہئیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور زیدیہ کے نزدیک دارالاسلام کے دارالحرب میں تبدیل ہونے کے لیے تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ وہاں کافرانہ احکام غالب بھی ہوں اور نافذ بھی، یعنی وہاں غیر مسلم حکومت قائم ہو اور شرعی احکامات نافذ نہ رہے ہوں۔

۲۔ اس علاقے کی حدود دارالحرب سے ملتی ہوں۔ اِس بناء پر دارالاسلام کے پڑوس میں موجود صحراء یا سمندر دارالحرب تصور نہ ہوں گے۔

۳۔ جہاں کوئی مسلمان، یا ایسا ذمی جو مسلمانوں کی دی ہوئی امان کے تحت وہاں رہ رہا تھا اسے امان حاصل نہ رہے۔ ذمی سے مراد دارالاسلام کے غیر مسلم شہری ہیں اور امان حاصل ہونے سے مراد وہ اِسلامی اَمان ہے جو انہیں پہلے

سے حاصل تھی اور جس کی رو سے مسلم رعایا کو اِس علاقے میں سکونت اختیار کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ یہ وہی امان ہے جو ایک مسلمان کو اسلام کی بنیاد پر اور ایک ذمی کو معاہدۂ ذمہ داری کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔

چناں چہ تیسری شرط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے دار کی حیثیت متعین کرنے کے لیے وہاں کے شہریوں کے پاس عہدِ امان ہونے یا نہ ہونے کو بنیاد بنایا ہے۔ چناں چہ جہاں مسلمانوں کو غیر مشروط امن حاصل ہو وہ علاقہ دارالاسلام ہوگا اور جہاں ایسا امن حاصل نہ ہو وہ دارالحرب ہوگا۔ اور مسلمانوں کے حوالے سے امن ختم ہونے کی مذکورہ تین صورتیں ہی ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ وہاں اِسلامی احکام کا نفاذ ختم ہوجائے، دوم یہ کہ یہ علاقہ دارالحرب کے پڑوس میں ہو اور اس کی آزادی مسلمانوں کے لیے مشکل ہو اور سوم یہ کہ وہاں کسی بھی مسلمان یا ذمی پر مسلمانوں کی دی ہوئی امان مؤثر نہ ہوسکتی ہو۔(۱)

امام ابوحنیفہؒ کا صاحبینؒ کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ جس دارالکفر میں اِسلامی اَحکام کا غلبہ ہو جائے وہ دارالاسلام بن جاتا ہے۔

دنیا کی دارالحرب اور دارالاسلام میں تقسیم کے بارے میں فقہاء کے نقطہ ہائے نظر کی وضاحت سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کا مطلب یہ نہیں کہ یہ دونوں دار مسلسل جھگڑے اور عداوت کی کیفیت میں رہتے ہیں، بلکہ ان کی حیثیت کا دار ومدار امن وامان کی موجودگی یا عدم موجودگی سے ہوتا ہے۔ اگر کسی علاقے میں مسلمانوں کو امن وامان حاصل نہ رہے تو ان پر جارحیت کا خطرہ رہتا ہے اور اگر انہیں امن کی ضمانت حاصل ہو تو جارحیت کا خطرہ نہیں رہتا۔

آج کل اگر یہ کہا جائے کہ دنیا کے اکثر ممالک میں ہر شہری کو امن حاصل ہے

۱۔ شرح السیر الکبیر ۴:۳۰۲، درر الحکام ۱:۲۹۵، الفتاوىٰ الهندیة ۲:۲۳۲، الدر المختار و رد المحتار، ابن عابدین ۳:۲۵۰، الافصاح، ابن هبیرة، ص ۳۴۸

تو اس صورت میں کسی علاقے کو دار الحرب قرار دینے کے لیے وہاں کے دستور اور اقتدار کی نوعیت کا اعتبار کیا جائے گا اور اسی بنیاد پر دار کی حیثیت کا تعین ہوگا۔یہاں دار کی تعریف کے لیے جمہور فقہاء کی رائے کو ترجیح دی جائے گی۔چناں چہ جب کسی ملک میں تمام یا اکثر اِسلامی شعائر کا قیام ممکن نہ رہے(۱) اور مسلمانوں کی حکومت ختم ہو جائے تو وہ علاقہ دارالحرب بن جائے گا، اور جہاں اسلامی شعائر سب کے سب یا زیادہ تر باقی ہوں، وہ علاقہ دارالاسلام رہے گا، اگرچہ اس پر کافر حکومت نے غلبہ پا لیا ہو۔(۲)

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کوئی علاقہ اس وقت تک دارالاسلام ہی رہتا ہے جب تک اس کے باشندگان مسلمانوں کی اس وقت کی دی ہوئی امان کے تحت رہ رہے ہوں جب وہ علاقہ ان کے ہاتھ آیا تھا اور انہوں نے لوگوں کو اس میں سکونت اختیار کرنے کا موقع دیا تھا، چاہے آج کل وہ پورے اسلامی احکام نافذ نہ بھی کر رہے ہوں جیسا کہ آج کل اکثر مسلمان عرب ریاستوں کا حال ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی اس رائے کی بنا پر جب مسلمان کسی علاقے پر قبضہ کر لیں اور وہاں کے باشندوں کو امن کی ضمانت دے دیں، اور بعد میں کسی جنگ کے زیراثر یا دیگر وجوہ سے وہاں سے نکل جانے پر مجبور ہو جائیں تو وہ ملک اس وقت تک دارالحرب نہیں بنے گا جب تک قابض قوتیں مسلمانوں اور ذمیوں کو پہلے سے حاصل ضمانتِ امن پر برقرار رہنے دیں۔لیکن اگر وہ امان ختم کر دیں اور مسلمانوں سے لڑنا شروع کر دیں تو وہ علاقہ دارالحرب بن جائے گا چاہے مسلمان وہاں کسی نئی امان کے تحت سکونت کو جاری ہی رکھے ہوئے ہوں جیسے کہ اندلس (سپین) اور فلسطین کی صورت حال ہے۔

۱۔ اسلامی شعائر کی مثالیں اذان، جمعہ، باجماعت نمازوں کا اہتمام اور عیدین کی نمازیں ہیں۔

۲۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ جس علاقے کے سارے یا اکثر باشندے مسلمان ہوں وہاں کافر حکومت کا باقی رہنا جائز نہیں اور ایسی غیر اسلامی صورت عارضی اور وقتی تصور کی جائے گی جس طرح غاصبانہ قبضہ عارضی سمجھا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ دار کے تعین کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے کے مقابلے میں دوسرا نقطۂ نظر زیادہ بہتر ہے۔ اس کے مطابق جہاں اسلام کا دستور غالب اور نافذ ہو وہ دارالاسلام ہوگا اور جہاں غیراسلامی دستور غالب اور نافذ ہو وہ دارالحرب ہوگا۔ کسی علاقے کے دارالحرب سے ملحق ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ جدید ذرائع نقل وحمل نے دوریوں کے فاصلے سمیٹ دیے ہیں۔

دارالعہد

فقہاءِ شافعیہؒ کے نزدیک جنگ کی وجہ سے دنیا تین حصوں میں تقسیم ہے: ایک دارالاسلام، اور وہ ایسا علاقہ ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو۔ دوسرا دارالحرب، جو ایسے غیرمسلموں والا علاقہ ہے جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو اور تیسرا دارالعہد ہے، اور یہ وہ علاقہ ہے جس پر مسلمانوں نے قبضہ نہ کیا ہو، بلکہ وہاں کے باشندوں نے مسلمانوں سے یہ معاہدہ کیا ہو کہ وہ خراج ادا کریں گے۔(۱) ان لوگوں سے فی کس جزیہ نہ لیا جاتا ہو کیوں کہ وہ دارالاسلام میں نہیں رہتے۔(۲)

اس علاقے پر مسلمانوں نے قبضہ تو نہیں کیا ہوتا کہ وہاں اسلامی دستور نافذ ہو، البتہ وہاں کے باشندوں نے کچھ شرائط وضوابط کے ساتھ مسلمانوں سے معاہدہ کیا ہوتا ہے لہٰذا ایسے علاقوں میں پہلے سے رائج دستور اور قوانین کی پاسداری کی جائے گی ۔ یوں یہ علاقہ ان ممالک کی طرح ہوتا ہے جو معاہدات کی وجہ سے مکمل خودمختاری کے مالک نہیں ہوتے۔(۳)

۱۔ خراج ایک فقہی حکم ہے جس کے نفاذ میں ماضی میں حالات کو ملحوظ رکھا جاتا رہا ہے۔ یہ ایک جنگی اور سیاسی نظم تھا جس کو حضرت عمرؓ نے جاری فرمایا، یہ کوئی لازمی شرعی حکم نہیں۔ چناں چہ خراج کے بغیر بھی غیرمسلموں کے ساتھ ایسے معاہدات کرنا جائز ہے اور ماضی میں اس طرح کے معاہدات ہو چکے ہیں۔ الفروق، قرافی ۳:۲۴۔ مؤلف کے حاشیے کے علاوہ خراج کی صحیح تعریف وتفصیل کے لیے دیکھیے: الموسوعہ الفقہیۃ الکویتیۃ، ط۲، ج۱۹، ص۵۱، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور۸:۹۰۵، موسوعۃ کشاف اصطلاحات الفنون، تھانوی ۱: ۷۴۱۔ اکرام الحق یٰسین

۲۔ الأم ۴:۱۰۳ وما بعد، مغني المحتاج ۴:۲۳۲ وما بعد، الأحکام السلطانیۃ، الماوردی، ص ۱۳۳

۳۔ الشرع الدولي في الإسلام، ڈاکٹر نجیب ارمنازی، ص ۵۰

اس نقطۂ نظر کی بنیاد نجران، علاقہ نوبہ اور معاہدۂ ارمینیہ سے پیدا ہونے والی کیفیت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ یہ معاہدہ کیا تھا کہ اسی علاقے میں انہیں امن کی ضمانت حاصل ہوگی، البتہ ان پر ایک ٹیکس عائد کیا گیا تھا، جسے کچھ لوگ خراج کہتے ہیں اور کچھ جزیہ۔

نوبہ والوں نے صدیوں تک اپنی خودمختاری قائم رکھی اور مسلمان ان کے علاقے کو فتح نہ کر سکے۔ چناں چہ عبداللہ بن سعد نے ان سے معاہدہ کیا جس میں جزیہ نہ تھا، بلکہ یہ دو طرفہ تجارت کا معاہدہ تھا اور ارمینیہ والوں کے لیے امیر معاویہؓ نے عہدنامہ لکھ دیا جس میں ان کی مکمل داخلی خود مختاری تسلیم کی گئی تھی۔(۱)

دارالعہد کے نظریے کے بارے میں امام محمد بن الحسنؒ (حنفی) اور حنابلہؒ میں سے قاضی ابو یعلیٰؒ نے امام شافعیؒ کی رائے کو اختیار کیا ہے۔(۲) امام محمدؒ فرماتے ہیں: دار کی حیثیت کے تعین کے بارے میں اقتدار اور استقلال کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ چناں چہ اگر حکومت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے صلح کا معاہدہ کیا ہوا ہے اور یہ لوگ کسی دوسرے علاقے پر قبضہ کر لیں تو یہ علاقہ بھی دارالعہد شمار ہوگا، اور اگر حکومت کسی دوسرے علاقے کے بادشاہ کی ہے تو اس علاقے کے کسی شہری کو معاہد کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔

البتہ جمہور فقہاء نے دارالعہد کو دارالاسلام قرار دیا ہے کیوں کہ معاہدۂ صلح کرنے سے یہ لوگ ذمی بن جاتے ہیں جن سے فی کس جزیہ لیا جاتا ہے۔(۳)

میرے خیال میں دارالعہد کی اصطلاح کی وجہ سے شافعی مذہب اس قابل ہے کہ اسے دورِ جدید میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد قرار

۱۔ الشرع الدولي في الإسلام، ڈاکٹر نجیب ارمنازی، ص ۵۰

۲۔ الأحکام السلطانیة، ابو یعلیٰ، ص ۱۳۳، شرح السیر الکبیر ۴:۸، ۱۰ وما بعد

۳۔ الأحکام السلطانیة، الماوردي، ص ۱۳۳

دیا جاسکے۔ اس کے ذریعے تمام معاشی مفادات کے تحفظ کی ضمانت بھی مل سکتی ہے، اور اسی طرح سیاسی اور کئی اور طرح کے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ یہی نقطۂ نظر اس بات کی دلیل بھی بن سکتا ہے کہ اسلام میں خارجی تعلقات کی بنیاد جنگ نہیں، بلکہ امن ہوتا ہے۔ اور چوں کہ اس دور کے ممالک اقوامِ متحدہ کے معاہدے کے ساتھ منسلک ہیں تو اس بنا پر معاصر غیر مسلم ممالک کی حیثیت دارالعہد کی ہوگی ، نہ کہ دارالاسلام کی۔

دار مختلف ہونے کی بنا پر اَحکام کا اِختلاف

حنفی فقہاء نے روئے زمین کی دو داروں میں تقسیم کی بنا پر بعض شرعی اَحکام میں اختلاف بیان کیا ہے۔ اِس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ اِن حضرات نے ایک زمانے میں غیر مسلموں کے ساتھ کشمکش کی معروضی صورتِ حال کے پیشِ نظر لفظِ حرب کو ان کے علاقے کی صفتِ لازمہ قرار دے دیا۔ چناں چہ ان کے نزدیک دونوں داروں کے اَحکام میں اختلاف اس جنگ کے اثرات کی بنا پر ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جاری رہتی تھی، یا محض حالتِ جنگ پیدا ہوجانے کی وجہ سے بھی دونوں علاقوں کے احکام مختلف ہوجاتے تھے ۔چناں چہ اس طرح کے احکامات بہت ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

اوّل: اگر کوئی مسلمان امان کے تحت دارالحرب میں داخل ہو اور وہاں کسی حربی (۱) کے ساتھ ایسے لین دین کا معاہدہ کرلے جو اسلام کی رو سے صحیح نہ ہو، جیسے سودی معاملہ وغیرہ (۲)، اور پھر اس کے تحت حربی کا مال لے لے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہوگا۔ لیکن امام ابویوسفؒ اور جمہور فقہاءؒ کے نزدیک جائز نہ ہوگا۔ (۳)

۱۔ حربی وہ شخص ہے جس کے ملک اور مسلمانوں کے درمیان دشمنی اور جنگ کی کیفیت ہو اور اس کی قوم کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی امن معاہدہ یا دوستی کا معاہدہ بھی نہ ہو۔

۲۔ یہاں ربا سے مراد تجارتی سود ہے، بینک والا سود یا منافع نہیں جیسا کہ استاذ ابوزہرہ نے کہا ہے۔

۳۔ المبسوط ۱۰:۹۵، الرد علی سیر الأوزاعي، ابویوسف، ص ۹۶، البدائع ۵:۱۹۲، الفروق، القرافي ۳:۲۰۷، غاية المنتهى ۲:۶۴

امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ اگر مسلمان خیانت اور دھوکے کے بغیر حربی کا مال لے لے تو اِس کی اجازت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خیانت اور دھوکہ بھی نہ ہو اور صاحبِ مال کی رضامندی بھی موجود ہو تو اس سے زیادہ اس کے مال کو کوئی تحفظ حاصل نہیں۔ اب سودی کاروبار کرنا اسلام کی نظر میں چوں کہ مال برباد کرنے کے برابر ہے، اس لیے کسی ایسے عقد کے ذریعے اگر حربی کا مال لے لیا جائے اور اسے ایک طرح سے برباد بھی شمار کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ (۱)،اِس لیے اِس قسم کا معاملہ جائز ہوگا۔ امام محمدؒ نے السیر الکبیر میں کہا ہے(۲) ''کوئی مسلمان دارالحرب میں امان کی بنا پر داخل ہوا ہو تو وہ ان لوگوں کی رضامندی سے کسی طریقے سے بھی ان کا مال لے لے تو اس میں کوئی گناہ نہیں کیوں کہ وہ ایک جائز مال لیتا ہے اور کسی کو دھوکا بھی نہیں دیتا۔اس طرح وہ فریقِ ثانی کی رضامندی سے لیتا ہے''۔

امام ابویوسف اور جمہور کی دلیل یہ ہے (۳) کہ سود کی حرمت مسلمان اور کافر حربی دونوں کے حق میں موجود ہے۔ مسلمان کے حق میں تو واضح ہے اس لیے کہ مسلمان جہاں بھی ہو وہ اسلامی احکامات کا پابند ہوتا ہے اور حربی کے حق میں اس لیے کہ وہ لوگ بھی اسلامی احکامات کے مخاطب ہیں۔ یہودیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ﴾ [النساء: ۱۶۱](اور سود لیتے تھے باوجود منع کیے جانے کے)۔

جمہور کی یہ رائے ہی زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ حرام کسی جگہ بھی حلال نہیں

۱۔ یہاں کتاب کی عبارت پیچیدہ تھی، اِس لیے المبسوط وغیرہ اصل کتب کی عبارات سے جو مضمون اخذ ہوتا ہے اس کے مطابق ترجمہ کرتے وقت تھوڑا بہت تصرف کیا گیا ہے تاکہ مؤلف کی بات آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ یہ گزشتہ صفحے پر ''اوّل'' سے شروع ہونے والے فقرے کا تسلسل ہے۔اِکرام الحق یٰسین۔

۲۔ شرح السیر الکبیر ۳:۲۲۳، ۴:۱۸۸

۳۔ البدائع ۷:۱۳۰-۱۳۴، رد المحتار، ابن عابدین ۴:۳۵۰

ہوجاتا۔ حربی کا مال غنیمت میں ملنے اور کاروباری عقد کرکے لینے میں فرق ہے۔ کاروباری عقود پر لینے سے حرام کے ارتکاب کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، جب کہ اس کے برعکس جمہور کے نقطۂ نظر سے غیرمسلموں کو اسلامی اَحکام کے تقدس،اصلیت اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

دوم: اگر کوئی مسلمان امان کے ذریعے دارالحرب میں جائے اور اس کو کوئی حربی قرضہ دے، یا وہ کسی حربی کو قرضہ دے یا دونوں میں سے کوئی دوسرے کا مال غصب کرلے، اس کے بعد مسلمان واپس دارالاسلام آ جائے اور وہ حربی بھی امان حاصل کرکے دارالاسلام میں آ جائے اور دونوں کا مقدمہ قاضی کے پاس پیش ہوتو قاضی نہ ان کے قرضے کے بارے میں کوئی فیصلہ دے گا، نہ غصب کے مقدمے میں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دار الحرب میں طے پانے والا قرض کا عقد کالعدم ہوگا، وہاں مسلمانوں کا دائرۂ اِختیار نہیں، اور یہاں کافروں کا دائرۂ اختیار نہیں۔ اسی طرح ان دونوں نے ایک دوسرے کا جو مال غصب کیا وہ ضمان کے قواعد وضوابط پر پورا نہیں اترتا، اِس لیے اس کے غصب سے ضمانت بھی لازم نہیں آتی۔(۱)

سوم: اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں جائے اور وہاں زنا، چوری، شراب نوشی، قذف یا قتلِ مسلم جیسے قابل سزا جرم کا ارتکاب کرے تو حنفیہؒ کے نزدیک وہ سزا کا مستوجب نہ ہوگا، چاہے واپس دارالاسلام میں آ جائے، کیوں کہ دارالحرب میں جہاں یہ وقوعہ ہوا، مسلمان حکومت کی عمل داری نہیں، اِس لیے وہاں کیا ہوا جرم بھی مستوجب سزا نہیں۔ اِسلامی لشکر کے سالار کو بھی اس پر حد جاری کرنے کا اختیار نہیں کیوں کہ اسے یہ اختیارات تفویض نہیں کیے گئے۔ ہاں اگر مسلم حاکم خودفوج کی قیادت کررہا ہوتو اسے اختیار حاصل ہے، چاہےتو دارالحرب میں بھی مسلمان مجرم پر حد جاری کرسکتا ہے۔

۱۔ المبسوط ۱۰:۹۵، الرد علی سیر الأوزاعي، ابویوسف، ص ۹۶،البدائع ۵:۱۹۲،الفروق، القرافي ۳:۲۰۷،غایة المنتھی ۲:۲۴

لیکن اگر دارالاسلام میں اس طرح کا جرم سرزد ہو اور مجرم بھاگ کر دارالحرب چلا جائے تو اس کی سزا ساقط نہ ہوگی کیوں کہ جہاں فعل سرزد ہوا وہاں موجب سزا تھا، اب بھاگ جانے سے اس کی سزا ساقط نہیں ہوتی۔(۱) اگر کوئی مسلمان ایسے جرم کا ارتکاب کرے جو موجب تعزیر ہو تو پہلی دفعہ امیرِ جیش اسے زبانی نصیحت کرے گا اور اگر وہ دوبارہ وہی کام کرے تو پھر اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرے گا۔(۲)

احنافؒ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے گورنروں کو لکھ بھیجا تھا کہ کسی فوج یا فوجی دستے کا قائد کسی شخص کو اس وقت تک کوڑے نہ مارے جب تک واپس دارالاسلام کے راستے پر چل نہ نکلے، مبادا کہ شیطان اسے غیرت دلائے اور وہ ضد میں آ کر کافروں سے مل جائے۔ حضرت ابوالدرداءؓ دشمن کی سرزمین پر مسلمانوں پر حد جاری کرنے سے منع کیا کرتے تھے تاکہ وہ ضد میں آ کر کہیں کافروں سے نہ مل جائیں۔ انؓ کا کہنا تھا کہ اگر وہ توبہ کرلیں گے تو اللہ تعالیٰ اِن کی توبہ قبول کرے گا، ورنہ اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ رہا ہے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت نے ایک روایت یوں نقل کی ہے: **لا تقام الحدود في دار الحرب** (۳) (دارالحرب میں حدود نافذ نہ کی جائیں)۔ علقمہؒ کہتے ہیں کہ ہم سرزمینِ روم کی طرف جہاد کو نکلے تو حضرت حذیفہؓ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہمارے سپہ سالار ایک قریشی شخص تھے، جنھوں نے شراب پی لی تو ہم نے ان پر حد جاری کرنا چاہی، جس پر حضرت حذیفہؓ نے فرمایا: "اپنے امیر کو حد کی سزا دینا چاہتے ہو جب کہ اس وقت تم دشمن کے قریب پہنچ چکے ہو، اِس طرح وہ تم پر دلیر ہو جائیں گے۔(۴)

۱۔ شرح السیر الکبیر ۴:۱۰۷، المبسوط ۱۰:۷۵، الرد علی سیر الأوزاعي، ابویوسف، ص ۸۱-۸۳، تبیین الحقائق ۳:۲۶۷، کتاب الخراج، ابو یوسف، ص ۱۷۸، البدائع بحوالۂ سابقہ، اختلاف الفقهاء، طبری، تحقیق فردریک، ص ۵۹

۲۔ طوالع الأنوار شرح الدرالمختار، السندی ۸:۲۰ مخطوطہ ازہر لائبریری

۳۔ زیلعی نے اسے غریب قرار دیا ہے اور بیہقی نے زیدؓ بن ثابت سے یوں نقل کیا ہے: (لا تُقام الحدود في دارالحرب مخافة أن یلحق أهلها بالعدو) نصب الرأیة ۳:۳۴۳

۴۔ شرح السیر الکبیر ۴:۱۰۸

اَحناف کے سوا جمہور فقہاء کا کہنا ہے(۱) کہ کسی مسلمان سے اگر دارالحرب میں موجب حد یا موجب تعزیر جرم سرزد ہو جائے تو وہ مستحق سزا ٹھہرے گا لیکن اسے سزا کہاں دی جائے گی؟ اس بارے میں حنابلہ اور امامیہ کہتے ہیں کہ سزا کا نفاذ صرف دارالاسلام ہی میں ہوگا۔ اوزاعیؒ کا کہنا ہے کہ دارالحرب میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ دیگر فقہاء کا کہنا ہے کہ دارالحرب ہی میں حد جاری کی جائے گی اور مجرم کے دارالاسلام میں آنے تک اسے مؤخر نہیں کیا جائے گا کیوں کہ حد کو جاری کرنا عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ البتہ اگر دارالحرب کی سرزمین پر حد جاری کرنے سے کوئی خرابی پیدا ہونے کا خدشہ ہو تو اس کے اجراء کو دارالاسلام واپس آنے تک مؤخر کر دیا جائے گا۔ بالخصوص اس وقت جب خرابی زیادہ بڑھ جانے کا خدشہ ہو، تو جس طرح بیمار مجرم پر حد کا نفاذ مؤخر کیا جاتا ہے اسی طرح اِس پر بھی مؤخر کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کو اس مجرم کی ضرورت ہو یا وہ ان کے لیے قوت کا باعث ہو یا کسی دوسری مصروفیت کی وجہ سے حد کا اجراء ممکن نہ ہو تو اس کی سزا مؤخر کی جائے گی۔ اس معاملے میں ذمی اور مسلمان دونوں کا حکم ایک ہی ہے کیوں کہ ذمی بھی معاہدے کے تحت اسلامی احکام کا پابند ہوتا ہے۔

جمہور فقہاء کی دلیل یہ ہے کہ حدود کے نفاذ کا حکم ہر جگہ اور ہر زمانے کے لیے مطلق ہے اور مسلمان اور ذمی دونوں اِسلامی احکام کے پابند ہیں۔ عبدالرحمٰن بن ازہر الزہریؒ کی روایت ہے کہ میں نے غزوۂ حنین کے موقع پر دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان گھوم پھر کر خالدؓ بن ولید کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اتنے میں آپؐ کے پاس نشے میں مدہوش ایک شخص کو لایا گیا تو آپؐ کے پاس جو لوگ تھے انہیں حکم فرمایا تو جس کسی کے ہاتھ میں جو کچھ تھا، اس نے اسی سے اس شرابی کو مارا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پر مٹی پھینکی۔(۲)

۱۔ الشرح الکبیر، الدردیر ۲:۱۶۶، المھذب۲:۲۴۱،المغني ۸:۴۷۳ ومابعد،اعلام الموقعین۳: ۱۷ وما بعد، البحر الذخار ۵:۴۰۹، المختصر النافع في فقه الإمامية، ص ۲۲۰ وما بعد

۲۔ سنن بیھقي مع الجوھر النقي۹: ۱۰۳

اَبوداوُدؒ نے حضرت عبادة بن صامتؓ سے ایک مرسل روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وأقيموا الحدود في الحضر والسفر، على القريب والبعيد، ولا تبالوا في الله لومة لائم (۱)(حدود نافذ کرو خواہ سفر میں ہو یا حضر میں، خواہ قریبی شخص ہو یا دور کا، اور اللہ تعالیٰ کے معاملے میں کسی کی ملامت کی پرواہ مت کرو)۔

جمہور فقہاء نے اِن اَحادیث کی تحقیق کی ہے جن پر حنفیہؒ کے موقف کا دار ومدار ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ روایات نہایت کمزور ہیں اور پایۂ ثبوت کونہیں پہنچتیں۔ (۲) البتہ حنفیہؒ کا موقف جس کے مطابق دارالحرب میں مجرموں کو سزا دینا جائز نہیں، جدید فوجداری قانون کے ضابطۂ جغرافیائی حدود سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس ضابطے کے تحت جس ملک کی حدود کے اندر جرائم ہوں وہیں اس قانون کے تحت سزا دی جاسکتی ہے، چاہے جرم کا ارتکاب کرنے والا کسی اور ملک کا شہری ہی ہو۔ اس کے برعکس اگر ملکی حدود سے باہر کسی جرم کا ارتکاب ہوتو اِس ملک کے قانون کا وہاں کوئی اختیار نہیں ہوگا۔یہی ضابطہ ریاست کی جغرافیائی خود مختاری کے اصول کے مطابق بھی ہے، ریاستی خود مختاری ہمیشہ ہوتی ہی جغرافیائی حدود کے اندر ہے، جدید قوانین میں بھی اسی اصول پر عمل ہو رہا ہے۔(۳)

جمہور کا نقطۂ نظر جو دارالحرب میں حدود کے نفاذ کی اجازت دیتا ہے، وہ قدیم زمانے میں رائج قوانین سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہ فوجداری قوانین کو ذاتی حیثیت دینے کا اصول ہے۔ اس کی رو سے فوجداری قوانین اپنے ملک کے باشندوں کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور وہ جہاں بھی پائے جائیں ان پر لاگو ہوتے ہیں، البتہ کسی ملک کے یہ قوانین دیگر ممالک کے شہریوں پر لاگو نہیں ہوتے چاہے وہ ملک کی

۱۔ سنن بیہقی ۹:۱۰۴

۲۔ آثار الحرب، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، ص ۱۶۸ وما بعد

۳۔ القانون الدولي، ڈاکٹر حامد سلطان، و ڈاکٹر عبداللہ العریان، ص ۵۵۵۔ النظم السياسية، ڈاکٹر ثروت بدوی، ص ۱۳۸

سرزمین پر ہی جرم کا ارتکاب کریں۔ البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے کے برخلاف جمہور فقہاء اس اصول کی آخری شق سے اتفاق نہیں کرتے۔ان کا کہنا ہے کہ اگر دارالاسلام میں امان پانے والا کوئی شخص یا وہاں کا ذمی کسی جرم کا ارتکاب کرے تو اسے وہیں سزا دی جائے گی کیوں کہ اس نے معاہدے کے تحت یہ بات قبول کی ہوتی ہے کہ معاملات اور جرائم کے بارے میں اسلامی احکامات ہی کا پابند رہے گا۔

البتہ جدید پیش رفت کا رخ اس جانب ہے کہ کسی ملک کا فوجداری قانون عالمی حیثیت کا حامل ہو جائے، یعنی جرم کا ارتکاب کہیں بھی ہو اور ارتکاب کرنے والا کسی بھی قومیت سے تعلق رکھتا ہو جب وہ ریاست کی حدود کے اندر پکڑا جائے تو اس پر اس ریاست کا قانون نافذ العمل ہوگا۔(۱) اس صورت میں جمہور فقہاء کی رائے کے مطابق اسلامی قانون اس جدید پیش رفت سے مطابقت رکھتا ہے۔

دنیا کی دو داروں میں تقسیم کا تجزیہ

فقہاء نے دنیا کو دو داروں میں تقسیم کرنے کا اصول مسلمانوں کی اس واقعاتی حیثیت سے اخذ کیا ہے جو صدرِ اِسلام میں ہجرت کے بعد اور اسلامی حکومت کے وجود میں آنے کے بعد انہیں حاصل رہی۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ہجرت کے بعد مکہ دارالحرب قرار پایا تھا اور مدینہ دارالاسلام۔(۲) ابن حزمؒ نے کہا ہے کہ مدینہ کے سوا ہر جگہ کھلا میدان، دارالحرب اور جہادی مہمات کا ہدف تھی۔(۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی اِس طرح دو حصوں میں تقسیم کسی باقاعدہ شرعی نص سے ثابت نہیں، بلکہ یہ معروضی حالات کی وہ شکل ہے جس نے اس وقت کے زمینی حقائق کی بنا پر تشکیل پائی اور ایک عرصے تک امتِ مسلمہ کے ذہنوں میں مجسم رہی۔

۱۔ موجز القانون الجنائي، ڈاکٹر علی راشد، ص ۷۵

۲۔ شرح النیل و شفاء العلیل ۱۰:۳۶۳-۳۶۶

۳۔ المحلی ۷:۳۵۳، المبسوط ۱۰:۱۸

امام ابویوسفؒ کی کتاب الخراج میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ایک مکتوب کے حوالے سے لکھا ہے:

> میں نے ذمیوں کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان میں سے جو بوڑھا شخص کام کرنے کے قابل نہ رہے، یا وہ کسی حادثے اور مصیبت کا شکار ہو جائے یا پہلے مالدار ہو اور پھر غریب ہو جائے اور اس کے دین والے اسے خیرات دینا شروع کردیں تو میں اس کا جزیہ ساقط کر دوں گا۔ اس کی اور اس کے اہل و عیال کی کفالت مسلمانوں کے بیت المال سے اس وقت تک کی جائے گی جب تک وہ دارالہجرۃ اور دارالاسلام میں مقیم رہے گا۔ اگر ایسے لوگ دارالہجرۃ اور دارالاسلام سے باہر چلے جائیں تو ان کے بال بچوں کے اخراجات مسلمانوں کے ذمے نہیں رہیں گے۔ (۱)

چناں چہ مسلمانوں اور غیرمسلموں کے درمیان جنگی صورت حال قائم ہونے، اور فقہی اجتہاد کے دور میں جاری رہنے، بلکہ اس کے بعد تک جنگوں کے تسلسل نے، دنیا کی دو یا تین داروں میں تقسیم کے تصور کو پختگی اور جلا دی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تقسیم قرآن و سنت سے ثابت نہیں بلکہ مسلمانوں اور غیرمسلموں کے درمیان اس وقت کے تعلقات کی واقعاتی تصویر ہے، جب ان تعلقات پر جنگی رنگ غالب رہتا تھا۔ اس سے صرف وہ حالات مستثنیٰ تھے جب کسی ریاست یا علاقے کے ساتھ معاہدہ طے پا جاتا۔

اس کے مقابلے میں غیراسلامی نظریہ پہلے سے اس طرح کی تقسیم سے مانوس تھا بلکہ یہ اسی کی فکری تخلیق ہے۔ چناں چہ اہلِ روم نے لوگوں کو ہم وطنوں، لاطینیوں اور اجنبیوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ان کے ہاں اجنبی در اصل دشمنوں کو کہا جاتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو دریائے تبر کے اس پار روما کے پڑوسی علاقوں میں رہائش رکھتے تھے۔ ان

۱۔ کتاب الخراج، ص ۱۴۴

اجنبیوں میں سے جو کوئی رومی حکومت سے معاہدہ کر کے یا اس کا حلیف بن کر منسلک نہ ہوتا تو کوئی بھی آنے والا ان پر یوں قبضہ جما لیتا جیسے کسی بے مالک مال پر قبضہ کیا جاتا ہے۔(۱) یوں رومیوں کی نظر میں دنیا تین داروں میں تقسیم تھی: رومی شہریوں کا دار، اجنبیوں یا دشمنوں کا دار اور معاہدے والوں کا دار۔

یہی صورت حال قدیم سیاسی معاشروں کی بھی تھی۔ ان میں بھی اجنبیوں کو کوئی قانونی مقام حاصل نہ تھا۔ یونانی غیر یونانیوں کو بربر کہتے تھے اور انہیں دشمنوں والی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اِن لوگوں کو قدرت نے یونانیوں کا خادم اور غلام بننے کے لیے پیدا کیا ہے۔چناں چہ بلا روک ٹوک ان کا خون بہا دیا جاتا اور ان کا مال لے لیا جاتا تھا۔(۲)

اب چوں کہ دنیا کو دو داروں میں تقسیم کرنے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، یہ نظریہ واقعاتی صورت حال سے پیدا ہوا تھا، محض شریعت کی بنیاد پر وجود میں نہیں آیا۔ اس کے وجود میں آنے کا ایک سبب بین الاقوامی معاملات کے احکامات مرتب کرنے کی ضرورت بھی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ جنگ پیدا ہوجانے یا جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے یہ ایک عارضی اور وقتی تقسیم تھی ۔ اگر اس کے اسباب ختم ہو جائیں تو یہ تقسیم بھی باقی نہیں رہے گی اور دنیا اپنی حقیقی اصلیت کی طرف لوٹ آئے گی جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے۔ اس طرح امام شافعیؒ کے نظریے کے مطابق دنیا کو ایک ہی دار سمجھا جائے گا۔ اسی بنا پر ان کی اور جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جس مقام پر بھی حد کا سبب پایا جائے، مسلمان پر اس کا اجراء ضروری ہوگا۔ فقہاءِ حنفیہؒ چوں کہ دنیا کو دو داروں پر مشتمل قرار دیتے ہیں، اِس لیے وہ حضرات دار الحرب

۱۔ القانون الروماني، ڈاکٹر عبدالمنعم البدراوی و ڈاکٹر بدر، ص ۷۲، ۱۹۸، القانون الدولي، ڈاکٹر علی صادق ابو ہیف، ص ۶۷ وما بعد

۲۔ القانون الدولي، حامد سلطان، ص ۳۶۹، أصول القانون الدولي الخاص، محمد کمال فہمی، ص ۲۲۲

میں مسلمان پر حد جاری کرنے کے قائل نہیں اور انہوں نے اسی اصول پر اس سے متعلقہ دیگر احکام بھی مرتب کیے ہیں۔(۱)

تاہم اس تقسیم کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کو دو ممالک کی حکومتوں کے ماتحت کردیا جائے یا اسے دو سیاسی دھڑوں میں تقسیم سمجھا جائے، جن میں سے ایک دھڑا مسلم علاقوں پر مشتمل ہو اور ایک حکومت کے ماتحت ہو، اور دوسرا دھڑا غیر مسلم علاقوں پر مشتمل ہو اور ایک یا ایک سے زیادہ اِسلام دشمن حکومتوں کے زیرِ انتظام ہو۔ بلکہ یہ تقسیم اس نقطۂ نظر سے ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ملک میں امن و سلامتی حاصل ہوتا ہے جب کہ غیر ملک میں انہیں خوف اور عداوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ نے صراحت کی ہے۔

دارالاسلام میں کبھی ایک سے زیادہ حکومتیں بھی ہو سکتی ہیں، جب کہ دارالحرب مختلف ریاستوں اور حکومتوں میں تقسیم ہونے کے باوجود تمام غیرمسلم علاقے پر مشتمل ہوتا ہے۔(۲)

اس تقسیم کا مقصود یہ بھی نہیں، جیسا کہ مستشرقین نے سمجھا ہے، کہ اسے اِس بات کی دلیل بنا لیا جائے کہ مسلمان اس وقت تک جنگجو اور غارت گر رہیں گے جب تک اس دنیا میں غیرمسلم پائے جائیں گے۔(۳) یا جیسا کہ گولڈ زیہر نے کہا ہے کہ یہ تقسیم اِسلامی دنیا کی جغرافیائی حدود کا تعین ہے۔(۴)

۱۔ تأسيس النظر، الدبوسی، ص ۵۸

۲۔ التشريع الجنائي الإسلامي، پروفیسر عبدالقادر عودہ ۱:۲۹۱، نظرية الحرب في الإسلام في مجلة القانون الدولي، شیخ محمد ابوزہرہ، ۱۹۵۸ء، ص ۱۸

۳۔ الإسلام و مستر سكوت، (اِسلام اور مسٹر سکاٹ)، ص ۶۳

۴۔ العقيدة والشريعة، وصفحات ۱۰۶، ۱۲۵

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی دو حصوں میں تقسیم کی بنیاد عدم تحفظ ہے۔ یہ تقسیم مذہبی اختلاف، اسلام اور کفر، کی بنیاد پر قائم نہیں بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق اس کا دار و مدار امن و سلامتی کی موجودگی، یا عدم موجودگی پر ہے۔ چناں چہ دارالحرب یا اجنبی ملک وہ ہے جو مملکت اِسلامیہ کے ساتھ امن و صلح کی حالت میں نہ ہو۔(۱) اور یہ ایک وقتی اور عارضی حالت ہے جو جنگ کی صورت میں قائم رہتی ہے اور جوں ہی جنگی صورتِ حال ختم ہو جائے تو یہ بھی ختم ہوجاتی ہے۔

اس تجزیے کے ساتھ بین الاقوامی قانون اور اسلامی قانون دونوں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ دنیا اپنی اصل کے لحاظ سے ایک ہی دار ہے اور یہ کہ جنگ ایک عارضی حالت ہوتی ہے جو دو ممالک میں عارضی طور پر حالتِ عداوت پیدا کرتی ہے، اور جونہی جنگ ختم ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی یہ حالت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ فقہاءِ اِسلام کی اصطلاح کے مطابق حربی کا لفظ ہمیشہ دشمن کا مترادف نہیں اور نہ ہی دارالحرب کے لیے ہمیشہ دارالاسلام کے ساتھ عداوت میں رہنا ضروری ہے بلکہ یہ عداوت جنگی صورتِ حال پیدا ہوجانے کی وجہ سے ایک عارضی دشمنی ہوتی ہے جو میدانِ جنگ اور لڑنے والے لوگوں تک محدود رہتی ہے۔

۱۔ السیاسۃ الشرعیۃ، پروفیسر عبدالوہاب خلاف، صفحات ۶۹، ۷۶

تیسری بحث

اِسلام میں خود مختاری کا تصور

خود مختاری کی قانونی اصطلاح

خود مختاری نسبتاً ایک جدید تصور ہے۔ سولہویں صدی عیسوی تک دنیا اس سے آشنا نہ تھی۔ خود مختاری چند ایسے امتیازات کا مجموعہ ہے جو کسی ریاست کے سیاسی اقتدار کے ساتھ خاص ہوتے ہیں۔ انہی کی بنا پر ریاست کا اقتدارِ اعلیٰ تشکیل پاتا ہے۔ شاید ان میں سے اہم ترین امتیاز اس قوتِ حاکمہ کے وہ اختیارات ہیں جن کی بدولت وہ یک طرفہ طور پر کچھ اِقدامات کے ذریعے اپنی مرضی دوسرے افراد اور اداروں پر نافذ کرسکتی ہے۔ اِس کے اِقدامات خود بخود نافذ العمل ہوجاتے ہیں اور رعایا کے قبول کرنے یا نہ کرنے پر اِن کا دار ومدار نہیں ہوتا۔ کسی ریاست کا روایتی معیار اس کی خود مختاری ہی ہوتی ہے جس کی بناپر اسے دیگر مجموعوں سے امتیازی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔

خود مختاری کی دو صورتیں یا دو پہلو ہیں:(۱)

پہلی صورت: خارجی خود مختاری ہے، اسی کو سیاسی خود مختاری بھی کہاجاسکتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ خارجی خود مختاری رکھنے والی کوئی ریاست کسی غیر ریاست کے تابع نہ ہو اور یہ کہ تمام خود مختار ریاستوں کو مساوی حیثیت حاصل ہو۔ بین الاقوامی تعلقات خود مختاری کی بنیاد پر ہی تشکیل پاتے ہیں۔ ریاست کے اِس پہلو کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے خارجہ امور کو چلانے اور دیگر تمام ریاستوں کے ساتھ تعلقات کی تشکیل و قیام میں آزاد ہو۔ جس ملک سے وہ معاہدہ کرنا چاہے اپنی مرضی سے کر سکے اور کسی کے ساتھ جنگ کا اِعلان کرنے یا غیر جانب دار رہنے میں بھی اسے پوری آزادی حاصل ہو۔

۱۔ النظم السیاسیة، ڈاکٹر ثروت بدوی ۱:۴۰، ۴۳، القانون الدولي، حافظ غانم، ص ۱۳، أحکام القانون الدولي في الشریعة الإسلامیة، ڈاکٹر حامد سلطان، ص ۹۸ وما بعد، ۱۲۴ ومابعد

خود مختاری کی **دوسری صورت** داخلی خود مختاری ہے۔ اسی کو نظام بھی کہا جاسکتا ہے۔ داخلی خود مختاری یا نظام کا مفہوم یہ ہے کہ ریاست کو اپنی جغرافیائی حدود کے اندر موجود تمام افراد اور اداروں پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہو اور اس کی مرضی ان سب کی مرضی سے بالا تر ہو۔ مطلب یہ کہ ریاست کو اپنی اراضی اور اپنے علاقے کی حدود میں مکمل اختیار حاصل ہو۔ خود مختاری کی اِس صورت کا تقاضا یہ ہے کہ افراد اور سرزمین پر ریاست ہی کی حکومت ہو۔

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ خود مختاری کے بغیر کسی ریاست کا وجود نہیں۔ جدید اصطلاح میں اِس لفظ کی جگہ استقلال اور آزادی نے لے لی ہے۔ جدید مفہوم کے لحاظ سے ریاستی خود مختاری کا تصورِ نسبتی بن گیا ہے، بایں طور کہ داخلی طور پر وہ قومی مفادِ عامہ کے تابع ہوگئی ہے اور بیرونی طور پر بین الاقوامی مفاد کے تابع۔

فرانسیسی انقلاب کے بعد اقتدار کا منبع عوام قرار پائے اور حکمران عوامی رائے کی نمائندگی کرنے لگے۔ وہ اب مقنّنہ اور عدلیہ کے توسط سے عوامی نگرانی میں رہتے ہیں کیوں کہ یہ ادارے عوامی یا قومی اقتدار کے اصول کا تحفظ کرتے ہیں۔

خود مختاری کے دونوں پہلو اسلام کی نظر میں

اوّل: خارجی خود مختاری

بین الاقوامی یا خارجی خود مختاری کا پہلو اِس اصول سے واضح ہوتا ہے جس کی تائید قرآنِ مجید نے کی ہے۔ اور وہ یہ کہ اِسلامی ریاست کو خود مختاری اور اس کے وقار کو مکمل طور پر تحفظ حاصل ہو۔ کوئی بھی دوسری ریاست اس کی خود مختاری کو نہ کم کرسکے اور نہ اس پر غلبہ پانے کی جرأت کرسکے۔(۱) ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا﴾ [النساء: ۱۴۱](اور اللہ کافروں کو مومنوں پر ہرگز غلبہ نہیں دے گا)۔اور ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ [المنافقون: ۸]

۱۔ بحث (الدولة الإسلامية) ڈاکٹر وھبۃ الزحیلی، الموسوعة الفقهية، الکویت، ص ۲۸

(حالاں کہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے)۔ عزت کا تقاضا یہ ہے کہ خود مختاری ہو، قوتِ مدافعت ہو اور دوسرے ممالک کا سامنا کرنے کی طاقت ہو۔

چناں چہ کسی دوسرے ملک کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اسلامی ریاست کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کرے۔ اور اِسلام میں یہ بات بھی بڑی نمایاں ہے کہ اس نے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کے معاملات میں حاکم کے تسلط اور رعایا کے مطیع ہونے کے تصور کو مسترد کردیا ہے۔ چناں چہ جہاں تک دینی امور کا تعلق ہے تو خالق اور مخلوق کے درمیان کسی مقتدر ہستی کا واسطہ نہیں رکھا گیا۔ مخلوق کسی دینی پیشوا کو واسطہ بنائے بغیر براہِ راست اپنے خالق کے ساتھ رابطہ کرسکتی ہے۔ اور ریاستی معاملات میں بھی حکومت عدل وانصاف، مشاورت اور مساوات کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے ۔(۱)

اسی طرح اسلامی ریاست دوسری ریاستوں کی خود مختاری میں دخل نہیں دیتی، اِلَّا یہ کہ کوئی معقول وجہ ہو، جیسے ظلم کا راستہ روکنے کے لیے یا اسلام جو کہ تمام انسانیت کے لیے خیر کا پیغام ہے، اس کی آزادانہ تبلیغ کو ممکن بنانے کے لیے جنگ چھڑ جائے ۔

دوم: داخلی خود مختاری

دارالاسلام کے اندر موجود تمام افراد اور اداروں پر ریاست کو مکمل بالادستی حاصل ہوتی ہے چناں چہ عوام پر شریعت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ریاست کی اطاعت فرض ہے۔(۲) حکمران بھی شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے امت مسلمہ کی نگرانی کے تحت رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ﴾ [النساء: ۵۹](اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں)۔

۱۔ أحكام القانون الدولي في الشريعة ، حامد سلطان، صفحات ۱۰۶، ۱۲۷ وما بعد

۲۔ الأحكام السلطانية ، الماوردي، ص ۱۵،الأحكام السلطانية، ابو يعلىٰ، صفحات ۸، ۳۰

بعض علماء کی رائے میں أولوالأمر سے مراد حکمران ہیں اور بعض کے نزدیک علماء ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق إنما الطاعة في المعروف (۱) (جن کاموں میں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہو ان میں مخلوق کی اطاعت نہیں۔ صرف بھلائی کے کاموں میں اطاعت ہے) اور من أطاعني فقد أطاع اللّٰہ، ومن عصاني فقد عصی اللّٰہ، ومن يطع أميري فقد اطاعني و من عصاني فقد يعصی اللّٰہ ومن يعصی أميری فقد عصاني۔ (۲) (جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ جس نے میرے مقرر کردہ اَمیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی)۔

بنابریں حاکم کی اطاعت شرعی حدود کے اندر داخل ہے۔ یہ اطاعت اس کی ذات کی نہیں ہوتی، بلکہ اِس کی اُس حیثیت کی ہوتی ہے جو اسے شرعی احکام کے نفاذ، شریعت کے ضوابط کے احترام، اس کی حدود کے نفاذ اور اس کے مقاصد کے حصول کے لیے ایک نمائندے کے طور پر حاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ اسلام میں اصل دارو مدار شریعتِ الٰہیہ کی حاکمیت پر ہوتا ہے جو وحی اِلٰہی سے ماخوذ ہے۔ اِس وحی اِلٰہی کی نمائندگی قرآن و سنت اور وہ دوسرے علومِ کرتے ہیں جن کی اَساس یہی سرچشمے ہیں جیسے معتبر فقہاء کا اجماع اور ان کے اِجتہادات جو وہ شرعی قواعد و ضوابط اور شریعت کی عمومی روح کے مطابق کرتے ہیں۔

۱۔ بخاریؒ، مسلمؒ، ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے اس حدیث کو حضرت علیؓ کے حوالے سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے: لاطاعة لأحد في معصية اللّٰہ، إنما الطاعة في المعروف (اللہ کی نافرمانی کر کے کسی کی اطاعت کرنا روا نہیں، اطاعت صرف بھلے کاموں میں کی جاسکتی ہے)۔ امام احمدؒ اور حاکمؒ نے عمران بن حصین اور حکم بن عمرو غفاری کے حوالے سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق (خالق کی نافرمانی کی صورت میں مخلوق کی اطاعت نہیں)۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

۲۔ احمدؒ، بخاریؒ، مسلمؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ بروایت ابوہریرہؓ۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

لہٰذا حاکم اور رعایا سب کے سب حکم شریعت کے پابند ہیں اور یہی ان تمام معاملات اور اِقدامات کا معیار ہے جنہیں ریاست بجالاتی ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس میں انسان کی آزادی کی مضبوط ترین ضمانت، اس کی عزت اور مفادات کا تحفظ اور اس کی صلاحیتوں اور کاروبارِ زندگی پر حکومت کی طرف سے زبر دستی اثر انداز نہ ہونے کی ضمانت پائی جاتی ہے۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ قرآنی آیات میں یہ بات تسلسل کے ساتھ دہرائی گئی ہے کہ احکام کی قانون سازی کا مکمل اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے ، اِرشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلاَّ لِلّٰهِ﴾ [یوسف: ۴۰، ۶۷] (فرماں روائی اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے)، ﴿اِنَّ الاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ [آل عمران: ۱۵۴] (بے شک سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں) اور ﴿فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرُ﴾ [غافر: ۱۲] (تو حکم اللہ بزرگ و برتر ہی کا ہے)، ﴿وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِيْنَ﴾ [الأعراف: ۸۷، یونس: ۱۰۹، یوسف: ۸۰] (اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے)، ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ عَمَّا جَاءكَ مِنَ الْحَقِّ﴾ [المائدة: ۴۸] (اور ہم نے تمہاری طرف سچی کتاب اتاری، اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتی ہے اور ان پر محافظ و گواہ۔ تو ان میں فیصلہ کرو اللہ کے اتارے ہوئے سے۔ اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا، اپنے پاس آیا ہوا حق چھوڑ کر)، ﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ، وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ [المائدة: ۵۰] (تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالاں کہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں)،﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ [المائدة: ۴۴] (جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی ظالم ہیں) اور ﴿فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ﴾ [المائدة:۴۵](وہی کافر ہیں)، اور﴿فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ [المائدة:۴۷](وہی فاسق ہیں)، اور ﴿وَأَنِ

احْكُمْ بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاء هُمْ﴾ [المائدة: ۴۹] (تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اوران کی خواہشات کی پیروی نہ کرو)

اِسلام میں حاکم کے اختیارات اللہ تعالیٰ سے حاصل کردہ نہیں ہوتے بلکہ یہ عوام کی طرف سے اسے ملتے ہیں جو اسے منتخب کرتے ہیں۔ لہذا عوام کو اپنے حکمرانوں کے اعمال و تصرفات پر نظر رکھنے کا حق ہوتا ہے۔ اگر حکمران شریعت کے ان قطعی اصولوں سے انحراف کریں جن کی مخالفت سے ایک انسان کافر ہو جاتا ہے تو عوام کو ایسے حکمران کو ہٹانے کا حق حاصل ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: إلاَّ أن تروا كفراً بُواحا عندكم مِنَ اللّٰه فيه برهان ۔(۱) (سوائے اس کے ان میں کھلا کفر دکھائی دے اور تمہیں قرآن و سنت سے کوئی دلیل ملی ہو)

ریاست کی حاکمیت حکمران کی ذات اور شخصیت سے وابستہ نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کی نمائندہ صفت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ چناں چہ اگر حکمران فوت ہو جائے یا معزول ہو جائے یا مستعفی ہو جائے تب بھی ریاست کا داخلی اور خارجی نظام جاری، ساری اور نافذ العمل رہتا ہے۔ داخلی نظام کی مثال یہ ہے کہ حاکم کی عدم موجودگی میں بھی ملازمین کی تقرری وغیرہ کا کام جاری رہتا ہے اور خارجی کی مثال یہ ہے کہ دوسرے ملک کے ساتھ کیے گئے معاہدے نافذ العمل رہتے ہیں۔

اسلامی ریاست کی حاکمیت اس کی تمام جغرافیائی حدود اور اس کے تمام باشندگان کو شامل ہوتی ہے چاہے وہ مسلمان ہوں یا اہل ذمہ یا امان حاصل کرنے والے لوگ۔ نیز یہ حکم جدید تصورات کی روشنی میں اِس ریاست کے تمام فضائی علاقے کو بھی محیط ہوتا ہے اور سمندری علاقے کو بھی۔ چناں چہ جب سمندر کا کچھ علاقہ اسلامی ریاست کی حدود کے اندر آتا ہو تو وہ مسلم ریاست ہی کے تابع ہوگا، آزاد سمندر شمار نہیں ہوگا، جیسے کہ خلیجِ عربی ہے۔

۱۔ بخاری، مسلم، احمد

دارالاسلام میں مسلمانوں اور غیرمسلموں سب پر لازماً اسلامی قانون نافذ ہوگا۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ غیرمسلم شادی بیاہ کے مسائل میں اپنے مذہب کے مطابق عمل کریں۔ ان کی دلیل یہ شرعی اصول ہے: ''ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ غیرمسلموں کو اپنے مذاہب کے مطابق رہنے دیں''۔ مصر میں ۱۹۵۶ء میں عدالتی نظام کو یکجا کرنے سے پہلے اسی اصول پر عمل ہوتا رہا، چناں چہ ملی کونسلوں کو اہل ذمہ کے شخصی مسائل کے فیصلے ان کے اپنے نظام کے مطابق کرنے کا اختیار حاصل تھا البتہ وراثت، وصیت، وقف اور مالی نگرانی کے مسائل میں یہ کونسلیں خود مختار نہیں تھیں۔ شخصی مسائل کا فیصلہ بھی اس صورت میں کونسلیں کرتی تھیں جب مقدمے کے فریقین ایک ہی مذہب اور ایک ہی فرقے سے تعلق رکھتے ہوتے۔ اگر فریقین کا مذہب یا فرقہ الگ الگ ہوتا تو پھر اسلامی عدالتوں کو ہی فیصلے کا اختیار حاصل تھا۔(۱)

جمہور مسلم علماء کے نزدیک مسلمہ اصول یہ ہے کہ مشرق و مغرب میں تمام اِسلامی ممالک کی سیاسی حاکمیت ایک ہی ہے، کیوں کہ اسلام وحدت کا دین ہے اور تمام مسلمان ایک ہی امت ہیں۔ اِن کا رہبر باہمی تعاون اور اتفاق ہے اور ان کا دشمن تفرقہ اور اختلاف ہے۔(۲)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً﴾ [الأنبياء: ۹۲] (بے شک تمہاری یہ امت ایک ہی امت ہے) اور ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ [الحُجرات: ۱۰] (مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں)۔ اس بناء پر دارالاسلام میں دو یا زیادہ ریاستوں کی تشکیل جائز نہیں۔(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخر منهما۔ (جب دو خلفاء کی بیعت کرلی جائے تو بعد میں بیعت

۱۔ أحكام الذميين والمستأمنين، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، ص ۵۸۷-۶۲۱

۲۔ الأحكام السلطانية، الماوردي، ص ۷، الأحكام السلطانية، ابویعلیٰ، ص ۹

۳۔ الدولة الإسلامية، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، ص ۳۱ وما بعد

لینے والے خلیفہ کو قتل کر دو)۔ نیز آپ ؐ کا ارشاد ہے: من أتاكم و أمركم جميع على رجل واحد، يريد أن يشق عصاكم أويفرق جماعتكم فاقتلوه ۔(۱) (جب تم کسی ایک شخص کی حکمرانی پر متفق ہو اور کوئی شخص آ کر تم میں انتشار اور افتراق پیدا کرنا چاہے تو تم اسے مار ڈالو)۔

البتہ شیعہ امامیہ، زیدیہ، بعض فقہاء جن میں امام الحرمین بھی شامل ہیں، اور بعض معتزلہ جیسے جاحظ وغیرہ کے نزدیک متعدد مسلم ممالک کا قیام اس وقت جائز ہوگا جب ان ممالک میں بہت زیادہ فاصلہ ہو۔(۲)

اسلامی ریاست کے انتظامی محکمہ جات

اسلامی ریاست کے انتظامی محکمہ جات دینی اور دنیاوی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہوتے ہیں کیوں کہ حاکمیت یا خلافت کا تقرر دین کے تحفظ اور نظمِ دنیا دونوں کے بارے میں نبوت کے قائم مقام کے طور پر ہوا ہے۔(۳)

اسلامی ریاست کے دائرے میں خود مختاری کے حوالے سے یہ ایک سرسری جائزہ ہے۔ اِس کی بناء پر اور گزشتہ صفحات میں بیان کی گئی اس تفصیل کی بناء پر کہ اصولاً غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات امن و سلامتی پر قائم ہیں، نیز دنیا کو دو داروں میں تقسیم کرنے کا جو تذکرہ رہا اس کی روشنی میں درج ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ (۴)

اوّل: دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی بنیاد پر اسلام کے بین الاقوامی نظام کی تشکیل کا نظریہ مسلمان مجتہدین کی ایجاد ہے۔ اخلاقی بلندی اور اس کے نفاذ کے نتیجے میں متوقع عملی نتائج کے اعتبار سے یہ ایک ممتاز فلسفیانہ نظریہ ہے۔ اس لیے کہ اسلام جس اعلیٰ مقصد

۱۔ مسلم، بروایت عرفجہؓ

۲۔ الدولة الإسلامية، ص ۳۲، النظريات السياسية، ڈاکٹر ضیاء الدین الریس، ص ۱۹۷

۳۔ الأحكام السلطانية، الماوردی، صفحات ۳-۱۴، الأحكام السلطانية، ابو یعلیٰ، ص ۱۱ ومابعد

۴۔ أحكام القانون الدولي......، حامد سلطان، صفحات ۱۱۶، ۱۲۸، ۱۳۷، ۱۴۲، ۱۵۶، ۱۶۴ وما بعد

کو حاصل کرنا چاہتا ہے وہ امن و سلامتی ہے اور وہ ایک انسانی اور اخلاقی اصول ہے۔ اِن مجتہدین کی رائے میں اس مقصد کے حصول کا ایک ہی طریقہ تھا، اور وہ یہ کہ پوری آباد دنیا پر اسلامی احکام کا غلبہ ہو۔ یہ نظریہ عالمی حکومت کے جدید بین الاقوامی نقطۂ نظر سے ملتاہے۔ ماضی میں مسلمان فقہاء کی نظر میں عالمی حکومت سے مراد ایسی اسلامی حکومت تھی جو حسنِ اَخلاق،احترام انسانیت، انسانی بھائی چارے، حق و انصاف، اعلیٰ اقدار کی روشنی میں معاملہ بالمثل اور ایفاءِ عہد کی بنیادوں پر پوری دنیا پر حکمرانی کرے، اگرچہ مخالفین جنگ کرنے والے اور جارحیت کے مرتکب ہی ہوں۔(۱)

دوم:　اس میں کسی طرح کے شک کی گنجائش نہیں کہ خود مختاری اور نظم بین الاقوام کے میدان میں اسلام ایک قائدانہ اور مجددانہ مقام رکھتا ہے، خصوصاً اس صورتِ حال میں جب ہم ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کریں جو ظہورِ اسلام کے وقت موجود تھے۔

سوم:　اسلامی ریاست کی حدود میں تمام دینی اور دنیاوی معاملات میں حکمرانوں اور عوام کا باہمی تعلق حق و انصاف پر ہی مبنی رہتا ہے۔ اِس کے علاوہ اِسلام نے حاکم کے تسلط اور رعایا کے مطیع ہونے کا تصور مسترد کردیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تاریخ میں کبھی بھی دینی اور دنیاوی مقتدر قوتوں میں ایسا خونیں معرکہ نمودار نہیں ہوا جو دیگر غیراسلامی نظاموں میں پیش آیا ہے۔ جو انسانیت کی تاریخ کی ابتداء سے لے کر آج تک تمام انسانی معاشروں میں واقع ہوتا رہا اور ابھی تک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام نے حاکم کے تسلط کی نفی کرکے اس طرح کی آویزش کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام میں حکومت یا امامت دینی اور دنیاوی امور میں یکساں قیادت کا درجہ رکھتی ہے۔ تاہم خلیفہ یا حکمران کو کوئی الٰہی تعلق حاصل نہیں ہوتا ، نہ ہی وہ اقتدار کو براہِ راست اللہ تعالیٰ سے حاصل کرتا ہے۔ وہ مسلمانوں میں سے ہی ایک فرد ہوتا ہے جسے ان کی بیعت کے نتیجے میں حق حکمرانی حاصل ہوتا ہے،

۱۔　أحکام القانون الدولي في الشریعة ، حامد سلطان، ص ۷۲

اور اسی ذریعے سے ان پر اس کی فرماں برداری اور اطاعت لازم ہوتی ہے، جبکہ وہ ان کے مفادات کے تحفظ کا پابند ہوتا ہے۔اس کی حکمرانی قرآن و سنت کے نظام کی پابند رہتی ہے۔ اسلام نے حاکم کے تسلط اور رعایا کی محکومیت کی جگہ عدل و انصاف، مشاورت اور مساوات کا تصور پیش کیا ہے جو حکمرانی کی عمدہ ترین بنیادیں ہیں۔

خلیفہ کا انتخاب

اربابِ حل وعقد کی بیعت کے ساتھ خلیفہ کا انتخاب مکمل طور پر جمہوریت کی بنیاد ہے۔ خلفاء راشدین کا انتخاب جمہوری اور شورائی نظام کا مجموعہ تھا۔ایک خلیفہ کی طرف سے اپنے بعد خلیفہ کی نامزدگی اور ولی عہد ی کے لیے بھی درحقیقت اربابِ حل وعقد کی بیعت درکار ہوتی ہے۔چناں چہ اصل دار ومدار ان کی بیعت ہی پر ہوتا ہے، صرف ولی عہد بنانا اور خلیفہ مقرر کرنا کافی نہیں ہوتا۔

اسلامی ریاست میں شورائی حکومت پر لازم ہوتا ہے کہ وہ عوام کو بنیادی آزادیاں فراہم کرے اور ان کے تمام انسانی حقوق کا تحفظ کرے جن کی بدولت شہریوں کا مقامِ انسانیت اور عزت و احترام محفوظ رہے۔ زندہ رہنے کا حق، امن و سلامتی کا حق، خاندانی نظام کا احترام، آزادیٔ فکر، حریت اجتماع، مذہبی آزادی، رائے کی آزادی اور قومی،نسلی اور لسانی بنیاد پر عدمِ امتیاز ان حقوق کی چند مثالیں ہیں۔

قانون سازی کا اختیار

اسلامی مملکت میں قانون سازی کا اختیار اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہوتا ہے۔ مجتہدین اور فقہاء، قرآن و سنت کے نصوص کی تشریح کرتے ہیں اور ان نصوص پر قیاس کر کے پیش آنے والے جدید مسائل کا اسلامی تعلیمات کی روح کے مطابق حکم تلاش کرتے ہیں۔ عدالتی نظام کو عادل قاضی چلاتے ہیں اور قانون نافذ کرنے کی ذمہ داری سربراہِ مملکت سمیت شہروں کے افسرانِ مجاز، قائدینِ افواج، منصب دارانِ مالیات ، پولیس اہل کار، اور جملہ کارپردازان و ملازمینِ ریاست پوری کرتے ہیں۔

چہارم: اسلامی ریاست دراصل اس بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ وہاں مسلمانوں کا معاشرہ ایک ایسا بہترین معاشرہ ہو جس میں انصاف، مساوات، شورائیت، اخلاق اور معاملہ بالمثل (جیسا کرو ویسا بھرو) کی بنیاد پر معاملات انجام پاتے ہوں۔ ان معاملات میں وضع داری اور تقویٰ کو ملحوظ رکھا جاتا ہو، نہ صرف مسلمانوں کے بارے میں بلکہ غیرمسلموں کے بارے میں بھی۔ اسلام میں تمام انسانی تعلقات انصاف کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اور تمام انسانوں کو برابر تصور کیا جاتا ہے۔ قانون کے سامنے کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہوتی۔ ہاں عمل اور اس کی سزا یا جزا کے لحاظ سے فرق ضرور ہوتا ہے۔ عمل اچھا ہوگا تو صلہ اچھا ہوگا اور عمل برا ہوگا تو صلہ بھی برا ہو گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ ۚ ٱعْدِلُوا۟ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ [المائدة: ۸] (اور تم کو کسی قوم سے بغض و عداوت اس پر نہ ابھارے کہ انصاف نہ کرو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے)، نیز ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُ بِٱلْعَدْلِ وَٱلْإِحْسَٰنِ﴾ [النحل: ۹۰] (بے شک اللہ انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے)۔ اسلامی ریاست میں غیرمسلموں کے ساتھ منصفانہ قانون کی بنیاد پر افراد اور احزاب میں فرق کیے بغیر معاملات نبھائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے: عامل الناس بما تحب ان يعاملوك به ۔(۱) (تم لوگوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرو جیسا سلوک تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ کریں)۔

اسلامی ریاست ایک متحدہ ریاست ہوتی ہے جو اسلامی اخوت کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور یوں یہ وفاقی یا فیڈرل ریاست کی اولین مثال ہے۔ جبکہ غیراسلامی دنیا میں ایسی ریاست صرف دو سو سال پہلے وجود میں آئی، اور وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہے۔ اسلامی ریاست کبھی بھی مختلف قومیتوں میں امتیاز نہیں کرتی، نہ ہی قومیت کی بنیاد پر لوگوں میں کسی طرح کا فرق روا رکھتی ہے جب تک کہ ان میں مسلمان ہونے کی شرط پائی جائے۔ اسی طرح اس کے مختلف اجزاء کے درمیان سیاسی حدود کا فاصلہ نہیں ہوتا، کیوں کہ سارے مسلمان ایک ہی امت ہیں۔

۱۔ اس روایت کے لیے ملاحظہ ہو: شرح السیر الکبیر، ڈاکٹر محمد ابوزہرہ، ص ۴۴

آج کی اسلامی ریاستیں، جن کی تعداد تقریباً چالیس خودمختار ریاستوں تک پہنچتی ہے۔ ان ریاستوں نے ۱۹۶۹ء میں مسجد اقصیٰ کو جان بوجھ کر آگ لگائے جانے کے بارے میں رباط میں ایک کانفرنس بھی منعقد کی، مگر اس کانفرنس میں اس باوقار معاشرے کی جھلک نظر نہیں آتی جس کے احکام قرآن وسنت نے بیان کیے ہیں۔ ان ریاستوں کے درمیان نہ تو اسلامی اخوت کا تعلق ہے، نہ ان میں سیاسی اور اقتصادی تعاون پایا جاتا ہے اور نہ ہی ان میں کسی قسم کی کوئی قانونی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی یا لسانی حدمشترک ہے۔ ان کے حکومتی نظام بھی مختلف ہیں کہیں بادشاہت ہے اور کہیں جمہوریت۔اسی طرح حکومت بھی کہیں آمریت ہے کہیں صدارتی اور دستوری نظام ہے اور کہیں پارلیمانی نظام ہے اور کہیں غیرپارلیمانی نظام۔ اسلامی دنیا میں سیاسی، معاشرتی، معاشی، ثقافتی اور سائنسی پس ماندگی جاری ہے اور اس وقت جبکہ دیگر ممالک اتحاد اور یک جہتی کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں، مسلم ریاستوں نے، اس کے برعکس، اتفاق و یکجہتی سے آنکھیں بند رکھی ہوئی ہیں حالاں کہ اسلام نے انہیں ایک بنا دیا تھا اور انہیں ایک ہی حکومت کے تحت کس دیا تھا۔

پنجم: وہ بنیادی تصور جس پر اسلامی ریاست قائم ہوئی تھی، اسی کی طرف آج بین الاقوامی نظام آہستہ آہستہ مگر ثابت قدمی سے بڑھ رہا ہے۔ یہ تصور اِسلامی اخوت کی بنیاد پر متحدہ دار الاسلام کی تشکیل کا تصور ہے۔ اِس وقت روس اور امریکہ دنیا کی دو بڑی طاقتیں ہیں، وہ معاشرتی لحاظ سے بڑی حد تک اس بنیاد پر قائم ہیں جس پر متحدہ مسلم حکومت قائم تھی۔ چناں چہ امریکہ مختلف اصلیتیں رکھنے والی پچاس ریاستوں کا اتحاد ہے، جن کے باشندوں کے رنگ بھی مختلف ہیں اور عقائد بھی۔ اس کے باوجود امریکا کے بطورِ ایک ریاست متحد ہونے، اس کے باشندوں کے مشترکہ مفادات اور ایک شہریت کی بنا پر قائم اخوت نے سب کو مربوط رکھا ہے۔ اسی طرح سویت یونین سولہ جمہوریاؤں پر مشتمل ہے، جن میں سو سے زائد مختلف قومیتیں ہیں، لیکن اس کے باوجود معاشرتی ہم خیالی نے انہیں ایک برادری بنا رکھا ہے اور ملک کے ایک سیاسی نظام نے انہیں باہم مربوط کیا ہوا ہے۔ یورپی ممالک بھی ان دو بڑی طاقتوں کے مقابلے میں اسی رخ پر چل رہے ہیں،

جیسا کہ یورپی مشترکہ منڈی اور آزاد تجارتی علاقے کی صورت میں نظر آ رہا ہے۔

مسلم فقہاء نے اسلامی اخوت کی بنیاد پر دنیا کو جس طرح دارالاسلام، دارالحرب اور دارالعہد میں تقسیم کیا ہوا تھا، وہ تقسیم اب موجود نہیں رہی۔

ششم: اسلام کی امن وسلامتی کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اور غیر اسلامی ممالک کی خود مختاری کا احترام کرتے ہوئے اسلامی ریاست اپنے مختلف تاریخی مراحل میں درج ذیل تین باتوں سے باز رہی ہے:

اسلامی ریاست نے کبھی بھی مغربی عیسائی ریاستوں پر اس طرح کا جارحانہ ہلہ نہیں بولا جس طرح یورپی عیسائی مملکتوں نے صلیبی جنگوں میں پوری تین صدیوں تک اِسلامی ریاست پر عیسائی مقدس مقامات کی حمایت کی آڑ میں حملے جاری رکھے۔ صلیبی افواج سے منسلک ہونے کی وجہ سے ہی یورپ میں شرفاء کا طبقہ وجود میں آیا جنہیں القابِ شرف (نوبل میڈل) سے نوازا گیا جسے وہ آج تک دِل وجان سے لگائے بیٹھے ہیں۔ عیسائیوں نے پہلی بار مسلمانوں کے توسط سے یہ سیکھا کہ انسانیت کی کچھ حدود ہیں جو جنگ میں سنگ دلی کا مظاہرہ کرنے سے روکتی ہیں جنہیں آج کل ضوابطِ شہسواری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اِسلامی ریاست نے کبھی بھی ایسی جنگ میں حصہ نہیں لیا جو طاقت کے توازن کو قائم رکھنے کے معروف اصول پر لڑی گئی ہو۔ یہ وہی اصول ہے جس پر یورپی عیسائی ممالک کے باہمی تعلقات قائم ہیں۔ جب سے یہ ممالک مقدس جرمانی رومن ایمپائر سے آزاد ہوئے ہیں، اس وقت سے آج تک وہ اسی اصول پر قائم ہیں۔

خلافتِ عثمانیہ کی ایک مثال کو چھوڑ کر اِسلامی ریاست نے اپنی تاریخ کے کسی بھی مرحلے پر، قوموں کے استحصال یا استعمار کی نیت سے، کوئی جنگ نہیں لڑی اور نہ ہی اِس نے کسی طرح کے نسلی امتیاز کی بنیاد پر کوئی نظام حکومت قائم کیا ہے۔

بلاشبہ اِن سب خوبیوں کا سہرا اِسلام کے جامع احکام کے سر ہے جن کی وجہ سے اسلامی ریاست ان مذکورہ چیزوں سے اجتناب کرتی رہی، جن کے نتائج خطرناک واقع ہوتے ہیں اور انسانی تہذیب پر ان کے بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اسلامی فتوحات کے اہداف

ریاستی خود مختاری کے بارے میں گفتگو کے حوالے سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اسلامی فتوحات کے اہداف کیا تھے، حالاں کہ گزشتہ صفحات میں اس سوال کے جواب کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔

اِسلامی جہاد کا مقصد یہ نہیں تھا کہ جنگ کے ذریعے سے مال اور غنیمت حاصل کیا جائے۔ بلکہ، جیسا کہ فقہاء نے کہا ہے، جہاد کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ کا دین غالب ہو اور دین اسلام کی مدافعت کی جائے۔ البتہ اس کے ضمن میں جو اموال غنیمت حاصل ہوتے ہیں وہ اس کے ضمنی فوائد ہیں۔(۱) چناں چہ مسلمانوں نے کبھی بھی دنیاوی مفاد کے لیے جنگ نہیں لڑی اور نہ ہی انہوں نے وسائلِ دولت رکھنے والے علاقوں اور عالمی منڈیوں پر قبضہ جمانے کے لیے اقتصادی جنگیں مسلط کی ہیں جیسا کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران ہوا۔ نہ ہی مسلمانوں نے مادی لالچ کے تحت یا توسیع پسندانہ رجحانات کے تحت یا قومی برتری کا مظاہرہ کرنے کے لیے کبھی کوئی جنگ لڑی جبکہ اکثر جدید جنگیں انہی مقاصد کے لیے لڑی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّهِ فَتَبَيَّنُواْ وَلاَ تَقُولُواْ لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلاَمَ لَسْتَ مُؤْمِناً تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِندَ اللّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ﴾ [النساء: ۹۴] (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمہاری طرف سلام سے تقدیم کرے اسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے۔ تم جیتی دنیا کا اسباب چاہتے ہو تو اللہ کے پاس بہتیری غنیمتیں ہیں)۔

اسلام کی یہ شان نہیں کہ بہانے سے ذریعے کو مقصود بنا لے اور اِس طریقے سے منحوس اِستعمار کی تائید کرے، یا دنیاوی اغراض کی خاطر اپنے پنجے گاڑ لے، یا لوٹ مار، استحصال اور تباہ کاری اور موقع پرستی کی حوصلہ افزائی کرے۔ اس لیے کہ یہ چیزیں

۱۔ فتح القدير ۴:۲۸۶۔ المنهج، بجیرمی ۴:۲۴۰، الأحكام السلطانية، الماوردي، ص۴۱

نص قرآنی کی رو سے حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ [القصص: ۸۳](وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے)۔ فتح کا مقصد متعین کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾ [الحج: ۴۱](یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں دسترس دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے)۔

ابوسفیان کا جو قافلہ شام سے آ رہا تھا اور مسلمانوں نے اس کا راستہ روکا تھا تو وہ اس لیے جائز تھا کہ اس وقت جنگی صورت حال موجود تھی۔ یہ ایک معاشی محاصرہ تھا جو آج تک جائز ہے۔ مسلمان اس نیت سے قریش کے اموال لینا چاہتے تھے کہ قریش نے مکہ میں ان کے اموال پر ہجرت کے بعد قبضہ کر لیا تھا۔ گویا یہ اس کا بدلہ تھا۔(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَلَمَنْ انْتَصَر بَعْدَ ظُلْمِه فَاُولٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ﴾ [الشوریٰ: ۴۱](اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان پر کوئی ملامت نہیں)۔

فتوحات سے اسلام کا مقصد مالی فوائد سمیٹنا نہیں، اس کا ثبوت یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک گورنر سے کہا:ان اللّٰہ بعث محمدا بالحق هاديا ولم يبعثه جابيا (۲) (اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دینے کے لیے بھیجا ہے، مال وصول کرنے کے لیے نہیں)۔ مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض ہدایت تھی، مال کی وصولی نہیں، اس کا مقصود مساوات کا قیام تھا، غلبہ اور تسلط قائم کرنا نہیں۔

۱۔ آثار الحرب، ص ۵۵۰-۵۵۲، ۷۴۰

۲۔ طبقات ابن سعد ۵: ۲۰۳

اسی طرح حضرت علیؓ نے اشتر نخعیؒ کو ہدایت دی:

ولیکن نظرك فی عمارة الارض ابلغ من نظرك فی استجلاب الخراج لان ذلك لایدرك الا بالعمارة ومن طلب الخراج بغیر عمارة اخرب البلاد واهلك العباد ولم یستقم امره الا قلیلا(۱)

تیری نظر خراج اکٹھا کرنے سے بڑھ کر زمین کی آبادکاری پر رہنی چاہیے کیوں کہ مال تب حاصل ہوگا جب زمین آباد ہوگی۔ جو زمین کی آبادکاری کے بغیر خراج لے گا وہ علاقے کو برباد کر دے گا اور انسانوں کو ہلاک کر دے گا اور اس کی حکومت تھوڑے عرصے تک ہی قائم رہ سکے گی۔

اسی طرح سعد بن وقاصؓ نے ایران کی طرف ربعی بن عامر کو بھیجا تو انہوں نے جنگ قادسیہ سے ذرا پہلے ایرانی قائد، رستم، سے کہا:انا لم نأتکم لطلب الدنیا، وَاللّٰهِ لا سلامکم أحب إلینا من غنائمکم۔(ہم تمہارے پاس اس لیے نہیں آئے کہ دنیاوی مفادات حاصل کریں۔ اللہ کی قسم تمہارا مسلمان ہونا ہمیں تمہارے اموال سے زیادہ پسند ہے)۔ اسی طرح حضرت عبادۃ بن الصامتؓ نے مقوقس [حاکم مصر] سے کہا تھا:

إنما رغبتنا و همتنا في اللّٰه و اتباع رضوانه، ولیس غزونا لعدونا ممن حارب اللّٰه لرغبة في دنیا، ولا طلب للاستکثار منها، لأن غایة أحدنا من الدنیا أکلة یأکلها، یَسُدُّ بها جوعه للیله و نهاره، و شملة یلتحفها...... لأن نعیم الدنیا لیس بنعیم و رخاء ها لیس برخاء، إنما النعیم وَالرخاء في الآخرة ۔(۲)

۱۔ نهج البلاغة ۲:۱۲۸

۲۔ النجوم الزاهرة ۱:۱۰-۱۲، حسن المحاضرة ۱:۱۰۹-۱۱۴

ہماری خواہش اور غرض یہ ہے کہ اللہ راضی ہو جائے۔ ہم ان لوگوں کی طرح دشمن پر حملہ کرنے والے نہیں جن کا مقصد دنیا کمانا ہو یا زیادہ مال بنانا ہو۔ اس لیے کہ دنیا سے ہماری غرض صرف وہ لقمہ ہے جو کھا لیا جائے اور ایک رات یا ایک دن کے لیے بھوک مٹ جائے اور اس قدر کپڑا ہے جس سے جسم ڈھانپ لیا جائے، کیوں کہ دنیا کی نعمتیں حقیقی نعمتیں نہیں ہیں اور اس کی خوشحالی حقیقی خوشحالی نہیں ہے بلکہ اصل خوشحالی اور اصل نعمتیں وہی ہیں جو آخرت میں ملیں گی۔

لہذا اسلامی فتوحات کا ہدف یہ نہیں کہ معاشی مفادات کی خاطر دوسرے علاقے دارالاسلام میں شامل کر لیے جائیں۔ بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ جارحیت کا راستہ روک کر لوگوں کو پیغامِ اسلام قبول کرنے کا موقع فراہم کیا جائے جیسا کہ ایران اور روم سے جنگ میں تھا۔ یا رومیوں کو گھیرے میں لینے کا مقصد ان کے مظالم سے کمزوروں کو چھڑانا تھا، جیسا کہ مصر اور شمالی افریقہ کی جنگوں میں ہوا۔ یزد جر کی مجلس میں ربعیؓ نے کہا تھا:

اللّٰه ابتعثنا لنخرج العباد من عبادة العباد إلى عبادة اللّٰه وحده، ومن ضيق الدنيا إلى سعتها ومن جور الأديان إلى عدل الإسلام ۔ (١)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی کرنے کی آزادی دلائیں، انہیں دنیا کی گھٹن سے نکال کر کشائش کی طرف اور دیگر نظاموں کے مظالم سے چھڑا کر اسلامی انصاف کی طرف لے جائیں۔

١۔ البداية والنهاية ٧: ٣٩

چوتھی بحث:

اِسلام اور معاہدات

اس موضوع کی اہمیت

بین الاقوامی عدالت انصاف کے بنیادی ضابطے کی دفعہ ۳۸ میں بین الاقوامی قانون کے عمومی مآخذ کا تعین کیا گیا ہے اور اِس عدالت کے ضابطے کو اقوام متحدہ کے چارٹر کا ضمیمہ بنا دیا گیا ہے۔ پھر جن ممالک نے اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر دستخط کیے تھے وہ سب کے سب اِس ضابطے کے ساتھ بھی منسلک ہوگئے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے اصل مصادر و مآخذ کو یہ دفعہ اس طرح بیان کرتی ہے:

اوّل: بین الاقوامی عمومی اور خصوصی معاہدات جن میں واضح طور پر متنازع فریقین کی طرف سے متفقہ قواعد و ضوابط بنائے گئے ہوں۔

دوم: بین الاقوامی سطح پر معتبر رواجات جنہیں دنیا میں لوگ قانون اور ضوابط کے طور پر استعمال کرتے چلے آ رہے ہوں۔

سوم: عمومی اصولِ قانون جنہیں اقوام متحدہ کی طرف سے برقرار رکھا گیا۔ (۱)

اِسلام اپنے بین الاقوامی تعلقات کے قواعد ان عمومی انسانی اصولوں سے اخذ کرتا ہے جو امن اور جنگ کے حالات میں معتبر سمجھے جاتے ہیں، جیسے عدل ، آزادی، احترامِ انسانیت، وعدہ وفائی، معاملہ بالمثل (جیسی کرنی ویسی بھرنی)، وضع داری، تقویٰ ، اِنسانی تعاون اور اسی طرح کے دیگر اصول جنہیں قرآن و سنت میں برقرار رکھا گیا ہے۔

نیز اسلام اپنے قواعد، معاشرے میں رائج صحیح عرف سے حاصل کرتا ہے اور ان معاہدات بھی جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان طے پائے ہوں، جیسے وہ

۱۔ مبادئ القانون الدولي العام ، ڈاکٹر حافظ غانم، ص ۱۰۲

معاہدات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے، حضراتِ خلفاء نے اور مسلم امراء نے امان، ذمے یا صلح کے سلسلے میں غیر مسلموں کے ساتھ کیے تھے۔

معاہدات کا جواز

نصوصِ شریعت سے جنگ اور امن دونوں حالتوں میں دشمن کے ساتھ معاہدات کرنے کا جواز ثابت ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ﴾ [النساء: ۹۰](سوائے ان لوگوں کے جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے)، اور ﴿إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ﴾ [التوبة: ۷](ہاں، جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا ہے، تو جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تو تم بھی اپنے قول و قرار پر قائم رہو)، اور ﴿وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ [الأنفال: ۶۱] (اور وہ لوگ صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو)، اور ﴿وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ﴾ [الأنفال: ۷۲] (اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو)، اور ﴿لَّا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ [الممتحنة: ۸](اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)، اور ﴿إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ [التوبة: ۴] (سوائے ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے، پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو، کیوں کہ اللہ متقی لوگوں ہی کو پسند کرتا ہے)۔

یہ تمام آیات معاہدات کے تقدس اور پاسداری پر دلالت کرتی ہیں۔ اس مفہوم کی تائید سنت نبویہ سے بھی ہوتی ہے۔ چناں چہ عارضی صلح کے حوالے سے یہ حدیث جسے ابوداؤد نے قبیلۂ جُہینہ کے ایک صحابی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:لعلکم تقاتلون قوما فتظهرون عليهم فيتقونكم بأموالهم دون أنفسهم و ذراريهم، فيصالحونكم على صلح فلا تصيبوا منهم فوق ذلك فانه لا يصلح لكم ۔(شاید تم کسی گروہ سے جنگ کرو اور ان پر غلبہ پالو، پھر وہ تمہیں مال دے کر اپنی جانوں اور اہل خانہ کو بچانا چاہیں اور تم سے کچھ شرائط پر صلح کر لیں تو تم اُس سے بڑھ کر ان سے کچھ نہ لینا کیوں کہ وہ تمہارے لیے جائز نہ ہوگا)۔ اسی طرح صلح حدیبیہ سے ذرا پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَالذي نفسي بيده لايسألوني خُطة يعظمون فيها حرمات اللّٰه إلا أعطيتهم إياها ۔(۱)(اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہ لوگ مجھ سے کسی بھی ایسے لائحۂ عمل کا مطالبہ کریں جس میں یہ شعائر اللہ کی تعظیم کا وعدہ کریں تو میں اسے منظور کر لوں گا)۔

اسی طرح دائمی اور مستقل صلح کے بارے میں امام ابو داؤدؒ اور بیہقیؒ دونوں نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ألآ مَن ظلم معاهدا أو انتقصه أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئا بغير طِيب نفس فأنا حجيجه يوم القيامة۔(سن رکھو جو کوئی کسی معاہدے والے شخص پر زیادتی کرے گا یا اس کی حق تلفی کرے گا یا اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ اس پر ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف لے گا تو قیامت کے دن میں اس کا وکیل اور حامی ہوں گا)۔ خطیب بغدادیؒ نے اپنی کتاب تاریخ بغداد میں حضرت انسؓ کے حوالے سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ نیل الأوطار ۸:۳۱

من آذیٰ ذمیا فأنا خصمه، ومَن کنتُ خصمه خصمته یوم القیامة (جس نے کسی ذمی کو اذیت دی، تو اس کے مقابلے میں میں جرح کروں گا ، اور میں جس کا مد مقابل ہوا، قیامت کے دن اس سے جھگڑا کروں گا)۔

اسی طرح امان دینے کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

أیما رجل من أقصاکم أوأدناکم من أحرارکم أو عبیدکم أعطی رجلا منهم أمانا أو أشار إلیه بیده فأقبل بإشارته فله الأمان حتی یسمع کلام اللّٰه، فإنَ قبل فأخوکم في الدین و إن أبَی فردوه إلی مأمنه واستعینوا باللّٰه۔(۱)

اگر تم میں سے کسی نے بھی ان میں سے کسی کو امان دی، چاہے امان دینے والا صاحبِ حیثیت ہو یا عام آدمی ہو، آزاد ہو یا غلام ہو، اس نے واضح طور پر امان دی ہو یا اس کی طرف اپنے ہاتھ سے صرف اشارہ ہی کر دیا ہو اور وہ اشارہ پاکر آگے آ جائے تو اسے امان حاصل ہوگی ، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اگر وہ اسلام قبول کر لے تو تمہارا دینی بھائی بن جائے گا ورنہ اسے اس کے محفوظ مقام پر پہنچا دو اور اللہ سے مدد مانگو۔

خلفاء راشدین صلح کے معاہدات میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور معاہدات کو توڑنے سے ڈراتے اور دشمنوں کے ساتھ بدعہدی اور غداری پر تنبیہ کرتے تھے۔ چناں چہ حضرت علیؓ نے مصر کے گورنر اشتر نخعیؒ کی طرف اپنے مکتوب میں لکھا:

اور دشمن تجھے صلح کی دعوت دے تو اسے مسترد نہ کرنا جبکہ اس میں اللہ کی رضا ہو۔ کیوں کہ صلح میں تیری فوج کے لیے آرام اور

۱۔ اسے امام زید نے الروض النضیر ۴: ۲۲۹ میں ذکر کیا ہے۔

آسانی ہے اور تیرے لیے فکر و پریشانی سے راحت ہے، اور تیرے علاقے کے لیے امن وسلامتی ہے۔ البتہ دشمن سے صلح کرنے کے بعد پوری طرح چوکنا رہو کیوں کہ بعض اوقات دشمن اس لیے قریب ہو جاتا ہے کہ تجھے غافل پاکر نقصان پہنچائے۔ لہذا احتیاط رکھو اور اس معاملے میں حسنِ ظن کا سہارا نہ لو۔ اگر دشمن کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو جائے یا اپنی طرف سے اس کی ذمہ داری قبول کرو تو پھر اپنے عہد کو وفا کرنا اور ایمان داری کے ساتھ ذمہ داری پوری کرنا اور جو زبان دے چکے ہو، اپنی جان پر کھیل کر بھی اسے نبھانا۔ کیوں کہ لوگوں کی آراء مختلف اور خواہشات منتشر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذمے لگائے گئے فرائض میں سے وہ کسی فرض پر اس قدر مضبوطی سے متفق نہیں جس قدر ایفائے عہد پر متفق ہیں۔ اس لیے جس بات کا ذمہ لیا ہے اس میں غداری نہ کرنا اور جس چیز کا عہد کیا ہے اس کی خلاف ورزی نہ کرنا، اور دشمن کو ہرگز فریب نہ دینا کیوں کہ اللہ کے سامنے ایسی جسارت صرف وہی کر سکتا ہے جو جاہل بدبخت ہو ....

اگر کسی ایسے کام میں دشواری پیش آئے جس میں اللہ کا عہد دیا ہو تو ناحق اس کو توڑنے کے در پے نہ ہونا۔ اس لیے کہ صبر سے کام لے کر دشواری ختم ہونے اور بہتر انجام کی امید رکھنا ،اس عہد شکنی سے بہتر ہے جس کے برے انجام کا خوف لاحق ہو''۔

ان تمام دلائل کی بناء پر اسلام میں معاہدہ کرنا جائز ہے۔ بلکہ اسلام معاہدات کو امن و سلامتی کی ضمانت اور استحکامِ امن اور انسانی حقوق کی حفاظت کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ سمجھتا ہے۔

معاہدوں کی پاسداری کرنا

اسلام میں معاہدات کی حیثیت محض کاغذ کے ایک ٹکڑے کی نہیں ہوتی جیسا کہ موجودہ غیر اسلامی ریاستوں کے نزدیک ہے۔ اسلام معاہدے کو فریب کا ذریعہ بھی نہیں بناتا، نہ مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے معاہدات کی آڑ لیتا ہے، اور نہ ہی کمزور پر طاقتور کی طاقت مسلط کرنے کے لیے اسے ظاہری نعرے کے طور پر اختیار کرتا ہے اور نہ اسے ایسی سلامتی کی تائید کا آلہ بناتا ہے جو ظلم و بے انصافی پر مبنی ہو۔

اسلام میں جو معاہدات ہوتے تھے وہ خیانت، فریب، دھونس یا سستے مادی مفادات کو تحفظ دینے سے پاک ہوتے تھے۔

اور مسلمان ایفائے عہد کا التزام شریعتِ الٰہی کا عادلانہ حکم سمجھ کر کرتے تھے، وہ اسے پیغامِ اسلام کے اعلیٰ مقاصد کے تحفظ کا ذریعہ سمجھتے تھے، نیز وہ ایفائے عہد کی پابندی اس لیے بھی کرتے تھے کہ ان کے نزدیک یہ پائیدار امن و سلامتی کا ضامن ہے جس میں نہ تو کوئی چھپا ہوا ظلم ہو نہ کوئی فریب یا دھوکہ۔ جب تک معاہدہ باقی رہے اس وقت تک اس کا توڑنا بھی جائز نہیں اور اس کی شرائط کی خلاف ورزی کرنا بھی جائز نہیں جب تک دشمن اس کو توڑنے میں پہل نہ دکھائے۔ یہ اس لیے کہ مسلمانوں کو قرآن کریم کی متعدد آیات میں ایسا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ [المائدة: ۱] (اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے اقراروں کو پورا کرو)، ﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلَا تَنقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ﴾ [النحل: ۹] (اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جب تم نے کوئی عہد باندھا ہو اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو، حالاں کہ تم اللہ کو اپنا ضامن بنا چکے ہو، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے)، ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾ [الاسراء: ۳۴] (اور عہد کی پابندی کرو بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنا ہوگی)، ﴿فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ﴾ [التوبة: ۴] (تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو) اور ﴿فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ﴾ [التوبة: ۷] (تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو)۔

یوں ایمان اور وفائے عہد لازم ملزوم ہیں اور عہد کو پورا کرنا ایک ایسا عظیم دستور ہے جو توڑا نہیں جا سکتا۔ عہد توڑنا مسلمان کی شان نہیں، منافق کا شیوہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی یہ خوبی بیان فرمائی ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ﴾ [الرعد: ۲۰] (اور وہ لوگ جو کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے)، نیزفرمایاہے: ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا﴾ [البقرۃ:۱۷۷] (اور جب عہد کریں تو وفا کریں)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: لا إيمان لمن لا أمانة له ولا دين لمن لا عهدله ۔(۱) (جو امانت کا پاس نہیں کرتا اس کا کوئی ایمان نہیں اور جو عہد کا پاس نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں) نیز آپؐ کا ارشاد ہے: لكل غادر لواء يوم القيامة يرفع له بقدر غدرته ألآ ولا غادر أعظم غدرا من أمير عامةٍ۔(۲) (روزِ قیامت ہر عہد شکن کے آگے جھنڈا گڑا ہوگا، اتنا بڑا جتنی بڑی عہد شکنی ہوگی اور سن لو! عوام کا عہد شکن اَمیر تو سب سے بڑا عہد شکن ہے) آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے: ألآ أخبركم بخياركم، خياركم الموفون بعهودهم ۔(۳) (میں تمہیں بتاؤں تم میں سے بہتر لوگ کون ہیں، تم میں سے بہتر وہ لوگ ہیں جو وعدہ وفا کرتے ہیں)۔

۱۔ احمد، ابن حبان

۲۔ احمد، مسلم بحوالۂ نيل الأوطار ۸:۲۷

۳۔ مؤلف نے لکھا ہے کہ اس کی تخریج مجھے نہیں مل سکی، مگر الفاظ کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ یہ حدیث کئی کتب میں موجود ہے۔ مجمع الزوائد، ہیثمی ۷: ۴۷۵، کنزالعمال ۴: ۴۳۶، حدیث نمبر ۷۳۲۶ ، إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة ، أحمد بن أبي بكر البوصيري ۷:۱۹۰، مسند أبي يعلىٰ ۲: ۴، ۲: ۲۴۷ میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے یہ مکمل موجود ہے ، البتہ آخری الفاظ الموفون بعهدهم کی بجائے الموفون المطيبون ہیں۔ علي بن أبي بكر الهيثمي نے اس کے رجال کو ثقہ لکھا ہے۔ اِس کے علاوہ مصنف ابن أبي شيبة: كتاب البيوع ۶:۵۹۱ وغیرہ میں عروہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بدو سے کھجوروں کی ایک معین مقدار کے بدلے کچھ اونٹ خریدے اور خولہ بنت حکیمؓ کے پاس پیغام بھیجا تو انہوں ان کی ادائیگی کردی ، جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خياركم الموفون المطيّبون ۔ واللہ اَعلم ۔ اکرام الحق یٰسین۔

خیانت اور عہد شکنی تو منافقین کی خصوصیات ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أربع من كن فيه كان منافقاً خالصاً: من إذا حدّث كذب ، وإذا وعد أخلف، وإذا عاهد غدرَ، وإذا خاصَمَ فَجَرَ(چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس میں پائی جائیں وہ پورا منافق ہوگا: ایک یہ کہ بات کرے تو جھوٹ بولے، دوم یہ کہ وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، سوم یہ کہ کوئی معاہدہ کرے تو اسے توڑ ڈالے اور چہارم یہ کہ کسی سے جھگڑا کرے تو گالی دے)۔(۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اہلِ عرب کے ان معاہدات کے احترام کی بھی توثیق فرمائی جو عہد جاہلیت میں انسانی بنیادوں پر کیے گئے تھے۔ چناں چہ حلف الفضول جس میں جوانی کی عمر میں آپؐ خود شریک رہے تھے اور جس میں مظلوم کی مدد اور مکہ کے زائرین کے تحفظ کا عہد کیا گیا تھا، اس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا: لقد شهدتُ في دار عبد الله بن جُدعان حلفاً، ما أحب أن لي به حمر النعم، ولو أُدعى به في الإسلام لأجبتُ۔(۲)(عبداللہ بن جُدعان کے گھر پر جو معاہدہ کیا گیا تھا اور میں اس میں شریک تھا وہ مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ عزیز اور پسند ہے اور اگر آج اسلام کی حالت میں بھی مجھے اس کی دعوت دی جائے تو میں قبول کر لوں)۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلی دور کے اچھے معاہدات کی پاسداری کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: أوفوا بحلف الجاهلية فإنه لا يزيده (أي الإسلام) إلا شدة ولا تُحدثوا حلفا في الإسلام۔(۳)(جاہلیت کے عہد و پیمان پورے کرو، اسلام انہیں اور مضبوط کرتا ہے، البتہ اپنی طرف سے کوئی خلافِ اسلام معاہدہ نہ کرو)۔

۱۔ احمد، بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی

۲۔ سيرة ابن هشام۱:۱۳۴، البداية والنهاية ۲: ۲۹۱

۳۔ تحفة الأحوذي ۲: ۳۹۲، احمد، ترمذی

مطلب یہ کہ حق اور بھلائی کو تقویت پہنچانے والے معاہدات کو اسلام برقرار رکھتا ہے اور فساد ، قبائلی لڑائیوں اور بلاسبب حملوں کے لیے معاہدے کرنے کو ممنوع قرار دیتا ہے۔

اسلام کی تاریخ روزِ اوّل سے آج تک، ہر زمانے میں صاف شفاف رہی ہے اور کبھی خیانت اور دھوکے سے آلودہ نہیں ہوئی، اور نہ ہی کبھی ایسے ہوا کہ دشمن کی طرف سے عہد شکنی میں پہل کیے بغیر مسلمانوں نے عہد شکنی کی ہو۔

امام نوویؒ کہتے ہیں: تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جنگ کے دوران غیرمسلموں کے ساتھ ہرقسم کے حربے استعمال کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں عہد شکنی یا امان کی خلاف ورزی نہ ہو۔

ایفائے عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے کی نادر مثالوں میں سے ایک وہ حسنِ سلوک ہے جو شام والوں کے ساتھ حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے کیا تھا۔ وہاں کے اہل ذمہ مسلمانوں کے حسن سلوک اور ایفائے عہد کے اہتمام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں ہر شہر سے کچھ لوگوں کو رومیوں کی جاسوسی کرنے کے لیے بھیجا جو ان کی معلومات ابوعبیدہؓ کو بہم پہنچایا کرتے تھے۔ پھر جب شام میں خلافتِ اِسلامیہ کی شمالی سرحدوں پر رومیوں نے اپنی افواج جمع کر دیں تو جن جن شہروں کے باشندوں سے صلح ہوچکی تھی، ابو عبیدہؓ نے ایسے تمام علاقوں کے والیوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے شہروں سے جتنا جزیہ اور خراج وصول کیا تھا واپس کر دو۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ان شہریوں کے نام ایک خط لکھا جس میں کہا:

> ہم تمہارے مال اس لیے واپس دے رہے ہیں کہ دشمن نے جس قدر افواج ہم پر حملہ آور ہونے کے لیے جمع کردی ہیں، اس کی خبر ہمیں مل گئی ہے۔معاہدے میں تم لوگوں نے شرط رکھی تھی کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے مگر اِن حالات میں ہمارے

لیے اس کی پابندی ممکن نہ ہوگی۔ ہم نے جو کچھ آپ لوگوں سے لیا تھا وہ واپس کر رہے مگر اس کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد کی اور دشمن پر ہم نے غلبہ پایا تو تمہارے ساتھ کیے گئے معاہدے پر اور جو کچھ اس میں طے پایا ہے، ہم اس پر قائم رہیں گے۔(۱)

جب ان شہروں کے والیوں نے اہل ذمہ کو یہ بات بتائی اور ان سے لیا ہوا مال انہیں واپس دے دیا تو انہوں نے کہا:

اللہ کرے تم واپس ہمارے حاکم بن جاؤ اور رومیوں پر فتح پاؤ۔ اگر رومی ہم لوگوں سے یہ مال لے چکے ہوتے تو کبھی واپس نہ کرتے بلکہ ہمارے پاس جو کچھ باقی ہوتا وہ بھی چھین لیتے اور ہمارے پاس کچھ بھی نہ رہنے دیتے۔

پھر جب مسلمان رومیوں پر غالب آئے تو ابوعبیدہؓ نے خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ کو اس معاہدے کے بارے میں لکھ بھیجا جو انہوں نے ان شہروں کے لوگوں سے کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا:

مسلمانوں کو اہل ذمہ پر زیادتی کرنے، انہیں نقصان پہنچانے اور ان کا مال ناحق طریقے سے کھانے سے روکے رکھو، اور ان سے جو جو معاملات طے کیے ہیں ان کی شرائط کو پورا کرو۔(۲)

صلیبی جنگوں کے دوران بھی اسی طرح ہوا، چناں چہ اس وقت بھی صلاح الدین ایوبیؒ نے شام کے عیسائیوں کو جزیے کی وہ رقم اس وقت واپس کر دی، جب اسے مجبوراً شام سے پسپا ہونا پڑ گیا تھا۔

۱۔ کتاب الخراج، ابو یوسفؒ، ص ۱۳۸ وما بعد، فتوح البلدان، ص ۱۴۳

۲۔ کتاب الخراج، ابو یوسف، ص ۱۴۰-۱۴۱

معاہدے کی تعریف

معاہدہ دو فریقوں کے درمیان طے پانے والا ایسا پیمان ہوتا ہے جس کی شرائط کی ہر ایک فریق کو پابندی کرنی ہوتی ہے۔ تاہم وضعی قانون کے مقابلے میں اسلامی قانون کی اصطلاح میں معاہدے کا مفہوم زیادہ وسیع ہے۔ اس لیے کہ بنیادی طور پر معاہدہ دو ارادوں کے اتفاق کا نام ہے، قطع نظر اس کے کہ اس کی شکل یا اس کے نفاذ کا طریقہ کیا ہے؟ چناں چہ عہد دو اشخاص یا دو فریقوں کا مشترکہ مفادات کے لیے کسی چیز یا بات پر متفق ہو جانے کا نام ہے۔ اس کے ایفاء کو دونوں فریق کسی طرح مزید مستحکم اور باوثوق بنائیں تو اسے میثاق کہا جاتا ہے اور اگر اسے خصوصاً حلف اور قسم کے ساتھ مستحکم کیا جائے تو اسے حلف کہا جائے گا۔(۱)

معاہدے کی شرائط

مسلمانوں اور غیرمسلموں کے درمیان جو معاہدات طے پاتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک کی اپنی مرضی اس میں شامل ہو، معاہدے کا مقصد کسی جائز غرض کا حصول ہو، اس غرض کا حصول ممکن بھی ہو، اور وہ غرض اس ہدف کے مطابق ہو جو مسلمانوں کے غیرمسلموں کے ساتھ تعلقات کا نصب العین ہے اور وہ یہ کہ امن قائم ہوجائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاہدے کے لیے خاص شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ وہ شرائط درج ذیل ہیں :

شرطِ اوّل: معاہدہ کرنے کی اہلیت

بین الاقوامی قانون کے تحت صرف ریاستیں اور بین الاقوامی تنظیمیں ہی معاہدات طے کرتی ہیں، مگر اسلامی قانون کے تحت کوئی بھی عام اور باشعور شخص معاہدہ کر سکتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک اکیلا شخص بھی کسی کو امان دے سکتا ہے۔اسی طرح

۱۔ تفسیر المنار، رشید رضا۴: ۱۵۴، ۵: ۱۸۵

جس فوجی کمانڈر کو دشمن کے ساتھ معاہدۂ صلح کا اختیار دیا گیا ہو وہ بھی ان کے ساتھ معاہدہ کرسکتا ہے اور وقت کا حکمران خود بھی معاہدہ کرسکتا ہے۔

جہاں تک اَمان کا تعلق ہے تو وہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں درجِ ذیل صورتیں شامل ہوتی ہیں: اہلِ حرب کو قتل کرنے سے باز رہنا اور ان کے ساتھ جنگ روک دینا، (۱) لڑائی کے دوران دشمن کی جان و مال کو تلف کرنے اور اسے غلام بنانے کے جواز کو اٹھا لینا، یا ایک مخصوص عرصے تک اسے اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ رہنے کی اجازت دے کر اس کی جان و مال محفوظ رکھنے کا عزم کرنا۔ امان کی دو قسمیں ہیں: امان عام اور امان خاص۔(۲)

امان عام: اس سے مراد وہ امان ہے جو لوگوں کی تعداد کے تعین کے بغیر دی جائے، جیسے ایک پورے صوبے کے لوگوں کو دی جانے والی امان۔ اس طرح کی امان حاکم وقت یا اس کا نمائندہ ہی دے سکتا ہے۔ جنگ بندی کا معاہدہ یا غیر مسلم شہریوں کے ساتھ عقدِ ذمہ اس کی مثالیں ہیں۔ کیوں کہ یہ عوامی مفادات کے ایسے معاملات ہیں جن کا تقاضا یہ ہے کہ حاکم وقت خود ان پر غور وخوض کر کے فیصلہ کرے۔

امان خاص: یہ کسی ایک فرد یا گنتی کے لوگوں کو دی جانے والی امان ہے، مثال کے طور یوں کہہ لیجیے کہ دس یا دس سے کم لوگ ہوں تو انہیں دی جانے والی امان امانِ خاص شمار ہوگی۔ اس طرح کی امان کوئی بھی بااختیار اور ذمہ دار مسلمان دے سکتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: **ذمة المسلمين واحدة، يسعىٰ بها أدناهم، فمن أخفر مسلماً فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين، لا يقبل الله منه يوم القيامة صرفاً ولا عدلاً** (مسلمانوں کی ذمہ داری مشترکہ ہوتی ہے، عام مسلمان بھی اس کا ذمے دار ہوتا ہے، لہذا جو کسی مسلمان کی دی ہوئی پناہ کو توڑے گا، اس پر اللہ کی

۱۔ مغني المحتاج ۴:۲۳۶

۲۔ مواهب الجليل ۳:۳۶۰، حاشية العدوي على الخرشي ۳:۱۴۱، طبع دوم

طرف سے،فرشتوں کی طرف سے، اور تمام لوگوں کی طرف سے لعنت ہوگی۔ قیامت کے دن اللہ نہ اس کی توبہ قبول کرے گا، نہ فدیہ)۔(۱) ایک اور حدیث میں ارشادِ نبوی ہے: المسلمون تتکا فأ دماؤھم، وھُم ید علٰی مَن سواھم، و یسعٰی بذمتھم أدناھم ۔(۲)(مسلمانوں کے خون برابر ہیں۔ اپنے ماسوا پر وہ یک دست ہیں اور ان کا کم حیثیت شخص بھی ان کی طرف سے ذمہ داری لے سکتا ہے)۔

چوں کہ آج کل معاہدات حکومتوں، بین الاقوامی تنظیموں اور جماعتوں کے درمیان طے کیے جاتے ہیں لہذا خصوصی امان کو معاہدہ نہیں بلکہ عہد کہا جائے گا۔

امان کی نگرانی: چوں کہ رعایا کے تمام امور کی سرپرستِ اعلیٰ ریاست ہی ہوتی ہے، اس لیے اسے یہ حق بھی حاصل ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور ذمیوں ہر دو کو نقصان سے بچانے کے لیے افراد کی دی ہوئی پناہ پر بھی نظر رکھے جیسا کہ اسلام کا مشہور اصول ہے: لا ضرر ولا ضرار (نہ نقصان اٹھاؤ نہ نقصان دو)۔اس بنا پر فرد کو بھی ایسی کسی سرگرمی کی اجازت نہیں جو عوامی مفاد کے خلاف ہو یا امان کے عمومی اصول سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ صرف اِس طرح کی امان قابلِ ایفاء ہے جو مفادِ عامہ کے شرعی نقطۂ نظر کے مطابق ہو۔ اس سلسلے میں شرعی اصول جلب المصالح ودفع المضار (فراہمی مفاد اور دفعِ مضرت) ہے اور اِس کی پاس داری ضروری ہے خواہ پناہ دینے والا با اختیار شخص ہی ہو۔ چناں چہ اگر کسی نے جاسوس، یا اسلحہ کے اسمگلر یا کسی ایسے شخص کو امان دے دی جو مسلمانوں کو نقصان پہنچا رہا ہو تو اس کی امان کالعدم قرار پائے گی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ نیل الأوطار ۸:۲۷-۲۸ بحوالہ بخاری، احمد، بروایتِ علیؓ، مسلم:بروایت ابو ہریرہؓ الفاظ کے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ۔

۲۔ نیل الأوطار ۳: ۲۸بحوالہ بخاری، ابن حبان، حاکم، ابن ماجہ بروایتِ حضرت ابو ہریرہؓ، ابن عمرؓ اور معقل بن یسار۔ حدیث سے مراد یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں سے کم حیثیت شخص بھی کسی کو امان دے دے تو دوسروں کو یہ امان توڑنے کی اجازت نہیں۔

کے ارشاد: قد أجرنا من أجرتِ یا أم ھانيؓ (۱) (اے ام ہانیؓ! تم نے جسے پناہ دی ہم بھی اسے پناہ دیتے ہیں) سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ عورت بھی پناہ دے سکتی ہے۔

مسلمانوں کو نقصان سے بچانے کے لیے حکومت کی نگرانی کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک خصوصی نگرانی، اور دوسرا عمومی نگرانی:

خصوصی نگرانی: اس کی ضرورت اس صورت میں پیش آتی ہے جب کوئی فرد اپنے قانونی دائرۂ اختیار سے تجاوز کر جائے جیسے کوئی مسلمان خود ہی کسی قلعے یا علاقے کے باشندوں کو امان دے۔ یا حکومت نے کسی کو امان دینے سے منع کیا ہو اور پھر بھی کوئی فرد اسے امان دے تو ایسی صورتوں میں حکومت کو اختیار حاصل ہوگا کہ چاہے تو اس امان کی منظوری دے یا اسے مسترد کر دے۔

عمومی نگرانی: اس سے مراد افراد کی دی ہوئی ہر قسم کی امان کی نگرانی ہے، بالخصوص ایسی امان جو کسی عورت، غلام، بچے وغیرہ نے دی ہو۔(۲) باشعور بچہ اگر کسی کو امان دے دے تو امام مالکؒ، امام احمدؒ، اور امام محمدؒ بن حسنؒ کے نزدیک یہ امان صحیح ہے، جب کہ دیگر ائمہ کے نزدیک اس کی امان بھی معتبر نہیں۔

عارضی صلح: اسی کو عربی میں موادعة، معاھدة، مسالمة، مھادنة اور ھُدنة بھی کہتے ہیں۔ یہ ایسی صلح ہے جس میں بر سر پیکار غیر مسلموں کے ساتھ ایک مقررہ مدت تک جنگ بندی کا معاہدہ کیا جاتا ہے، خواہ اس معاہدے میں کچھ عوضانہ مقرر کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو، اور اس میں اپنے اپنے دین پر قائم رہنے کی آزادی کی شرط شامل ہو یا نہ ہو۔ نیز اِس معاہدے کے تحت فریقِ مخالف کے اِسلامی حکومت کے ماتحت آنے کی شرط بھی نہیں ہوتی۔(۳) یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی صلح ہے جو دو قائدین کے درمیان مقررہ مدت کے لیے مخصوص شرائط کے تحت وجود میں آئے۔

۱۔ نیل الأوطار ۸: ۱۷

۲۔ المدونة الکُبریٰ ۳: ۴۱، المنتقی علی الموطأ ۳: ۱۷۳، الخرشي ۳: ۱۲۲۔

۳۔ البدائع ۷: ۱۰۸، الحطاب ۳: ۳۶۰، مغني المحتاج ۴: ۲۶۰، کشاف القناع ۳: ۸۷، المغني ۸: ۴۵۹

عارضی صلح کی یہ تعریف بین الاقوامی قانون میں دی گئی تعریف سے قریب تر ہے۔ اس کے مطابق عارضی صلح بنیادی سیاسی اہمیت کے ہر اس معاہدے کا نام ہے جس سے دو متحارب قوتیں ایک خاص وقت تک کے لیے جنگ بندی پر رضامند ہو جائیں۔ (۱)

معاہدۂ صلح طے کرنے کا اختیار صرف مسلم حاکم یا اس کے نمائندۂ مجاز کو حاصل ہے، اگرچہ اس نمائندے کو تفویض کیے گئے اختیارات عمومی نوعیت کے ہی ہوں جیسے کسی علاقے کا والی وغیرہ ۔ اس لیے کہ معاہدے کے لیے وقت وسعتِ نظر، مفادِ عامہ کے صحیح اندازے اور جنگی معاملات کے فہم و اِدراک کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صلاحیتیں مسلمانوں کے حاکم کے سوا کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہوتیں۔ اگر حاکم کی طرف سے تفویض کیے جانے کے بغیر کوئی عام شہری اِس طرح کا معاہدہ کرے تو اسے حاکم یا اس کے نائبِ مجاز پر جسارت تصور کیا جائے گا۔ احنافؒ کے سوا دیگر فقہاء کے نزدیک ایسامعاہدہ درست نہ ہوگا۔ احنافؒ کے نزدیک بھی اس شرط کے ساتھ درست ہو گا کہ وہ مسلمانوں کی ایک جماعت کی طرف سے کیا گیا ہو اور اس میں مسلمانوں کا مفاد پایا جاتا ہو۔(۲)

دائمی معاہدہ صلح: یہ عقد ذمہ ہے۔ اس میں اسلامی علاقے کے اندر غیرمسلموں کو جگہ دینے، جزیہ کے عوض انہیں تحفظ دینے اور ان کا دفاع کرنے کی ذمہ داری لی جاتی ہے، جب کہ فریقِ ثانی اس میں اِسلامی حکومت کی مکمل ماتحتی قبول کرتا ہے۔(۳) تمام فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس طرح کا معاہدہ صرف مسلمانوں کا قائد یعنی حاکمِ وقت یا اس

۱۔ القانون الدولي، ابو ہیف، ص۶۹۴، طبع ۱۹۵۹ء

۲۔ تبيين الحقائق،الزيلعی۳:۲۴۵، فتح القدير۴:۲۹۳، الفروق ۱:۲۰۷،الدسوقي والدردير۲: ۱۸۹، مغني المحتاج۴:۲۶۰، المغني۸:۴۶۱ و ما بعد

۳۔ اس طرح کا معاہدہ مالکیؒ علماء، اوزاعیؒ، ثوریؒ، اور شامی فقہاء کے نزدیک ہرقسم کے غیرمسلم کے ساتھ کیا جا سکتا ہے چاہے وہ عرب ہو،غیرعرب ہو، یہودی ہو عیسائی ہو، چاہے کوئی بت پرست ہو۔ الحطاب والمواق۳:۳۸۰، اختلاف الفقهاء، الطبری،ص ۲۰۱

کا نائبِ مجاز ہی کرسکتا ہے ۔(۱) اس لیے کہ یہ ایک اعلیٰ ترین قومی مفاد کا معاملہ ہے جس میں نہایت تدبر اور قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ صلاحیتیں مسلمانوں کے امیر ہی میں میسر آسکتی ہیں جو ان کے اجتماعی مفادات کا صحیح اِدراک کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص ایسا معاہدہ کرے گا تو وہ درست نہ ہوگا۔ اس صورت میں جن غیرمسلموں کے ساتھ ایسا معاہدہ کیا گیا ان کو جائے امن تک پہنچانا ضروری ہو گا۔

جن فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مسلمانوں کے غیرمسلموں کے ساتھ تعلقات میں اصل امن ہے، جنگ نہیں، ان کے نزدیک غیرمسلموں کے ساتھ دائمی اور مستقل صلح کا معاہدہ عقد ذمہ کے علاوہ کسی دوسرے معاہدے کی شکل میں بھی کیا جا سکتا ہے، جس کے نتیجے میں الفت و محبت پیدا ہو اور پرامن طور پر دلائل اور معقول گفتگو کے ذریعے اِسلام کا پیغام پھیلانے میں مدد مل سکے۔ ایسا معاہدہ کرنے میں بھی کوئی شرعی رکاوٹ نہیں جو دوستی اور اچھے پڑوس کا باعث بنے اور جس سے باہمی تجارت کی راہ ہموار ہو یا بین الاقوامی نظم وضبط کے طور پر کوئی ایسا معاہدہ کیا جائے جس سے امن و سلامتی کے قیام میں مدد ملتی ہو، اس کے ذرائع کو استحکام ملتا ہو اور باہمی مفادات کے تبادلے کے مواقع پیدا ہوتے ہوں، تاکہ معاہدے کے بعد کسی قسم کی زیادتی کا احتمال نہ رہے۔ سوائے اس صورت کے کہ معاہدہ ہی ٹوٹ جائے۔ معاہدے کی مختلف اقسام کی مثالیں اِن شاء اللہ سنت نبوی کی روشنی میں بیان کی جائیں گی۔

شرط دوم: باہمی رضامندی یا آزادانہ فیصلہ

چوں کہ معاہدہ ایک طرح کا عقد ہوتا ہے اور سول معاہدوں کے درست انعقاد کے لیے فریقین کی باہمی رضامندی اور مرضی ضروری ہوتی ہے۔ لہٰذا جبر و اِکراہ کے تحت طے پانے والے معاہدے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس لیے کہ یہ عقد کے تقاضوں کے منافی ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ ارادے کا اظہار آزادی کے ساتھ ہو۔ رضامندی اور مرضی کے بغیر امن و سلامتی کو دوام بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

۱۔ فتح القدیر ۴:۳۶۸، منح الجلیل ۱:۷۵۶، مغني المحتاج ۴:۲۴۳، کشاف القناع ۳:۹۲

روایتی بین الاقوامی قانون کی رو سے جبر و اکراہ کو مخصوص شرائط کے ساتھ معاہدے کے باطل ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ کسی ریاست کے حاکم یا نمائندگان کو ذاتی طور پر کسی بات پر مجبور کر کے معاہدہ کیا گیا ہو۔ البتہ اگر ریاست کو مجبور کیا گیا ہو تو اس سے معاہدہ کالعدم نہیں ہوتا۔ اس ضابطے پر جس قدر تنقید کی گئی ہے اس سب کے باوجود بین الاقوامی سطح پر معاہدات اور اِقدامات میں جو نئی صورتیں پیدا ہوئی ہیں ان کا میلان اسی طرف ہے کہ زبردستی کی بنا پر معاہدے کو کالعدم قرار نہ دینے کے ضابطے کو تسلیم نہ کیا جائے۔(۱)

ہمارے فقہاء نے امان کے بارے میں ،جو کہ ایک عقد ہے، کی ابتدا ہی کے لیے فریقین کی متفقہ رضا ورغبت کو شرط قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ عقد کے لیے عقد کرنے والے کی رغبت، نیت اور رضامندی کا عملاً اور فعلاً موجود ہونا ضروری ہے۔ لہذا مجبوری اور زبردستی کی صورت میں یہ عقد درست قرار نہیں پائے گا۔

ان حضرات نے عارضی صلح (هُدنة) اور مستقل صلح (معاہدۂ ذمہ وغیرہ) کے لیے بھی یہ شرط عائد کی ہے کہ وہ ہر قسم کی فاسد شرائط سے خالی ہوں اور جبر و اکراہ کسی بھی قسم کے عقد کے باطل ہونے کے اسباب میں سے ایک ہے ۔

شرط سوم: معاہدے کی تشکیل

بین الاقوامی قانون معاہدے کے لیے ایک خاص نمونے کی پابندی ضروری قرار دیتا ہے۔ ایک تو یہ ضروری ہے کہ معاہدہ ایک وثیقے کی شکل میں لکھا ہوا ہو، دوسرے یہ کہ اس کے آخر میں فریق ممالک کے نمائندگانِ مجاز کے دستخط ہوں، تیسرے یہ کہ اس معاہدے پر متعلقہ ممالک کی تصدیق ثبت ہو، اور چوتھے یہ کہ اس کی خاص اہمیت کی بنا پر اَقوامِ متحدہ کے جنرل سیکرٹریٹ میں اس کا اندراج کروایا جائے۔(۲)

۱۔ القانون الدولي ، ڈاکٹر حافظ غانم، ص ۴۸۷-۴۹۱

۲۔ القانون الدولي ، غانم، ص ۴۹۱ وما بعد، القانون الدولي العام ......حامد سلطان، ص ۱۱

اسلام میں معاہدات کو کسی طرح کے خاص اجراء اتی مراحل سے نہیں گزرنا پڑتا تھا جیسا کہ آج کل کے قانون میں ہوتا ہے، کیوں کہ معاہدے کا مرکزی مضمون آزاد اور خود مختار فریقوں کی مرضی سے طے پاتا تھا، لیکن میرے نزدیک ان جدید ظاہری صورتوں کی پیروی کرنے میں بھی کوئی شرعی رکاوٹ نہیں۔ اس لیے کہ اصل اعتبار تو معاہدے کے مضمون کا ہوتا ہے۔ مسلمان فقہاء نے یہ شرط بھی ضروری قرار دی ہے کہ غیر مجاز فوجی قائد اگر دشمن کے ساتھ صلح کا معاہدہ کرے تو اس پر خلیفہ یا حاکم کی منظوری لے۔ البتہ اگر فوجی قائد کو صلح کرنے کا اختیار ملا ہوا ہے تو وہ صلح کرنے کے بعد خلیفہ کو اِس معاہدے کی تفصیل بتائے۔ اب اگر معاہدے کی شرائط شریعت کے مطابق ہوں گی تو خلیفہ اس کی منظوری دے دے گا۔ شام میں حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے اور دیگر فوجی قائدین نے دیگر علاقوں میں صلح کے معاہدات کیے تو خلیفہ وقت حضرت عمرؓ کو اس بارے میں اطلاع دی۔

اگر خلیفۂ وقت بذاتِ خود ایسا معاہدہ کرے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے بیت المقدس والوں سے کیا تھا، تو مسلمانوں پر یہ معاہدہ نافذ ہو جائے گا کیوں کہ خلیفہ پوری امت کا نمائندہ اور معاہدات طے کرنے میں ان کا قائم مقام ہوتا ہے۔

معاہدات کے تحفظ کا اہتمام کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبائل اور بادشاہوں کے ساتھ طے پانے والے ہر قسم کے معاہدے اور حلف نامے تحریر کرنے کا حکم دیا کرتے تھے تاکہ جن امور کا متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا ہے، ان کی حتمی شکل سامنے آجائے اور معاہدے کی شرائط کا نفاذ ہوسکے۔ اس سلسلے میں مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ اولین سیاسی معاہدے کو تحریر میں لایا گیا اور اسی طرح حدیبیہ کی صلح کو بھی تحریری شکل دی گئی۔ اسلام میں معاہدے کی شرائط کی منظوری اور عقد ہو جانے کے ساتھ ہی حالتِ اَمن کا نفاذ ہوجاتا ہے، یہ نہیں کہ رسمی طور پر معاہدے کا اعلامیہ جاری ہو اور فریق ہائے معاہدہ کی تصدیقات کا عمل مکمل ہو اور پھر اس پر عمل در آمد شروع ہو، جیسا کہ بین الاقوامی قانون میں مطلوب ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ بھی تھا کہ معاہدے پر گواہ بنا لیتے جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ ؐ نے معاہدے کی توثیق کے لیے کچھ لوگوں کو مسلمانوں میں سے اور کچھ لوگوں کو کافروں میں سے گواہ بنایا تھا۔ اس بارے میں بھی کوئی شرعی رکاوٹ نہیں کہ معاہدے کو دو یا زیادہ زبانوں میں تحریر کیا جائے جیسا کہ عصر حاضر میں رواج ہے۔

شرط چہارم: معاہدے کا واضح ہونا

یہ بھی ضروری ہے کہ معاہدہ صاف اور واضح الفاظ میں لکھا جائے۔اس کے اہداف واضح ہوں، حقوق و فرائض اس طرح متعین اور صریح ہوں کہ ان میں کسی طرح کی تاویل یا الفاظ سے کھیلنے کی گنجائش نہ ہو۔ ایسے الفاظ استعمال نہ کیے جائیں جن میں دھوکہ دہی، ابہام، توڑ موڑ، اور غلط بیانی ہو، جس طرح حالیہ سیاست دان الجھن آمیز بیانات دیتے رہتے ہیں، اور بعد میں معاہدے کی تشریح کے لیے کسی کو ثالث بنانے یا بین الاقوامی عدالت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اس سے اکثر اوقات معاہدے کے مقاصد ختم ہو کر رہ جاتے ہیں اور جائز حقوق تلف ہو جاتے ہیں اور وہاں فیصلے میں تاخیر اور مہذب ممالک کی بدنیتی کی وجہ سے معاہدہ ختم ہو جانے تک نوبت آ جاتی ہے۔

قرآن کریم نے ہمیں دشمنوں کی چالوں سے خبردار کیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ﴾ [النساء: ۱۰۲] (مگر پھر بھی چوکنے رہو) نیز ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَتَّخِذُوْا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا السُّوْءَ بِمَا صَدَدتُّمْ عَن سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [النحل: ۹۴] (اور تم لوگ اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بنا لینا، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا برا نتیجہ دیکھو اور تمہیں سخت سزا کا سامنا کرنا پڑے)۔

حضرت علیؓ نے اشتر نخعیؒ کو ہدایت کی تھی کہ معاہدہ کرنے والوں کی کمزوری کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ اور نہ ہی الفاظ کے ہیرپھیر اور توڑ موڑ کا سہارا لو۔ ایسے الفاظ استعمال نہ کرو جن میں کوئی ابہام یا بگاڑ ہو یا دھوکہ فریب ہو سکے۔ معاہدے میں ایسے الفاظ استعمال نہ کرو جن کا مطلب بگاڑا جا سکتا ہو اور نہ ہی بات پختہ کرنے کے بعد ایسی بات کہو جس کا مفہوم بدلنے کی گنجائش باقی ہو۔(۱)

معاہدات کی تشریح

چوں کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے معاہدات اور معاملات میں اصل بنیاد سچائی اور حسنِ نیت پر ہوتی تھی اس لیے اِن میں ایسی تشریح کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا تھا جو آج کل ممالک کے درمیان سیاسی دھوکے بازی اور فریب کاری کی صورت میں دیکھنے میں آتا ہے۔

قانونی اور شرعی طور پر کسی معاہدے کی تشریح و تعبیر اس میں شریک فریقوں کی باہمی رضامندی سے ہوتی ہے۔ اگر کسی معاہدے کی تشریح پر متعلقہ فریقوں کا اتفاق نہ ہو سکے تو ہر ریاست کو اپنے تئیں اس کی تشریح کا حق حاصل ہے، البتہ کسی فریق کی تشریح دوسرے فریق پر مسلط نہیں کی جاسکتی۔ اگر اس کے باوجود بھی معاہدے کی تشریح پر متعلقہ فریقوں کا اتفاق نہ ہو سکے اور تعبیر کے بارے میں نزاع پیدا ہو جائے تو جمہور فقہاء کے نزدیک مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلموں کی ثالثی قابلِ قبول نہیں ہوگی، اس لیے کہ مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلموں کو ثالث بنانا جائز نہیں۔(۲) یہ ایک طرح کی سرپرستی ہوتی ہے اور قرآن کریم کہتا ہے:﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ [النساء:۱۴۱] (اور اللہ مومنوں پر کافروں کے غلبے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں بنائے گا)۔چناں چہ ایسی صورت میں مسئلے کے حل کے لیے

۱۔ نهج البلاغة ۲:۱۴۲

۲۔ أحكام الذميين والمستأمنين ، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، ص ۶۰۱

مسلمان قاضی صاحبان کو ثالث بنایا جائے گا جو عادل ہونے کے ساتھ ساتھ معاہدے کی اصل روح کے مطابق تعبیر کی اہلیت بھی رکھتے ہوں، جس سے اعتماد و اطمینان پیدا ہو اور حق و انصاف حاصل ہو سکے۔

باقی جہاں تک عصرِ حاضر میں غیر مسلم ثالثوں یا بین الاقوامی عدالت کے فیصلوں پر مسلمانوں کی رضامندی کا تعلق ہے تو یہ محض اس لیے ہے کہ اس وقت مسلمان کمزور اور غیر مسلم طاقتور ہیں، اور یہ مسلمانوں کی مجبوری ہے۔

جیسا کہ ہم جنگ بندی کے طریقوں کے ضمن میں بتا چکے ہیں کہ فقہاءِ مالکیہؒ نے دشمن سے خوف کی صورت میں غیر مسلم کو ثالث بنانے کو جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح کے حالات میں معاہدات کی تعبیر و تشریح کے لیے عالمی عدالتوں کی طرف بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔

شرطِ پنجم: معاہدے کا مضمون اور اس کا اثر

بین الاقوامی قانون کے تحت معاہدے کے لیے ایسے مضمون کا انتخاب شرط ہے جس کا حصول ممکن بھی ہو اور قانوناً جائز بھی۔ اس کے جواز کی صورت یہ ہے کہ قانون میں اس کی اجازت ہو اور اخلاقی ضوابط بھی اسے صحیح تسلیم کرتے ہوں۔

ہمارے مسلمان فقہاء بھی معاہدے کا شرعی احکامات کے مطابق ہونا ضروری قرار دیتے ہیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی اسلامی ضابطے سے متصادم نہ ہو کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: **کل شرط لیس فی کتاب اللّٰہ باطل**۔ (۱) (ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہیں باطل ہے)۔ نیز آپؐ نے فرمایا ہے: **المسلمون علی شروطھم الاشرطا حرم حلالاً او احل حراماً**۔ (۲) (مسلمان اپنی شرائط کے پابند ہیں، ما سوائے ایسی شرط کے جو حلال کو حرام، یا حرام کو حلال، کر دے)۔

۱۔ بزار، طبرانی بروایت عبداللہ بن عباس

۲۔ نیل الأوطار ۵: ۲۵۴ بحوالہ ترمذی

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے:من عمل عملاً لیس علیہ أمرنا فھو رد ۔(۱) (جس نے کوئی ایسا عمل کیا جو ہمارے طریقے کے مطابق نہیں تو وہ عمل مردود ہے)۔ صلح حدیبیہ سے ذرا پہلے آپؐ نے فرمایا:والذی نفسی بیدہ لا یسألوني خطة یعظمون فیھا حرمات اللہ إلا أعطیتھم إیاھا ۔(۲)(اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہ لوگ مجھ سے کسی بھی ایسے لائحۂ عمل کا مطالبہ کریں جس میں یہ شعائر اللہ کی تعظیم کا وعدہ کریں تو میں اسے منظور کر لوں گا)۔

اس کی روشنی میں اَمان کا موضوع یہ ہے کہ کوئی مسلمان، حاکم ہو یا عام شخص، کسی شخص یا اشخاص کو امن و اطمینان فراہم کرنے کا عہد کرے، چاہے وہ کسی شہر کے رہنے والے ہوں یا کہیں قلعہ بند ہوں یا کسی بڑے علاقے میں رہتے ہوں۔ اس لیے کہ لفظ امان کا مفہوم یہی ہے۔ امان مل جانے کے بعد انہیں قتل کرنا یا ان کے اموال چھین لینا حرام ہو جاتا ہے۔ نیز ایسے لوگوں پر جزیہ عائد کرنا بھی جائز نہیں کیوں کہ ایسا کرنا غداری ہوگی جو کہ حرام ہے۔(۳)امان کے حکم میں امان یافتہ شخص کے ساتھ اس کے چھوٹے بچوں، بیوی، ماں، دادی اور ملازم بھی شامل ہوتے ہیں، بشرطیکہ امان کا اشارہ ملنے کے وقت وہ بھی اس کے ساتھ ہوں۔(۴)

ہمارے فقہاء کا یہ بھی کہنا ہے کہ معاہدۂ صلح کے لیے شرعی مصلحت کا پایا جانا ضروری ہے ورنہ یہ معاہدہ صحیح نہ ہوگا۔(۵) معاہدۂ صلح کی مصلحت یہ ہے کہ یا تو ان لوگوں کے اِسلام قبول کر لینے کا امکان ہو یا امن قائم ہو رہا ہو جس کی بنا پر فریقین

۱۔ مسلم بروایت عائشہؓ

۲۔ نیل الأوطار ۷:۳۱ بحوالۂ بخاری

۳۔ البدائع ۷:۱۰۷،البحر الرائق ۵:۸۱،منح الجلیل ۱:۷۳۰،القوانین الفقھیة ص۱۵۳، المھذب ۲: ۲۶۳، مغني المحتاج ۴:۲۳۸، کشاف القناع ۳:۸۲،القواعد، ابن رجب، ص ۲۴۱

۴۔ مخطوطہ طوالع الأنوار ،السندی الحنفی ۸:ص ۴۹-۵۰

۵۔ فتح القدیر ۴:۲۹۳،الدر المختار وحاشیة ابن عابدین ۳:۳۱۲، فتح العلي ۱:۳۳۲،الخرشي ۳:۱۷۴، طبع اوّل،الأم ۴:۱۱۰،تحفة المحتاج ۸:۱۰۰، کشاف القناع ۳:۸۸۔

میں باہم معاشی تعلقات قائم ہوں، یا ان لوگوں کے دارالاسلام میں ضم ہونے کا امکان ہو، یا مسلمانوں کو نقصان سے بچانا مقصود ہو، یا پڑوسیوں کے ساتھ معاہدہ کرکے دور کے دشمنوں کے خلاف مدد مل سکتی ہو۔(۳) باقی جہاں تک صلح کے نفاذ کا تعلق ہے تو یہ دشمن کے تمام افراد کے لیے کارآمد ہوگی۔

عقد ذمہ کی مصلحت

معاہدۂ ذمہ کی مصلحت یہ ہے کہ امن و سلامتی کو استحکام ملتا ہے، مل جل کر پر امن رہنے کا عہد کیا جاتا ہے اور مشترکہ ماحول میں رہنے سے غیر مسلموں کو اسلام کی خوبیاں معلوم کرنے کا موقع ملتا ہے، جس سے ان کے دلوں میں دینِ حق کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ ایسے ماحول کی بدولت ہی معاہدے کے تحت ملنے والے تحفظ کا عملی ثبوت ملتا ہے ۔ اسی سے غیر مسلموں کی جان، مال، املاک اور اراضی کو تحفظ ملتا ہے، ان کی عزت و آبرو بھی محفوظ ہو جاتی ہے اور حالتِ جنگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔

معاہدات میں فریقین کے علاوہ دوسروں کی شمولیت

بین الاقوامی قانون کے ماہرین عام طور پر بند معاہدات اور کھلے معاہدات میں فرق کرتے ہیں۔ بند معاہدات سے مراد ایسے معاہدات ہیں جو ایسی عبارات پر مشتمل نہ ہوں جن سے معاہدے کے بعد دیگر ریاستوں کی اس میں شمولیت کی گنجائش ملتی ہو ۔ ایسے معاہدات میں شمولیت کے لیے معاہدے کے اصل فریقوں سے بات چیت کرنا اور ان کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

کھلے معاہدات سے مراد ایسے معاہدات ہیں جن میں درج شدہ عبارات سے دیگر ممالک کی ان میں شمولیت کا جواز ملتا ہو ۔ (۲)

۱۔　آثار الحرب و مراجعه، ص ۶۲۹، طبع دوم

۲۔　القانون الدولي، حافظ غانم، ص ۵۰۴

اسلام میں دونوں طرح کے معاہدات جانے پہچانے ہیں۔ بند معاہدات کی مثال کسی شہر یا صوبے کے باشندوں کو عام امان دینے یا کسی اسلامی ملک کی شہریت قبول کرنے والے غیر مسلم افراد کو عقدِ ذمہ کی طرح ہے۔عارضی صلح یا وقتی معاہدہ کبھی بند معاہدے کی طرح ہوتا ہے اور کبھی کھلے معاہدے کی طرح۔ سن ۶ ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مکہ کے درمیان صلح حدیبیہ کھلے معاہدات کی ایک قسم تھی۔ اس میں ایسے الفاظ موجود تھے جن کی رو سے اس معاہدے میں دیگر قبائل بھی شریک ہو سکتے تھے۔ اس کے کچھ الفاظ یوں ہیں:

من أحب أن يدخل في عقد محمد وعهده دخل فيه، ومن أحب أن يدخل في عقد قريش وعهدهم دخل فيه.

جو چاہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے معاہدے اور عہد میں شریک ہو جائے اور جو چاہے قریش کے ساتھ ان کے معاہدے اور عہد میں شریک ہو جائے۔(۱)

یہ ایسے الفاظ تھے جن کی رو سے بقیہ عرب قبائل کسی بھی فریق کے ساتھ شامل ہو سکتے تھے۔ چناں چہ بنو بکر نے قریش کے ساتھ معاہدے میں شمولیت اختیار کی اور ان کے عہد میں شامل ہوگئے، جب کہ بنو خزاعہ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوئے۔

معاہدے کی مدت

حالیہ بین الاقوامی معاہدات میں معاہدے کی مدت کا تعین کیا جاتا ہے اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک معاہدہ قابل عمل رہے گا، یا اس کی بعض شقوں پر عمل در آمد کی مدت طے کردی جاتی ہے۔ عموماً اس مقصد کے لیے معاہدات میں باقاعدہ عبارات شامل ہوتی ہیں۔(۲)

۱۔ تاريخ الطبري ۳:۱۱۱، نيل الأوطار ۸:۳۱-۳۹

۲۔ القانون الدولي، حافظ غانم، ص ۵۹۵

اسلام میں معاہدے کے نفاذ کا آغاز اس کے طے ہوجانے سے ہی ہوجاتا ہے، اِس کے لیے تحریری شکل میں آنے، دستخط ہوجانے یا باقاعدہ اسے منظر عام پر لانے اور تصدیق کرنے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بشرطیکہ معاہدہ ملک کے کسی ریاستی نمائندۂ مجاز کی جانب سے عمل میں لایا گیا ہو۔البتہ معاہدے کے ختم ہونے کی تاریخ کے لیے شرعاً ایسے الفاظ معاہدے کے متن میں شامل ہوا کرتے ہیں، اور معاہدے کی نوعیت کے اعتبار سے اس کا حکم بھی بدلتا رہتا ہے۔ چناں چہ جمہور فقہاء کے نزدیک امان یافتہ کو اسی وقت امان حاصل ہوجاتی ہے جب اسے امان دہندہ کی طرف سے اس کی پیشکش کا علم ہو جائے۔ فقہاءِ شافعیہ کے نزدیک امان کا آغاز پیش کش قبول کرنے سے ہوتا ہے اور اس کی انتہا طے کردہ عرصہ کے مطابق ہوتی ہے۔

امان کی زیادہ سے زیادہ مدت

شافعیہؒ اور مالکیہؒ کا کہنا ہے کہ عارضی صلح کی طرح امان کا عرصہ بھی چار ماہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے، بشرطیکہ امان یافتہ حکومتی سفارت کار یا سیاسی نمائندہ نہ ہو کیوں کہ اس کی امان کا دورانیہ اس کے فرض منصبی کی تکمیل ہوتے ہی ختم ہوجاتا ہے ۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب مسلمان طاقت میں ہوں۔ اگر مسلمان کمزور ہوں تو مسلمانوں کا حاکم دورانیہ طے کرنے پر غور کرے گا اور اس صورت میں اس کے لیے عارضی صلح کی طرح امان کا دورانیہ دس سال تک بڑھانا جائز ہوگا۔ اگر امان کا دورانیہ مقرر نہ کیا گیا ہوتو اس کی مدت چار ماہ سمجھی جائے گی۔ یہ ساری تفصیل مردوں کو امان دینے سے متعلق ہے، عورتوں کو امان دینے کے بارے میں مدت کو مقید کرنے کی ضرورت نہیں۔ امان کی مدت کے اختتام پر امان یافتہ شخص کو اس کی جائے امن تک پہنچایا جائے گا۔(۱)

حنفیہؒ، شیعہ، امامیہ اور زیدیہ کا کہنا ہے کہ امان کا دورانیہ ایک سال تک نہیں

۱۔ الأم ۴:۱۱۱، الوجیز ۲:۱۹۴، تحفة المحتاج ۸:۶۱، أحکام القرآن، ابن العربی ۲:۸۸۳

پہنچنا چاہیے۔ اسے صرف ضرورت کی حد تک رکھا جائے تا کہ کہیں امان لینے والا شخص دشمن کا جاسوس یا مددگار نہ بن جائے۔ ان کے موقف کی دلیل بھی یہی ہے کہ امان کے معاہدے میں صرف ضرورت کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔(۱)

دیگر فقہی مذاہب میں سے حنابلہؒ کی رائے میں زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔ چناں چہ ان کے نزدیک جزیہ لیے بغیر بھی کسی امان کے طالب یا سیاسی مندوب کو تحدید مدت کے بغیر بھی امان دی جا سکتی ہے اور مدت مقرر کر کے بھی۔ اگر مدت مقرر کی گئی ہو تو اس میں بھی کوئی قید نہیں خواہ یہ طویل عرصے کے لیے ہو یا مختصر عرصے کے لیے۔ البتہ جنگ بندی معاہدہ مدت مقررہ کیے بغیر کرنا جائز نہیں۔(۲)

ہماری اسلامی تاریخ میں سیاسی وفود اور نمائندوں کو خلیفہ منصور اور خلیفہ ہارون الرشید کے ادوار میں تین یا چار سال تک امان دی جا چکی ہے۔(۳) ان علماء کی دلیل یہ قیاس ہے کہ سیاسی وفود یا نمائندوں کو جس طرح اتنے عرصہ تک امان دی جاتی ہے، اسی طرح دوسرے لوگوں کو بھی طویل عرصہ تک امان دینا جائز ہونا چاہیے۔ کیوں کہ دونوں میں علت نمائندگی ہے جو ایک طرح سے سب میں پائی جاتی ہے۔(۴)

تاہم عارضی صلح کے معاہدے کی مدت کا مقرر کیا جانا تمام فقہاء کے نزدیک ضروری ہے۔ ایسا معاہدہ غیر معینہ مدت تک کے لیے نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ایک مقرر مدت تک کا معاہدہ ہے۔ غیر معینہ مدت کے لیے ایسا معاہدہ کرنا جہاد کو معطل کرنے کے مترادف ہے۔

۱۔ شرح السیر الکبیر ۱:۳۲۰، الفتاویٰ الهندیة ۲:۲۳۴، البحر الزخار ۵:۴۵۰، الخلاف فی الفقه، الطوسي ۲:۵۱۲

۲۔ المحرر في الفقه الحنبلي ۲:۱۸۰، كشاف القناع ۳:۸۲

۳۔ السلم والحرب في الشريعة، پروفیسر مجید خضوری، ص ۲۴۷ وما بعد

۴۔ فتح القدير ۴:۲۹۳، الدسوقي مع الدردير ۲:۱۹۰، الأم ۴:۱۱۰، حاشية قليوبي و عميرة ۴:۲۳۷، المغني ۸:۴۵۹

البتہ شافعیہؒ نے واضح طور پر کہا ہے کہ معاہدۂ صلح کے عرصہ کا تعین مَردوں کی جان تک محدود ہے۔ جہاں تک اَملاک کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں مستقل معاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح خواتین کے ساتھ بھی مدت کی تعیین کے بغیر معاہدۂ صلح کیا جا سکتا ہے۔(۱)

جنگ بندی کی مدت میں شافعیہؒ، بعض حنابلہؒ اور امامیہ کا نقطۂ نظر

اگر مسلمان طاقت میں ہوں تو معاہدۂ صلح کی مدت چار ماہ سے شروع ہوکر ایک سال کے اندر اندر ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿بَرَاءَةٌ مِنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ﴾ [البراءۃ:۱] (یہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اِن مشرکوں سے اِعلانِ براءت ہے جن سے تم لوگوں نے عہد کر رکھا تھا، اب (ان سے کہہ دو کہ) چار ماہ تک اور زمین میں خوب چل پھر لو)۔ اور اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان ابن امیہ کے ساتھ فتح مکہ کے سال چار ماہ کی مدت کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ کیا تھا۔ یہ دورانیہ ایک سال کے عرصہ تک اس لیے نہیں بڑھانا چاہیے کہ ایک سال گزرنے کے بعد جزیہ فرض ہو جاتا ہے۔

اور اگر مسلمان کمزور ہوں تو صلح کا معاہدہ ضرورت کے مطابق زیادہ سے زیادہ دس سال تک کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ عارضی صلح کی آخری حد ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ اتنی ہی مدت کے لیے معاہدہ کیا تھا۔(۲)

اگر اس پورے عرصے کے دوران مسلمانوں کو قوت حاصل نہ ہو سکے تو مسلمانوں

۱۔ الأم ۴:۱۱۰، حاشیة قلیوبي و عمیرة علی المحلی علی المنهاج ۴:۲۳۷

۲۔ الأم ۴:۱۱۱، نهایة المحتاج ۷:۲۳۵، الروضة البهیة عند الإمامیة ۱:۲۲، المغني ۸:۴۶۰، زادالمعاد ۲:۷۶، کشاف القناع ۳:۸۸، الاختیارات العملیة، ص ۱۸۸

کا حاکم اسی قدر عرصے، یا اس سے کم مدت کے لیے اس امید پر معاہدے کی تجدید کر سکتا ہے کہ شاید اس دوران مسلمانوں کو طاقت نصیب ہو جائے۔اگر یہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی صلح کی ضرورت باقی رہے تو نئے سرے سے معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔(۱)

حنفیہؒ، مالکیہؒ اور شیعہ زیدیہ کے نزدیک(۲) جنگ بندی کے معاہدے کے لیے کوئی عرصہ متعین نہیں۔ ان کی رائے میں یہ معاملہ مسلمان حاکم کی صوابدید اور وقت کی ضرورت پر چھوڑا گیا ہے، کیوں کہ معاہدہ صلح دس سال تک کے لیے جائز ہے۔ اس میں عقد اجارہ کی طرح مسلمانوں کی ضرورت اور مفاد کے مطابق اضافہ کیا جاسکتا ہے۔بعض اوقات صلح میں جنگ کی نسبت زیادہ مفاد ہوتا ہے ۔

حنابلہؒ میں سے ابوالخطاب نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ امام احمدؒ کے قول سے بظاہر تو یہ لگتا ہے کہ مسلمان حاکم اپنے اجتہاد اور امت کے مفاد کے تحت اپنی صوابدید سے دس سال سے زیادہ عرصہ تک کے لیے بھی معاہدہ صلح کر سکتا ہے۔ حنابلہؒ کے نزدیک بظاہر زیادہ صحیح رائے یہی ہے۔(۳)

میں جمہور فقہاء کی اس رائے کی تائید کرتا ہوں کہ ضرورت کے مطابق کسی بھی عرصے کے لیے صلح کا معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ابن القیمؒ وغیرہ نے اس رائے کے لیے اہل خیبر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدے کو دلیل بنایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اہلِ خیبر پر غلبہ پالیا تو ان سے اِس شرط پر صلح کی کہ میں جب چاہوں گا تمھیں خیبر سے نکال دوں گا۔ چوں کہ بعد میں اس کو منسوخ کرنے والا کوئی حکم نہیں آیا لہٰذا صحیح رائے یہی ہے کہ ایسا کرنا جائز اور صحیح ہے۔(۴)

۱۔ الأم ۴:۱۱۰، نهاية المحتاج ۷:۲۳۵

۲۔ فتح القدير ۴:۲۹۳، الخرشي ۳:۱۷۵، فتح العلي ۱:۳۳۳، الدسوقي مع الدردير ۲:۲۹۰، البحر الزخار ۵:۴۴۶

۳۔ المغني ۸:۴۶۰، زادالمعاد ۲:۷۶

۴۔ زادالمعاد ۲:۷۷

اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کے ساتھ طویل المیعاد معاہدۂ صلح کرنا جائز ہے۔ اس لیے کہ بیرونی تعلقات میں بنیادی بات امن ہے، نہ کہ جنگ۔ نیز اس آیت کریمہ سے بھی ایسی صلح کا جواز ملتا ہے:﴿فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا﴾ [النساء: ۹۰](تو اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے)۔ یہ ایک محکم آیت ہے جس کا منسوخ ہونا ثابت نہیں۔ نیز طویل المیعاد معاہدہ صلح کو باقی رکھنا وفائے عہد کا تقاضا ہے اور قرآنِ مجید سے بھی ایسی صلح کی ممانعت بھی ثابت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ معاہدہ کرنے والے معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو فرمایا: وَفُّوا لهم وَاستعينوا باللّٰه عليهم۔(۱) (تم معاہدے کی پابندی کرو اور ان کے مقابلے میں اللہ سے مدد مانگو)

معاہدۂ ذمہ یا معاہدۂ جزیہ

یہ غیر مسلموں کے ساتھ کیا جانے والا طویل المیعاد معاہدۂ صلح ہوتا ہے جس کے تحت غیر مسلم دارالاسلام میں ملکی باشندوں کے طور پر رہ سکیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ کا مقصد یہی بتایا ہے کہ غیر مسلم معاہدہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔(۲) چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾ [التوبة: ۲۹](جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے

۱۔ العلاقات الدولية في الإسلام، محمد ابوزہرہ، ص ۱۱۱، آثار الحرب، وہبہ الزحیلی، ص ۶۸۰

۲۔ جزیہ ایک نقد ٹیکس کا نام ہے جو غیر مسلم افراد پر عائد کیا جاتا ہے اس لیے کہ ان کی حفاظت اور ان کا دفاع کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ اگر وہ دفاع کرنے میں شریک رہیں تو یہ ٹیکس معاف ہو جاتا ہے۔ اس کی مقدار ایک دینار سے چار دینار تک ہے، غریب اور امیر کے اعتبار سے۔ الأحكام السلطانية، ماوردی، ص ۱۳۹، آثار الحرب، ص ۶۹۸-۷۰۳

اِن لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے، اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے، ان سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں)۔ چھوٹے بننے سے مراد اسلامی احکام کی پابندی کرنا اور جزیہ دینے کا مقصد بھی تمام فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ وہ اسلامی حکومت کو قبول کر لیں اور احکام کی پابندی کریں۔

جنگ کا بنیادی مقصد جزیہ وصول کرنا نہیں بلکہ یہ تو غیر مسلموں کی طرف سے ایک علامت ہے، وفا داری کی ، جنگ سے باز رہنے کی، اور تبلیغِ اسلام میں رکاوٹ نہ بننے کی، اور ریاست کے مفادات میں شرکت کی، اس بات کے عوض کہ ان کی جان اور مال کو تحفظ دیا جائے گا۔(۱)

معاہدات کی اقسام اور ان کے اغراض و مقاصد

اہداف و مقاصد کی رو سے معاہدات کی متعدد اقسام ہیں۔ چناں چہ کبھی تو تجارتی مقصد کے لیے معاہدہ کیا جاتا ہے، کبھی اسلام کی اشاعت اور اور تہذیب وتمدن کی ترویج کے لیے معاہدہ کیا جاتا ہے اور کبھی دیگر انسانی اور معاشرتی مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے، جیسے قیدیوں کے تبادلہ کے لیے، بیماروں کے علاج معالجے کے لیے، مقتولین کی لاشوں کی حوالگی اور ان کی تدفین کے لیے۔ کبھی سیاسی مقاصد کے لیے معاہدہ کیا جاتا ہے۔ کبھی جنگ کے خاتمے کے لیے یا امن و سلامتی کو مستحکم کرنے اور اس کی جڑوں کو مضبوط بنانے کے لیے اور کبھی پڑوسی ممالک کے ساتھ تعلقات مضبوط کرنے اور تعاون بڑھانے کے لیے معاہدہ کیا جاتا ہے۔

تجارتی معاہدات

دوطرفہ بیرونی تجارت کا نظام قائم کرنے کے لیے تجارتی معاہدہ کرنا اسلام میں

۱۔ الإسلام و العلاقة الدولية ، پروفیسر شیخ محمود شلتوت، حاشیہ، ص ۳۵

میں جائز ہے۔اس لیے کہ اصولاً اسلام چاہتا ہے کہ غیرمسلموں کے ساتھ تعلقات اس طرح قائم ہوں کہ آزادانہ تجارت ہو اور ضروری اشیاء کی فراہمی ممکن ہو۔ دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی ذیلی شاخوں کے درمیان طے پانے والے حلف کو قصی بن کلاب کی موت کے بعد برقرار رکھا تھا۔قریش قصی بن کلاب کو کھانے کا سامان مہیا کرتے تھے جس سے وہ حاجیوں کے لیے کھانا فراہم کیا کرتے تھے۔ اس معاہدے کا مضمون حاجیوں کی خدمت کی ذمہ داریاں تقسیم کرنا تھا، اس طرح کہ کوئی قبیلہ پانی پلائے، کسی کے پاس جھنڈا ہو اور کوئی مشاورت کا اہتمام کرے۔چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حلف کو برقرار رکھا اور فرمایا کہ عہد جاہلیت میں کیے گئے اِس عہد کو اسلام نے مزید مستحکم کیا ہے۔(۱) مطلب یہ کہ اسلام بھلائی کے کاموں ، حاجیوں کے لیے سہولیات مہیا کرنے اور حق وسچائی کے لیے کیے گئے عہد کی مزید تائید کرتا ہے۔(۲) اس سلسلے میں مزید دلائل غیرجانبداری کی بحث کے تحت آئیں گے۔

ماضی میں عربوں اور اہل یورپ کے درمیان کئی تجارتی معاہدات ہو چکے ہیں جن میں سے ایک معاہدہ ۹۱۳ھ میں ہوا تھا۔ یہ معاہدہ مراکش کے شہر بادیس کے امیر اور وینس (بندقیہ) کے باشندوں کے درمیان ہوا تھا جس کے تحت وینس والوں کو بادیس میں ٹھہرنے اور کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی اور وہاں ان کی جان و مال کو تحفظ دیا گیا۔ اسلامی حکومتوں نے تاجروں کو بہت سی مراعات دی ہوئی تھیں۔مشرقی ایشیا اور افریقہ میں تجارت اور کاروبار بھی اسلام کی اشاعت کا ایک سبب تھا۔ البتہ تجارتی لین دین پر کچھ پابندیاں عائد تھیں تاکہ اسلحے اور جنگی وسائل کو اسلامی ملک سے باہر نہ لے جایا جا سکے ۔ اسی طرح شراب، خنزیر اور دیگر ناجائز اشیاء کی درآمد پر پابندی تھی،خواہ یہ کاروبار کرنے والے مسلمان ہوتے یا غیر مسلم ہوتے۔ ان اشیاء کے علاوہ دیگر قسم کی اشیاء جیسے کھانے پینے کی اشیاء، لباس، کپڑے،لکڑی، غیر معدنیاتی

۱۔ بروایت ترمذی و احمد

۲۔ سیرۃ ابن ہشام ۱:۱۳۰-۱۳۲،البدایة و النهایة ۲:۲۹۱، تحفة الأحوذي ۲:۳۹۲

خام مال یا کیمیائی مواد، زرعی اشیاء یا غیر جنگی صنعتی اشیاء،ان سب کے تبادلے اور کاروبار کی اجازت تھی۔ اور یہ اجازت دورانِ جنگ بھی برقرار رہتی تھی۔(۱)

سیاسی معاہدات

سیاسی معاہدہ کبھی دائمی ہوتا ہے، کبھی عارضی، اور اس بات کا تعین معاہدے کے فریق کرتے ہیں، صرف معاہدے کے مضمون سے اس کا تعین نہیں ہوتا۔ چناں چہ مدت مقرر کرکے اگر گنتی کے لوگوں کے ساتھ معاہدہ کیا جائے تو وہ امان تصور کیا جاتا ہے، اور اگر شمار کی تحدید کے بغیر کسی متعین مقصد کے لیے کیا جائے تو وہ صلح سمجھا جاتا ہے۔

اول: عہدِ امان

امان خاص بھی ہوتی ہے اور عام بھی ۔ خاص امان ایک فرد یا دس کی تعداد تک افراد کو جو امان دی جائے وہ خاص امان ہے۔ میری نظر میں معاہدے کی بجائے اسے عہد کا نام زیادہ بہتر رہے گا کیوں کہ ہمارے زمانے میں معاہدات وہ ہوتے ہیں جو ممالک یا عالمی تنظیموں کے درمیان کیے جائیں۔ قانون دانوں کے ہاں معاہدے اور عہد کا جو تصور ہے فقہاء کے ہاں ان میں سے لفظ عہد میں زیادہ وسعت پائی جاتی ہے، جیسا کہ معاہدات کی بحث کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے۔

عام امان

وہ ہوتی ہے جو لوگوں کی ایک کثیر تعداد کے لیے ہو تاہم وہ تعداد تقریباً محدود ہو جیسے ایک صوبے کے لوگ۔ اسلام میں امان کا نظام اسلامی ملک میں کسی اجنبی شخص کی جان و مال کو ہر وہ تحفظ دینے پر مشتمل ہے جو آج کل اس سے مراد لیا جاتا ہے۔ دوستانہ تعلقات کا قیام بھی اسی میں شامل ہے۔ امان کا نظریہ امن و سلامتی کے استحکام کے لیے ایک اہم بنیاد تھا۔ مثال کے طور پر صلیبی جنگوں میں محض روا داری کی بنیاد پر عیسائی وفود کو امان دینا، بین الاقوامی روابط کی بنیاد شمار ہوتا ہے۔(۲)

۱۔ آثار الحرب، ص ۵۱۲؛ ۵۱۳۔ کتاب الخراج، ابو یوسف، ص ۱۸۸ وما بعد

۲۔ أصول العلاقات السیاسیة الدولیة ، ڈاکٹر احمد العمری، ص ۴۹

امان دینے کے جواز کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ﴾ [التوبة: ٦](اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اسے پناہ دے دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کی محفوظ جگہ تک پہنچا دو اس لیے کہ یہ بے خبر لوگ ہیں)۔اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ابن کثیرؒ نے کہا ہے: ''جو شخص دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف کسی سفارتی کام، یا کاروبار، کے لیے آئے، یا صلح کی تلاش میں، یا جنگ بندی کی بات کرنے، یا جزیہ دینے یا اس طرح کے کسی دوسرے کام کی خاطر آئے اور مسلمانوں کے حاکم یا اس کے نائب سے امان مانگے تو جب تک وہ دارالاسلام میں ٹھہرا رہے اسے اس وقت تک امان دی جائے گی یہاں تک کہ وہ اپنے ملک میں واپس چلا جائے''(۱)۔ قرطبیؒ نے اس پر یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ کافر لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لیے ملنا چاہتے تھے کہ آپؐ سے صلح اور دیگر دنیاوی مفادات کے بارے میں بات کرسکیں۔ (۲)

سفیروں اور سرکاری وفود کو امان دینا

اسلام نے وفود اور سفیروں کے لیے مختلف پہلوؤں سے تحفظ، دیکھ بھال، محفوظ مقام اور مناسب احترام دینے کی ذمہ داری اٹھائی ہے، اگرچہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی بھی کریں۔ یہ اس لیے تاکہ یہ لوگ اپنا کام سرانجام دے سکیں اور دنیا کے لیے بھلائی اور سلامتی کے حصول کا ذریعہ بن سکیں۔ یہ بات قرآن کریم کی سورۃ توبہ کی مذکورہ بالا آیت وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ......[التوبة: ٦]میں بتائی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور عملی سنت سے بھی یہ ثابت ہے۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیلمہ کذاب کے قاصدوں کو قتل نہیں کیا بلکہ فرمایا: لو كنتُ قاتلاً

۱۔ تفسیر ابن کثیر ۲:۳۳۳، طبع البابي الحلبي

۲۔ تفسير القرطبي ۸:۷۷، طبع دار الكتب المصرية

رسولاً لقتلتکما (اگر میں قاصدوں کو قتل کرنے والا ہوتا تو تم دونوں کو قتل کر دیتا)۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا کہنا ہے کہ: رائج طریقہ یہی رہا ہے کہ فرستادوں کو قتل نہیں کیا جاتا۔(۱) اسی طرح قریش نے ابو رافع کو حضورصلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا تو اس نے حضورؐ کو دیکھتے ہی اسلام قبول کر لیا۔ لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قریش کے پاس واپس بھیج دیا اور فرمایا: إني لا أخبس بالعهد ولا أحْبُسُ البُرُود، ولکن ارجع إليهم، فإن کان في قلبك الذي فيه الآن فارجع (۲) (میں معاہدہ نہیں توڑتا، نہ ہی فرستادوں کو قیدی بناتا ہوں، اس لیے تم قریش کے پاس واپس چلے جاؤ۔ اگر تمہارے دل میں موجودہ ایمان کی طرح ایمان قائم رہا تو پھر واپس چلے آنا۔ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ سفیروں اور وفود کو تحفظ اور امان دینا جائز ہے اور سیاسی مندوب کو مسلمان ممالک میں معاہدۂ امان کے بغیر بھی آنے کی اجازت ہے۔(۳)

فقہاء نے دشمن کے وفود کے ساتھ بدعہدی اور غداری کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چاہے دشمن اپنے ہاں موجود مسلمان یرغمالیوں کو قتل بھی کر ڈالے، پھر بھی ان کے وفود کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے کہ بعض صحابہؓ کا قول ہے کہ غداری اور عہد شکنی کیے بغیر اگر عہد کو پورا کیا جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ بدعہدی اور غداری کے بدلے بدعہدی اور غداری کی جائے۔(۴)

۱۔ نیل الأوطار ۸: ۲۹

۲۔ سنن ابو داؤد ۳: ۱۱۰، منتخب کنز العمال بحوالہ مسند احمد ۲: ۲۹۷

۳۔ شرح السیر الکبیر ۱: ۱۹۹، کتاب الخراج، ابو یوسف، ص ۱۸۸، القوانین الفقهیه، ابن جزی، ص ۱۵۴، المبسوط السرخسي ۱۰: ۹۲، فتح القدیر ۴: ۳۵۲، مغني المحتاج ۴: ۲۳۷، البحر الرائق ۵: ۱۰۹، الروضة الندية ۲: ۳۵۳، تصحیح الفروع ۳: ۶۲۷

۴۔ السیر الکبیر ۱: ۳۲۰، کتاب الخراج، ص ۱۸۸، المبسوط ۱۰: ۸۹، الشرع الدولی فی الإسلام، ڈاکٹر نجیب الارمنازی، ص ۱۶۵ وما بعد، آثار الحرب، ڈاکٹر وھبہ الزحیلی، ص ۳۳۰ وما بعد۔ صحابی کے اس جملے کے لیے ملاحظہ ہو سنن ابو داؤد ۲: ۷۶

یہ تو اسلامی قانون کی بات ہوئی، باقی جہاں تک معاصر قانون کا تعلق ہے تو اس میں سفیروں کے ساتھ بدعہدی اور غداری کو ممنوع قرار دینے کا ضابطہ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۴۹ء میں آکر تیار ہوا۔ اس سے پہلے عیسائی لوگ مسلمان سفیروں کو قتل کرتے رہے مگر اسلامی تعلیمات کی پابندی کرتے ہوئے صلاح الدین ایوبی نے کبھی بھی عیسائیوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک نہیں کیا۔

اسلام اور سیاسی نمائندگی

سفارت کاری وقتی ہوا کرتی تھی، مستقل نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے کہ قوموں کے درمیان اکثر و بیشتر جنگیں ہوا کرتی تھیں اور ان کے باہمی تعلقات نہایت کمزور تھے۔(۱) سترہویں صدی عیسوی میں مستقل سیاسی نمائندگی کے وجود میں آنے سے قبل سیاسی وفود کو بیرونی ممالک میں عارضی اقامت و رہائش کا حق حاصل تھا۔

سیاسی مندوب کو دی گئی صریح یا ضمنی امان کی تجدید کے نظریے پر عمل کرتے ہوئے اسلام میں مستقل سیاسی نمائندگی کے اصول کو قبول کرنے میں کوئی مانع نہیں، یہاں تک کہ اس کی حسبِ ضرورت مہم ختم ہوجائے ۔اس کے لیے کسی خصوصی امان کی ضرورت نہیں۔حنبلی فقہاءؒ نے پناہ لینے والے اور سیاسی مبعوث کوکسی خاص مدت کی قید کے بغیر مطلقاً امان دینے کو جائز قرار دیا ہے۔(۲) اس جواز کو اِس نقطۂ نظر سے بھی تقویت ملتی ہے کہ غیرمسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی اصل امن ہے، نہ کہ جنگ۔خصوصاً اس لیے بھی کہ معاملہ بالمثل کا اصول باہمی سفارت کاری کا بنیادی اصول ہے۔

بین الاقوامی عرف نے سیاسی مندوبین اور قونصلروں کے لیے کچھ مخصوص امتیازات منظور کیے ہیں تاکہ وہ اپنے کارہائے منصبی بلارکاوٹ جاری رکھ سکیں اور مساوات کی بنیاد پر متبادل احترام کے اصول پر عمل کیا جائے۔(۳)

۱۔ رسل الملوك و مقدمته ، ڈاکٹر صلاح المنجد، ص ۹۳

۲۔ المحرر في الفقه الحنبلي ۲:۱۸۰، کشاف القناع ۳:۸۲

۳۔ حامد سلطان، ص ۱۷۳، حافظ غانم، ص ۱۶۸-۱۷۵۔ ابوہیف، ص ۴۴۲ وما بعد، طبع ۱۹۵۹ء

امتیازات یا تحفظ کی یہ صورتیں تین طرح کی ہیں، جو کہ حسب ذیل ہیں:

سفیر کا شخصی تحفظ: سفارتی مندوب کی ذات، اس کی اشیاء، اس کے دفتری سامان اور سفارت خانے کا تحفظ۔ اس کی رو سے ان تمام چیزوں سے تعرض اور ان پر کسی قسم کی زیادتی ممنوع ہے۔

عدالتی تحفظ: اس کی رو سے سفارتی مندوبین کو دیوانی، فوجداری اور ریاست کی انتظامی کارروائی سے تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

مالی تحفظ: اس امتیاز کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ بالمثل کے طور پر سفارت کار ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیئے جاتے ہیں۔

ان امتیازات کے بارے میں اسلام کا موقف حسب ذیل ہے:

شخصی تحفظ کے اس امتیاز کو اسلام امان کے ضابطے کے تحت برقرار رکھتا ہے۔ امان دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سفیر یا نمائندے کی ذات، مال، اہل وعیال، ماتحت عملے، اس کے سامان اور سفارتی ڈاک کو نہ چھیڑا جائے۔ اگر وہ جاسوسی کرے یا اپنے ملک کے مفاد کی خاطر ضروری معلومات حاصل کرنا چاہے تب بھی اس بنیاد پر اس کا یہ تحفظ واپس نہ لیا جائے گا۔ کیوں کہ فقہاء کا فیصلہ ہے کہ امان اس صورت میں واپس لی جا سکتی ہے جب امان یافتہ کا کام محض جاسوسی کرنا ہو۔ مستقل سفارتی نمائندگی کے ذریعے جب ممالک کے درمیان باہمی طور پر سفارت کاروں کا تعین ہوتا ہے تو طرفین کو ایک جیسے مفادات حاصل کرنے کے یکساں مواقع میسر آتے ہیں۔

اِسلام اس طرح کے معاملے کو اس بنا پر تسلیم کرتا ہے کہ اس سے جو فوائد حاصل ہوسکتے ہیں وہ عموما ان جزوی نقصانات سے زیادہ ہوتے ہیں جو امکانی طور پر ریاستِ اِسلامیہ کو اس کی وجہ سے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ اصول فقہ کے اِس قاعدے پر مبنی ہے: يرتكب أخف الضررين لإزالة أشدهما، والحكم يتبع المصلحة الراجحة (بڑے نقصان کے ازالے کے لیے چھوٹا نقصان برداشت کیا جاتا ہے اور کسی مسئلے کا حکم

ترجیحی مصلحت کے تابع ہوتا ہے)۔

عدالتی تحفظ کے بارے میں اسلامی فقہ اور معاصر بین الاقوامی دستور میں فرق ہے۔ اس لیے کہ فقہاء امان یافتہ شخص اور سفارتی نمائندے کو اسلامی ملک کے اندر دیوانی اور فوجداری اعمال کے ارتکاب پر قابل مواخذہ ٹھہراتے ہیں، اس لیے کہ امان لینے والا شخص، امان کی طلب اور دارالاسلام میں رہائش کے ساتھ، ہی اسلامی احکامات کا پابند ہو جاتا ہے۔(۱) سزا کا تصور یہ ہے کہ وہ بگاڑ کو دور کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اب جو بھی مسلمانوں کی سرزمین پر رہتا ہو، چاہے عارضی طور پر ہی سہی، وہ فساد سے اجتناب کا پابند ہوتا ہے۔ ایک مجرم شخص سفارتی مشن کو پورا کرنے کا اہل نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی تحفظ ملنے کا مستحق ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس بارے میں ذرا نرمی سے کام لیا ہے اور حقوق اللہ سے متعلق جرائم، جیسے زنا اور چوری وغیرہ میں امان لینے والے کو مواخذے سے مستثنیٰ رکھا ہے۔

میری نظر میں، موجودہ بین الاقوامی دستور کو ملحوظ رکھتے ہوئے، امان لینے والے شخص کو ایسی تعزیری سزاؤں کے نفاذ سے بھی مستثنیٰ ہونا چاہیے جن کا ثبوت قرآن و حدیث سے نہ ملتا ہو کیوں کہ تعزیری سزاؤں کا تعین اس کے اپنے حاکم کا کام ہے۔(۲)

اسلامی ملک کے اندر کسی مجرم پر مقدمہ چلانے میں کوئی خطرہ نہیں کیوں کہ انصاف اور دادرسی اسلامی عدالت کی نمایاں علامت ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾[المائدة: ۸](کسی گروہ سے بغض و عداوت تمہیں اس پر نہ ابھارے کہ انصاف نہ کرو۔ عدل کرو یہ خداترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے)۔ دورِ حاضر کی ریاستوں کا دستور یہ ہے کہ سفارتی نمائندے پر مقدمہ چلانے کے لیے اس کی اپنی ریاست سے رابطہ کیا جاتا ہے۔ البتہ کسی بھی ریاست کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ ایسے نمائندے کو ناپسندیدہ شخص قرار

۱۔ کتاب الخراج، ص ۱۸۹، شرح السیر الکبیر ۱:۲۰۶، فتح القدیر ۴:۱۵۵ وما بعد، الفروق قرافی ۳:۱۷۴

۲۔ الجریمة والعقوبة، محمد ابوزہرہ، ص ۳۳۵، العلاقات الدولية في الإسلام، ابوزہرہ، ص ۷۳

دے کر متعلقہ ریاست سے اسے واپس بلانے کا مطالبہ کرے، بلکہ خطرناک جرائم میں اسے زبردستی واپس بھیجا جا سکتا ہے اور اگر کوئی ریاست اپنی سلامتی کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھے تو اسے گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔(۱)

مالی تحفظ جس کی بنیاد بین الاقوامی دستور میں معاملہ بالمثل (یکساں سلوک) ہے، فقہِ اسلامی میں اسے بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ چناں چہ ہمارے فقہاء نے امان لینے والے شخص کو ان ٹیکسوں سے مستثنیٰ رکھا جو ان کے زمانے میں رائج تھے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ سفراء اور حکومتی نمائندوں کو عشور یعنی کسٹم ڈیوٹی سے معاف رکھا جائے۔(۲)

اس مذکورہ استثناء میں دو طرفہ یکساں سلوک کو ملحوظ رکھا گیا ہے، جیسا کہ سفارتی اور قونصلی عملے کے حوالے سے عالمی دستور کا طریقہ ہے۔(۳)

رہا خراج کا معاملہ تو یہ سراسر حاکم وقت کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ جس قدر چاہے کم کر دے اور جس کو چاہے اس سے مستثنیٰ قرار دے، خصوصاً ایسی صورت میں جب دارالحرب میں امان یافتہ مسلمان کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہو۔

فقہاء نے ایک سال سے کم عرصے تک امان لینے والے غیر مسلم کو جزیہ دینے کا پابند نہیں ٹھہرایا۔ حنابلہ کا نقطۂ نظر اس سے قدرے مختلف ہے، وہ اسے اپنا کام پورا کر لینے تک پورے عرصۂ اقامت میں جزیہ دینے کا پابند قرار نہیں دیتے۔(۴)

میری نظر میں اس میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں کہ جو ملک ہمارے سفارتی نمائندوں کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے ہم بھی معاملہ بالمثل کے طور پر ان کے نمائندوں کو

۱۔ حامد سلطان، ص ۱۷۴، حافظ غانم، ص ۱۷۰

۲۔ کتاب الخراج، ابویوسف، ص ۱۸۸، المغني ۸:۵۱۹، شرح الحاوي الکبیر، الماوردی، ۴: ۸

۳۔ حافظ غانم، ص ۱۷۴

۴۔ آثار الحروب، ڈاکٹر وہبہ زحیلی، ص ۳۰۴-۳۰۷

ان کے ذاتی ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیں، جیسا کہ دورِ جدید کے ممالک میں خیر سگالی کے طور پر رائج ہے۔ اس لیے کہ معاملہ بالکل ہی بہت سے ایسے ٹیکسوں کی بنیاد ہے جو مسلمانوں نے غیر مسلموں پر لگائے تھے۔ اسلام میں یہ ایک طے شدہ اصول ہے۔ (۱)

جنگ کی وجہ سے سفارتی مشن کی معطلی

بین الاقوامی قانون کے ماہرین کی اکثریت کا خیال ہے کہ جنگ کا اعلان کرتے ہی یا جنگی کاروائیوں کے شروع ہوتے ہی متحارب ریاستوں کے درمیان سفارتی تعلقات معطل ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام میں جنگ شروع کرنے سے سفارتی تعلقات معطل نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے کوئی ایسا ثبوت ملنا ضروری ہے جس سے معلوم ہوجائے کہ سفارتی نمائندے کی موجودگی ملک کے مفادات کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ نیز سفارتی تعلقات تب معطل ہوں گے جب سفارتی نمائندے کو ملک بدر کر دیا جائے یا متعلقہ ملک خود ہی اپنے نمائندے کو واپس بلا لے۔ یہ بین الاقوامی قانون کے ماہرین کے ایک گروہ کی رائے ہے۔

دوم: جنگ بندی کا معاہدہ

یہ ایسی صلح یا عارضی معاہدہ ہے جو ایک معلوم وقت پر مخصوص شرائط کے ساتھ دو قائدین کے درمیان طے پاتا ہے۔ اس کی بنیاد قرآن کریم کی یہ آیات ہیں: ﴿فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِهِمْ﴾ [التوبة: ۴] (تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو) نیز ﴿وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ [الأنفال: ۶۱] (اور (اے نبی) اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو)۔ یعنی اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہو اور جنگ نہ کرنا چاہے تو اس کے ساتھ صلح کر لو اور جنگ بندی قبول کر لو۔

۱۔ شرح السیر الکبیر ۴: ۲۸۳

سوم: معاہدۂ ذمہ

جہاں تک دائمی معاہدے کا تعلق ہے تو وہ معاہدۂ ذمہ ہے۔ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جو اسلامی حکومت اور غیر مسلموں کے درمیان طے پاتا ہے۔ اس کے بدلے میں غیر مسلم فی کس کے حساب سے اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کرتے ہیں تاکہ انہیں دارالاسلام میں رہتے ہوئے کچھ ضروری ذمہ داریوں سے چھوٹ مل جائے اور اسے تحفظ بھی حاصل ہو۔ قرآن کریم نے جزیہ دینے کی حامی بھرنے پر جنگ ختم کرنے کا واضح حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ﴾ [التوبة: ۲۹] (جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لائے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے، اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے، ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں)۔

جزیہ اِس معاہدے کو بھی کہا جاتا ہے اور اس مال کو بھی جس کی اس ضمن میں ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ اس لفظ کا ماخذ مجازاۃ ہے۔ جس کا مطلب بدلہ دینا ہوتا ہے یعنی ہمارا ان کے جان اور مال سے تعرض نہ کرنا اور انہیں اپنے ملک میں رہنے دینا۔ بخاریؒ کے سوا دوسرے تمام محدثین کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عسکری قائدین کو ہدایت فرماتے : إذا لقيت عدوك من المشركين فادعهم إلى ثلاث خصال :ادعهم إلى الإسلام، فإن أجابوك فاقبل منهم و كف عنهم، ...... فإن هم أبوا فسلهم الجزية...... (جب دشمن سے مقابلہ کرنے جاؤ تو اسے تین باتوں کی دعوت دو۔ پہلے تو اسلام کی طرف دعوت دو، اگر وہ مان لے تو اسے قبول کر لو اور اس سے کوئی تعرض نہ کرو۔ اگر نہ مانے تو اس سے جزیہ مانگو......)۔

امام احمدؒ اور ترمذیؒ کی روایات کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش

سے فرمایا: هل لكم في كلمة تدين لكم بها العرب، و تؤدى العجم إليكم بها الجزية. قالوا ماهي؟ قال لا اله الا اللّٰه ـ(۱)(کیا تم ایک ایسی بات کو مان لو گے جس کی وجہ سے عرب تمہارے مطیع ہو جائیں اور عجمی لوگ تمہیں جزیہ دیں۔ قریش نے پوچھا: وہ کیا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ لا اله الا اللّٰه ہے)۔ محدثین نے نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمان میں ھَجَر کے مجوسیوں اور یمن میں نجران کے باشندوں اور عقبہ میں ایلہ کے باشندوں سے جزیہ وصول کیا۔(۲)

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد امن پر قائم ہے، ان کے نزدیک امن کے قیام کے لیے عقد ذمہ اور مالی معاوضہ کے بغیر بھی دائمی صلح کرنے میں کوئی مانع نہیں۔ان کی دلیل یہ ہے کہ ہجرت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا سیاسی کام یہ کیا کہ مدینہ اور ساحل سمندر کے درمیانی علاقے میں رہنے والے جُہینہ، بنو ضمار اور غفار قبائل کے ساتھ معاہدۂ صلح کیا۔(۳)

معاہدے کا مضمون یہ ہوتا ہے کہ اہل معاہدہ کو جان و مال کا تحفظ مل جائے اور کسی مدت کی تحدید کے بغیر جانبین کے درمیان باہمی تعاون اور ایک دوسرے کی حمایت کرنے کا عہد و پیمان ہو جائے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آتے ہی وہاں کے لوگوں کے ساتھ مستقل معاہدۂ صلح کیا اور اوس اور خزرج قبائل کو بہتر پڑوسی بن کر رہنے کی بنیاد پر یکجا کر دیا اور یہودیوں کو دینی آزادی دی اور انہیں ان کی املاک پر بدستور قابض رہنے دیا۔

یوں مسلمانوں اور مدینہ کے قبائل اور یہودیوں کے درمیان یہ صحیح معنوں میں پہلا سیاسی معاہدہ تھا جس کے تحت ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے کو ممنوع قرار دیا گیا، بیرونی حملہ آور کے مقابلے میں باہمی اتفاق و تعاون کا التزام کیا گیا، مشترکہ دفاع

۱۔ نيل الأوطار ۸:۵۶

۲۔ القسطلاني شرح البخاري ۵:۲۲۱

۳۔ سیرۃ ابن ہشام ۱:۵۹۱

کا حلف اٹھایا گیا، دفاعی اخراجات مشترکہ طور پر برداشت کرنے کا پیمان کیا گیا اور دیگر متعلقہ لوازمات کی فراہمی پر بھی اتفاق کیا گیا۔ یوں مسلمانوں کے آپس کے روابط بھی منظّم ہو گئے اور دیگر پڑوسیوں کے ساتھ بھی بہتر ہمسائیگی والے تعلقات استوار ہو گئے جو امن وسلامتی قائم کرنے کا ایک خوب صورت نمونہ سمجھا جاتا ہے۔(۱)

معاہدۂ مدینہ کے متن کا خلاصہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ یہ تحریر ہے محمد رسول اللہ کی طرف سے، قریش کے مسلمانوں اور اہل یثرب کے درمیان اور جو ان کی پیروی کرے اور ان سے الحاق کر لے اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کرے ان سب کے درمیان:

۲۔ یہ کہ اس معاہدے کے فریق دوسرے لوگوں سے الگ ایک قوم ہوں گے۔

۳ تا ۱۲۔ (یہ دفعات قبائل کے درمیان دی گئی ضمانتوں کی وضاحت کرتی ہیں)

۱۳۔ ان میں سے جو کوئی بغاوت کرے گا یا ظلم کرے گا تو اہلِ تقویٰ مؤمنین اکٹھے ہو کر اس سے لڑیں گے۔

۱۴۔ کسی کافر کے بدلے کوئی مسلمان کسی مسلمان کو قتل نہیں کرے گا اور نہ ہی کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے مقابلے میں کسی کافر کی مدد کرے گا۔

۱۵۔ اللہ کا ذمہ ایک ہی ہے۔ کوئی معمولی درجے کا مسلمان بھی تمام مسلمانوں کی طرف سے پناہ دے سکے گا۔ مسلمان ایک دوسرے کے مددگار ہوں گے، نہ کہ دوسرے لوگوں کے۔

۱۶۔ یہودیوں میں سے جو ہماری پیروی کرے گا، اس کی مدد اور خیر خواہی کی جائے

۱۔ مجموعة الوثائق السياسية، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ص ۱۵ وما بعد

جائے گی، نہ اس پر زیادتی کی جائے گی اور نہ ہی اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کی مدد کی جائے گی۔

۱۷۔ مسلمانوں کی صلح ایک ہوگی۔ جہاد فی سبیل اللہ کے دوران ایک مسلمان دوسرے مسلمانوں کو چھوڑ کر صلح نہیں کرے گا، جب تک یہ صلح سب کے لیے برابر نہ ہو۔

۱۸ تا ۲۱۔ (ان دفعات میں اسلامی یکجہتی و اتحاد کے اصول متعین کیے گئے ہیں)۔

۲۲۔ جو مسلمان اس تحریری دستاویز کو تسلیم کرے، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھے، اس کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ کسی فسادی اور قانون شکن شخص کی مدد کرے یا اسے پناہ دے۔

۲۳۔ جس چیز پر تمہارا اتفاق نہ ہو سکے تو اسے اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس لے جانا ہوگا۔

۲۴۔ جب تک یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ میں مصروف رہیں گے، اس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگی اخراجات بھی برداشت کریں گے۔

۲۵۔ بنو عوف قبیلہ کے یہودی، اپنے موالی سمیت مسلمانوں کے برابر ایک امت ہیں۔ یہودی اپنے دین پر رہیں گے اور مسلمان اپنے دین پر، سوائے ایسے شخص کے جو زیادتی کرے یا کسی جرم کا ارتکاب کرے کہ اس صورت میں وہ صرف خود کو اور اپنے گھر والوں کو تباہی میں ڈالے گا۔

۲۶ تا ۳۵۔ (یہ دفعات باقی ماندہ یہودیوں، ان کے غلاموں اور ساتھیوں کے بارے میں عمومی احکامات کی وضاحت کرتی ہیں)۔

۳۶۔ ان میں سے کوئی شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر مدینہ سے باہر نہیں جائے گا۔

۳۷(الف)۔ یہودی اپنے اخراجات برداشت کریں گے اور مسلمان اپنے اخراجات۔

جو کوئی اس دستورالعمل کو قبول کرنے والوں کے خلاف لڑے گا تو اس کے خلاف سب مل کر مقابلہ کریں گے اور سب ایک دوسرے کی خیر خواہی اور بھلائی کریں گے اور ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کریں گے۔

۳۷ (ب)۔ کوئی بھی اپنے حلیف کی بدعملی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ مظلوم کی بہرحال مدد کی جائے گی۔

۳۸۔ (اس دفعہ میں دفعہ ۲۴ کو دہرایا گیا ہے)۔

۳۹۔ یثرب کا وسطی حصہ اس دستاویز کو ماننے والوں کے لیے محترم و محفوظ رہے گا۔

۴۰۔ کوئی پناہ گزین، پناہ دینے والوں کی اجازت کے بغیر کسی اور کو پناہ نہیں دے گا۔

۴۱۔ پناہ گزیں کو اپنوں کی طرح سمجھا جائے گا جو نہ تو زیادتی کرے گا اور نہ اس کے ساتھ زیادتی کی جائے گی۔

۴۲۔ (اس دفعہ میں دفعہ ۲۳ کے مضمون کی تاکید کی گئی ہے)

۴۳۔ نہ قریش کو پناہ دی جائے گی، نہ ان کے معاون کو۔

۴۴۔ یثرب میں کوئی خطرہ پیش آئے تو اہلِ معاہدہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

۴۵ (الف)۔ اگر ان لوگوں کو کہیں سے صلح کی دعوت دی جائے یا صلح میں شمولیت کا کہا جائے تو وہ اسے قبول کریں گے اور اس میں شامل ہوں گے۔ جب انہیں اس طرح کی دعوت دی جائے گی تو مسلمانوں کو بھی اس کی پابندی کرنا ہوگی، بجز اس صورت کے کہ فریق ثانی دین کے خلاف برسرپیکار ہو۔

۴۵ب۔ شہر کی جس جانب میں جو لوگ رہتے ہوں، اس جانب کا دفاع وہی لوگ کریں گے۔

۴۶۔ قبیلہ اوس کے یہودیوں، اور ان کے موالی کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو اس دستاویز میں شامل لوگوں کے ہیں۔ اور ان کے یہ حقوق اہلِ معاہدہ کی طرف سے

محض خیر سگالی کے طور پر ہوں گے، اور ان پر یہ نیکی کسی ظلم کے بغیر ہوگی۔ ہر شخص اپنے کیے کا ذمہ دار ہوگا، اللہ تعالیٰ اس میثاق کی سچائی اور نیکی پر گواہ ہے۔

۴۷۔ یہ دستاویز کسی ظالم اور مجرم کے آڑے نہیں آئے گی۔ جو شخص مدینہ سے باہر نکلے گا وہ بھی محفوظ رہے گا اور جو مدینہ میں رہے گا وہ بھی محفوظ رہے گا۔ سوائے اس کے جو زیادتی یا جرم کرے۔ جو وفا شعار اور پرہیزگار ہوگا اللہ اس کا مددگار رہے گا، اور محمد رسول اللہ بھی۔

اس معاہدے کو پڑھنے سے جو چیز فوراً سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں سازشی یہودیوں سے محتاط رہنے کی روح غالب نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اِس میں امن و سلامتی کو مستقل بنیادوں پر قائم کرنے، مذہبی آزادی کو یقینی بنانے اور جان، مال اور حقوق کے لحاظ سے تمام مسلمانوں میں مساوات اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ نیز اِس میں یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کی اچھے پڑوسیوں کے طور پر آزاد اور خودمختار حیثیت کا تعین پایا جاتا ہے۔

اس معاہدے میں مزید یہ بھی نظر آتا ہے کہ اگر یہودیوں پر باہر سے زیادتی ہو تو مسلمان ان کی مدد کریں گے (دفعہ ۱۶)۔ مسلمانوں کے کسی گروہ پر اگر زیادتی ہو تو اسے پوری امت اسلامیہ پر زیادتی تصور کیا جائے گا (دفعہ ۱۷)۔ کسی مجرم کی مدد نہیں کی جائے گی (دفعہ ۲۲)۔ اگر کسی بات پر اختلاف اور جھگڑے کی نوبت آ جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے گا (دفعہ ۲۳)۔ یہودی اور مسلمان دونوں الگ الگ امت ہیں، یہ صرف بیرونی حملے کی صورت میں فوجی حلیف ہوں گے اور ان کا دفاع مشترکہ ہوگا (دفعہ ۲۴)۔ مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی (دفعہ ۲۵)۔ امن و سلامتی کا کوئی مسئلہ پیش آئے تو اسے جنگ سے نہیں بلکہ باہمی مشاورت اور گفتگو سے حل کیا جائے گا (دفعہ ۳۷)۔ مظلوم کی مدد کی جائے گی (دفعہ ۳۷-ب)۔ پڑوسی کی مدد کی جائے گی (دفعہ ۴۰)۔ جنگ میں ایک دوسرے کی مدد کی جائے گی (دفعہ ۳۷ ب)۔ قریش یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے

دشمن ہیں (دفعہ ۴۳)۔ اگر امن و سلامتی کی خاطر صلح کی دعوت دی جائے تو مسلمان اور یہودی دونوں اسے قبول کرنے کے پابند ہوں گے (دفعہ ۴۵)۔ جب تک یہودی معاہدے کو نہ توڑیں اس وقت تک یہ باقی رہے گا (دفعہ ۴۶)۔ مدینہ ایک کھلا، پر امن اور محفوظ شہر رہے گا اور مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو آزادی ہوگی کہ چاہیں تو شہر میں رہیں اور چاہیں تو شہر سے باہر منتقل ہو جائیں (دفعہ ۳۹، ۴۷)۔

صلح حدیبیہ کا دس سالہ معاہدہ

ہجرت کے چھٹے سال (تقریباً ۶۲۸ء) کے آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مسلمانوں نے عمرہ ادا کرنے کا ارادہ کیا تو کافروں نے انہیں بیت اللہ سے روک دیا اور اس طرح کی صلح پر راضی ہوئے جس میں مسلمانوں کے لیے نقصان دہ شرائط رکھی گئی تھیں۔ مگر مسلمانوں نے امن و سلامتی کو جنگ پر ترجیح دی۔ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **والذي نفسي بيده لا يسألوني خُطة يعظمون فيها حرمات الله إلا أعطيتهم إياها** (۱)(اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ کافر مجھ سے کوئی بھی ایسا لائحہ عمل طلب کریں جس میں اللہ کے دین کا احترام پایا جاتا ہو میں انہیں ضرور دوں گا)۔

ان شرائط میں یہ بھی تھا کہ جو مسلمان تم سے الگ ہوکر ہمارے پاس آئے گا ہم اسے تمہارے حوالے نہیں کریں گے اور ہم میں سے جو کوئی الگ ہوکر تمہارے پاس آ ملے گا تم اسے واپس کرو گے۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہ شرط لکھ دیں؟ حضورؐ نے فرمایا: ہاں! کیوں کہ ہم میں سے جو ان کے پاس جائے، اللہ اسے ہم سے دور رکھے اور ان میں سے جو آئے گا اللہ اس کے لیے کوئی راہ بنا دے گا۔(۲) یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے اس صلح پر تعجب کرتے ہوئے عرض کیا: یا رسول اللہ کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں۔

۱۔ نیل الأوطار ۸: ۳۱

۲۔ ایضاً

حضرت عمرؓ نے پھر عرض کیا: کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں۔ حضرت عمرؓ نے پھر عرض کیا: کیا یہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا تو پھر ہمیں ہمارے دین کے معاملے میں کیوں نیچا کیا جارہا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں، میں اللہ کی نافرمانی نہیں کرتا اور وہ مجھے ضائع نہیں ہونے دے گا۔(۱)

مسلمانوں نے معاہدے کی دفعات پر پوری طرح عمل درآمد کیا۔ اس کی اعلیٰ ترین مثال یہ ہے کہ ابھی معاہدہ پوری طرح لکھا بھی نہ گیا تھا کہ مشرکین کے نمائندۂ مجاز سہیل بن عمرو کا بیٹا ابو جندلؓ مسلمان بن کر مسلمانوں کے پاس آ گیا، جس پر اس کے والد سہیل نے اسے واپس بھیجنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا فرمایا: إنا لم نقض الكتاب بعد (ابھی تو ہم معاہدہ لکھنے سے فارغ بھی نہیں ہوئے) مگر اِس کے ساتھ ہی ابوجندل رضی اللہ عنہ کو واپس مشرکین کے پاس بھیج دیا۔ ابوجندلؓ کہتے رہے کہ: اے مسلمانو! میں مسلمان بن کر آیا ہوں اور تم مجھے کافروں کے پاس واپس بھیج رہے ہو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں نے کتنے مظالم برداشت کیے ہیں؟ اور حال یہ تھا کہ مسلمان بننے کی پاداش میں انہیں سخت اذیتیں دی گئی تھیں۔ اسی موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا، جیسا کہ پہلے گزر چکا: ألست نبي الله حقاً؟ (کیا آپؐ اللہ کے سچے رسول نہیں ہیں؟) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلى!(کیوں نہیں)، حضرت عمرؓ نے پھر عرض کیا: ألسنا على الحق وعدونا على الباطل ؟ (کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن باطل پر نہیں؟) توحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: بلى!(کیوں نہیں)۔ اِس پر حضرت عمرؓ نے پھر عرض کیا تھا : فعلام نعطي الدنية في ديننا إذن؟ (پھر ہمیں ہمارے دین کے معاملے میں نیچا کرنے کی کوشش کیوں کی جاہی ہے ؟)(۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور قریشی ابو بصیرؓ کو بھی واپس کر دیا تھا جب

۱۔ سيرة ابن هشام ۲:۳۱۷، نيل الأوطار ۸:۳۵

۲۔ نيل الأوطار ۸: ۳۴ وما بعد

وہ مسلمان ہو کر مسلمانوں کے پاس آ گئے تھے۔ مشرکین نے معاہدے کی شرائط کے مطابق انہیں لینے کے لیے دو آدمی بھیجے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بصیرؓ کو ان کے حوالے کر دیا۔ راستے میں ابو بصیرؓ نے ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا بھاگ گیا۔ ابو بصیر پھر مدینے چلے آئے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَیل أمه مسعر حرب، لوکان معه أحد (اس کی ماں مرے! اس کے ساتھ کوئی ہوتا تو یہ جنگ کی آگ بھڑکا دیتا)۔ یہ الفاظ جنگ اور اس کی آگ بھڑکانے کے اقدامات کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔معاہدۂ حدیبیہ کی شرائط میں سے کچھ حسب ذیل تھیں:

۱۔ اس دستاویز کی رو سے محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو اس بات پر متفق ہوئے ہیں کہ دس سال تک جنگ نہیں کریں گے تاکہ اس عرصے میں لوگ امن سے رہیں۔

۲۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ آئندہ نہ تو کسی کا مال خفیہ یا ظاہر طور پر لیا جائے گا اور نہ خیانت کی جائے گی۔

۳۔ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں داخل ہونا چاہے گا داخل ہو سکے گا۔

۴۔ جو کوئی قریش کے عہد میں داخل ہونا چاہے، اسے بھی اجازت ہوگی۔

اس پر بنو خزاعہ اچھل پڑے اور کہا: ''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت اور انہی کے عہد میں شامل ہوتے ہیں''۔ دوسری طرف بنو بکر نے انہی جذبات کے ساتھ اعلان کیا: ''ہم قریش کے ساتھ ملنے کا اعلان کرتے ہیں۔

۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا أبا جندل! اصبر واحتسب، فإن الله جاعل لك ولمن معك من المستضعفین فرجا ومخرجا (ابو جندل! صبر سے کام لو اور ثواب کی امید رکھو! اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور تمہاری طرح دوسرے مجبوروں کے لیے کشادگی کی کوئی صورت اور نکلنے کی کوئی راہ بنا دے گا)۔(۱)

۱۔ نیل الأوطار ۸: ۳۶۔ یہ واقعہ اس شرط کی بنا پر پیش آیا جس میں قریش کے نمائندے نے کہا تھا کہ اگر قریش میں ۔ سے کوئی اپنے سرپرستوں کی اجازت کے بغیر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے آملے گا تو انہیں اسے واپس کرنا ہوگا، شاید مؤلف سے یہ عبارت رہ گئی ہے۔اکرام الحق لیٰسین

معاہدۂ نجران

غیرمسلم ذمیوں کے حقوق کو متعین کرنے والے مستقل معاہدات کی نمایاں مثالوں میں سے ایک معاہدۂ نجران بھی ہے۔ یمن میں نجران کے عیسائیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب لکھ بھیجا جس میں یہ لکھا ہوا تھا:

ولنجران وحاشتها جوار الله وذمة محمد النبي رسول الله على أموالهم وأنفسهم، وأرضهم ، وملتهم، وغائبهم وشاهدهم، وعشيرتهم، وكل ما تحت أيديهم من قليل أو كثير. لا يغيَّر أسقف من أسقفيته، ولا راهب من رهبانيته، ولا كاهن من كهانته، وليس عليه دنيّة، ولا دم جاهلية، ولا يُحَشّرون ولا يُعَشَّرون، ولا يطأ أرضهم جيش، ومن سأل منهم حقا فبينهم النَّصَفُ، غير ظالمين ولا مظلومين...... (۱)

نجران اور اس کے مضافات میں رہنے والوں کے لیے اللہ کی پناہ اور محمدؐ کی ضمانت ہے کہ ان کی جان و مال محفوظ رہیں گے، ان کی اراضی، ان کا دین، ان کے موجود اور غیرموجود لوگ، ان کے خاندان ، ان کی املاک خواہ کم ہوں یا زیادہ سب کے سب محفوظ و مامون ہوں گے۔ کسی پادری کو اپنے منصب سے نہیں ہٹایا جائے گا اور نہ کسی درویش کو اپنی عبادت سے روکا جائے گا، کسی کاہن کو اپنی کہانت سے منع نہیں کیا جائے گا، اس کی عزت میں کمی نہیں کی جائے گی، نہ اس سے جاہلیت کے زمانے کا قصاص لیا جائے گا۔ نہ انہیں زبردستی فوج میں بھرتی کیا جائے گا اور نہ ان سے عشر وصول کیا جائے گا۔ ان کی اراضی کو فوجی پامال نہیں کریں گے اور جو ان میں سے اپنا حق مانگے اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔ نہ وہ زیادتی کریں، نہ ان پر زیادتی کی جائے گی ......

۱۔ مجموعة الوثائق السياسية ، ڈاکٹر محمد حمیداللہ، ص ۳۴۵ وما بعد۔ کتاب میں لا يُحسّرون ولا يُعسّرون کے الفاظ تھے، جنہیں دیگر مراجع کی مدد سے درست کیا گیا ہے۔ اکرام الحق یٰسین۔

اسی طرح کا ایک امن معاہدہ خالد بن ولیدؓ نے بھی حیرہ والوں کے ساتھ کیا تھا،(۱) جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے برقرار رکھا۔ جہاں حضرت عمرؓ نے اسے نافذ فرمایا، بعد میں فقہاء نے اسے وہاں قیامت تک کے لیے نافذالعمل قرار دیا۔(۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب کچھ عرب اسلام سے مرتد ہوگئے تو نجران کے عیسائیوں نے بھی معاہدہ توڑ دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں معافی دی اور ان کے ساتھ اسی طرح کا ایک نیا معاہدہ کیا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں وہ لوگ دوبارہ پھر گئے اور رومیوں کے ساتھ مل گئے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے لگے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے انہیں جزیرۂ عرب سے باہر نکال دیا۔ لیکن بعد میں جب وہ ذہنی طور پر پُرسکون اور یکسو ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے دوبارہ انہیں امان دے دی اور ان کا جزیہ بھی کم کردیا۔

خلفاء راشدین کے عہد میں معاہدات

صحابہؓ کے دور میں بھی مسلمانوں اور روم و ایران کی حکومت کے درمیان جنگوں کا سلسلہ جاری رہا جس کی وجہ سے امن معاہدات یا باہمی تعاون و اتفاق کے معاہدات نہ ہو سکے، البتہ جنگ نہ کرنے کے معاہدات، یا معاہداتِ ذمہ کا سلسلہ جاری رہا۔ دوسری قسم کے معاہدات سے پہلے دشمن کو تین باتوں میں سے ایک کو قبول کرنے کا اختیار دیا جاتا تھا کہ: یا تو اسلام قبول کرلیں، یا ذمی بن کر رہیں اور یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

ذمی بنانے یا مستقل صلح کے معاہدات کی ایک مثال وہ معاہدہ ہے جو حضرت عمرؓ نے بیت المقدس (ایلیا) والوں کے ساتھ کیا تھا۔ اس معاہدے کا متن یہ ہے:(۳)

۱۔ کتاب الخراج، ابو یوسف، ص ۷۲، فتوح البلدان، ص ۷۲

۲۔ کتاب الخراج، ص ۱۴۳

۳۔ مجموعة الوثائق السياسية، ڈاکٹر حمید اللہ ص ۳۴۵ وما بعد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ یہ تحریر ہے جس کی رو سے اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمرؓ نے ایلیا کے باشندوں کو امان دی ہے۔

۲۔ عمرؓ نے ایلیا والوں کی جان، مال، کلیساؤں، صلیب کے نشانات، ان کے بیماروں، تندرستوں اور تمام اہل مذہب کو امان دی ہے کہ نہ تو ان کے عبادت خانوں کو رہائش گاہوں میں تبدیل کیا جائے گا اور نہ انہیں گرایا جائے گا۔ نہ ان میں، یا ان کے احاطوں کوئی کمی کی جائے گی۔ نہ ان کے صلیب کے نشانات میں کمی کی جائے گی، نہ ان کی اَملاک میں سے کوئی چیز گھٹائی جائے گی۔

۳۔ دین کے معاملے میں ان پر کوئی جبر نہیں ہو گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا، اور نہ باہر سے لاکر ایلیا میں ان کے ساتھ کوئی یہودی بسایا جائے گا۔

۴۔ ایلیا والوں کو اہلِ مدائن کی طرح جزیہ دینا پڑے گا۔ ان کے لیے یہ بھی لازم ہو گا کہ ایلیا سے رومیوں اور چوروں کو باہر نکال دیں۔ ان میں سے جو شخص وہاں سے نکلے اسے جان مال کی امان ہوگی یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے محفوظ مقامات پر پہنچ جائیں۔ جو یہاں رہے گا اسے بھی امان ہوگی، البتہ ان میں سے جو شخص جزیے کی عمر کو پہنچ جائے گا اسے ایلیا والوں کی طرح جزیہ ادا کرنا ہو گا۔

۵۔ ایلیا والوں میں سے جو رومیوں کے ساتھ جانا چاہے جا سکتا ہے اور اپنا مال بھی لے جا سکتا ہے۔ ان کے عبادت خانوں اور صلیبوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ ان کی جانیں محفوظ رہیں گی، ان کی عبادت گاہیں اور صلیبی نشانات بھی محفوظ رہیں گے یہاں تک کہ وہ اپنے محفوظ مقامات پر پہنچ جائیں۔

۶۔ جو بھی بیرونی لوگ فلاں شخص کے قتل ہو جانے سے پہلے ایلیا میں تھے، اگر وہ یہیں رہنا چاہئیں تو رہیں اور ایلیا والوں کی طرح جزیہ ادا کرتے رہیں۔

۷۔ جو چاہے رومیوں کے ساتھ چلا جائے اور جو چاہے واپس آ جائے، ان سے کچھ نہیں لیا جائے گا یہاں تک کہ ان کی فصلیں تیار ہو جائیں۔

۸۔ جب تک ایلیا والے جزیہ ادا کرتے رہیں گے اس وقت تک یہ لوگ اللہ، اس کے رسولؐ، رسولؐ کے خلفاء اور تمام مسلمانوں کی امان اور ذمے میں رہیں گے۔

۹۔ اس دستاویز پر خالدؓ بن الولید، عمروؓ بن العاص، عبد الرحمٰنؓ بن عوف اور معاویہ بن ابو سفیانؓ کو گواہ بنایا گیا اور یہ ۱۵ھ میں تحریر کی گئی۔

یہ معاہدہ غیر مسلموں کے حقوق کے تحفظ کی ایک عمدہ مثال بھی ہے۔ حضرت عمرؓ نے قیامہ گرجا گھر میں نماز نہیں پڑھی مبادا کہ مسلمان اسے نمونہ بنا لیں اور یہ نہ کہیں کہ عمرؓ نے یہاں نماز پڑھی تھی اور یوں گرجا گھر کے اندر نماز پڑھنا جائز سمجھا جائے اور اس کے نتیجے میں گرجا گھروں پر قبضہ شروع ہو جائے۔ اس معاہدے میں مذہبی آزادی اور نقل و حرکت کی آزادی کی تاکید ہے۔ انہیں معمولی سا جزیہ ادا کرنے کا جو پابند بنایا گیا تو وہ عوض ہے ان کے دفاع کا اور انہیں اپنے گھروں اور زمینوں میں امن سے رہنے کی ضمانت کا۔

اس مفہوم کے حامل اور بھی کئی معاہدات ہیں جیسے خالد بن الولیدؓ کا دمشق والوں کے ساتھ معاہدہ، جس میں جزیے کے بدلے ان کی جان و مال اور عبادت گاہوں کو تحفظ حاصل فراہم کیا گیا۔(۱) اسی طرح ابو عبیدہ بن الجراحؓ کا شام والوں کے ساتھ امن کا معاہدہ بھی ہے، جس میں انہیں اس شرط پر امان دی گئی کہ اگر ان کے علاقے سے مسلمانوں کا گزر ہو تو وہ تین دن تک ان مہمان نوازی کریں گے، غیر مسلموں کو مسلمانوں کی کمزوریوں پر مطلع نہیں کریں گے، مخصوص علَم نہیں اٹھائیں گے اور اپنے تہواروں میں اسلحے کی نمائش نہیں کریں گے۔(۲)

۱۔ مجموعة الوثائق السياسية ص ۳۴۰

۲۔ ایضاً، ص ۳۴۱

اموی اور عباسی اَدوار میں معاہدات

عہد نبوی اور اس کے بعد خلفاء راشدین کے ادوار میں کیے گئے امن معاہدات کی طرز پر بعد کے مسلمانوں نے بھی جنگ بندی اور ذمہ کے معاہدات کا سلسلہ جاری رکھا۔

چناں چہ اموی عہد میں مسلمانوں اور دارالحرب کے غیر مسلموں کے درمیان اس طرح کے معاہدات ہوتے رہے۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں ارمینیہ کے بیشتر علاقے معاہدہ ہائے امان ہی کی بناپر عربوں کے ماتحت تھے۔(۱) تاریخ اِسلامی کے ایام ابتلا کے دوران حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے ساتھ مشاجرت سے قبل سنہ ۳۶ھ مطابق (۶۵۶ء) میں بازنطینی بادشاہ کونسٹانز دوئم (CONSTANSII) کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔ پھر انہوں نے اپنے عہد خلافت کے اوائل میں سنہ ۴۲ھ مطابق ۶۶۲ء رومیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو اس پہلے معاہدے کی توسیع شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے پہاڑی علاقوں کے جرجومی (Circim) باشندوں کے ساتھ بھی ایک معاہدہ کیا اور انہیں بھتہ کے طور پر کچھ رقم ادا کی۔(۲)

عبد الملک بن مروان نے بھی بیزنطینوں کے ساتھ معاہدہ کیا جس وقت وہ عراق میں انقلابیوں کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ اسی طرح اس نے اپنی خلافت کے اوائل میں روم کے بادشاہ جسٹینین دوم (۶۸۵۔۶۹۵ء) کو تحائف اور اموال ارسال کیے۔ اس کے علاوہ اس نے جرجومیوں کے ساتھ بھی امن کا معاہدہ کیا اور پہلے کی طرح ان کو ہفتہ وار بھتہ دیتا رہا اور ان کے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ پھر سنہ ۷۰ھ مطابق ۶۸۹ء میں عبد الملک نے جسٹینین دوم شاہ روم کے ساتھ پہلے معاہدے کی تجدید کی۔(۳)

۱۔ فتوح البلدان ص ۱۹۷

۲۔ فتوح البلدان ص ۱۵۹ ومابعد، رسل الملوك ، ابن الفراء مع مقدمہ ڈاکٹر المنجد ص ۱۵۲

۳۔ مروج الذهب، المسعودي ۵:۲۲۴ ومابعد، فتوح البلدان ص ۱۶

عباسی دَور میں مشرق اور اندلس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات اسی نہج پر قائم رہے جیسا کہ پہلے اِسلامی دور میں تھے۔ اس پر مزید یہ کہ مسلمان حکمرانوں کے بیزنطینوں کے ساتھ اہم سیاسی تعلقات قائم ہوئے، جن کا آغاز خلیفہ منصور کے دور سے سنہ ۷۶۵ء میں ہوا۔ چناں چہ عیسائی ممالک کے ساتھ سفارتی نمائندوں کا تبادلہ مسلسل جاری رہا۔ یہ کام صرف امن معاہدات تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کے ذریعے تحائف اور جنگی قیدیوں کے تبادلے بھی ہوا کرتے تھے۔

اِس غرض سے مختلف معاہدات ہوتے رہے۔ ان سفارتی تعلقات کا ایک مقصد دو طرفہ تجارت بھی تھی۔ چناں چہ ہارون الرشید اور کارلوس (چارلمان) نے ۷۹۷ء سے سفارتی نمائندوں، خطوط اور تحائف کا تبادلہ جاری رکھا اور کئی دوستانہ معاہدات بھی ہوئے۔(۱)

فاطمی اور مملوک حکمرانوں نے بھی عباسی دور کے طریقوں کو جاری رکھا اور یورپ، وسطی ایشیا اور مشرقی ایشیا کے ملکوں تک ان کے سفیر پہنچے۔(۲)

صلیبی جنگوں میں بھی مشرق اور مغرب میں اہم سیاسی روابط جاری رہے، خصوصاً صلاح الدین اور رچرڈ شیر دِل میں، کہ اِن دونوں کے درمیان ۱۱۹۲ء میں معاہدہ طے پایا۔ صلاح الدین کے دور میں ۱۱۷۲ء میں مصر اور جمہوریہ وینس (بندقیہ) کے درمیان بھی کئی معاہدات طے پائے۔ بعد میں سلطان قايتباي کے دور میں ۱۴۸۸ء میں مصر اور جمہوریہ فلورنسا کے درمیان کئی معاہدات طے پائے۔(۳) سنہ ۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں صلیبی جنگ کے بعد مزید پیش رفت یہ ہوئی کہ اسلامی ممالک اور غیر مسلم ممالک کے درمیان سیاسی اور کاروباری روابط کو مستحکم بنانے کے لئے قونصل خانے کھول دیئے گئے۔(۴)

۱۔ رسل الملوك ص ۱۰۶، ۱۵۵ ومابعد

۲۔ الحرب والسلم في الإسلام، مجید خضوری ص۲۴۳

۳۔ تاريخ القانون، ڈاکٹر عمر ممدوح، ص ۳۱۹ بہ ما بعد

۴۔ القانون الدولي العام، ڈاکٹر سموحي فوق العادة، ص ۳۱

خلافتِ عثمانیہ میں بھی مسلمانوں کے خلیفہ (سلیمان) قانونی اور فرانس کے کیتھولک بادشاہ فرانسوا اول کے درمیان دوستی کا تبادلہ ہوا اور دونوں نے ۱۵۳۵ء میں ایک دوستانہ معاہدہ کیا جو لافوریہ کے معاہدے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔(۱)

یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے کہ اموی دور اور اس کے بعد کے ادوار میں دشمن کے ساتھ ایسے بھی امن معاہدات طے پائے جن میں مسلمانوں نے امن کے قیام کے لئے مال بھی پیش کیا۔ فقہاء نے ضرورت پڑنے پر معاہدۂ صلح میں دشمن کو مال دینے کو بھی جائز قرار دیا ہے۔(۲) اس کی دلیل یہ ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر حضورؐ کا ارادہ تھا کہ کفار مکہ کو مدینہ کے باغات کی آمدنی کا تیسرا حصہ دے کر ان سے صلح کر لی جائے۔ مگر جب آپؐ نے انصار مدینہ کے جذبے اور ثابت قدمی دیکھی تو اس ارادے پر عمل نہیں کیا۔ اسی طرح حضرت معاویہؓ نے بھی رومیوں کے ساتھ امن معاہدہ اس شرط پر کیا تھا کہ وہ انہیں مال دیں گے۔ یہ سب ریاستِ اسلامیہ کا وجود بچانے کے لیے وقت اور حالات کا تقاضا تھا۔(۳)

امام اوزاعیؒ سے پوچھا گیا کہ اگر مسلمانوں کے قلعے پر دشمن ہلہ بول دے اور مسلمانوں کو یہ ڈر ہو کہ وہ دشمن کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے تو کیا مسلمانوں کے لیے اس شرط پر امن معاہدہ کر لینا جائز ہو گا کہ دشمن فوج کو اپنا اسلحہ، مال اور گھوڑے وغیرہ دے دیں اور اس کے بدلے وہ دشمن وہاں سے چلا جائے؟ امام اوزاعیؒ نے جواب دیا: اگر مسلمان ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (۴)

۱۔ العلاقات السياسية الدولية، ڈاکٹر احمد العمری ص۱۸۸

۲۔ شرح السير الكبير ۴:۴، كتاب الخراج ص۲۰۷،حاشية الطحطاوي۲:۴۴۳، المنتقى۳: ۱۵۹، فتح العلى المالك ۱:۳۴۴، كتاب الأم، الشافعی۴:۱۱۰، مغني المحتاج ۴:۲۶۱، المغني ۸:۴۶۰، كشاف القناع ۳:۸۸

۳۔ المهذب ۲:۲۶۰، كتاب الأموال، ابو عبید ص۱۶۲

۴۔ اختلاف الفقهاء، طبری ص۱۷، بداية المجتهد ۱:۳۷۵

امام اوزاعیؒ سے یہ بھی پوچھا گیا کہ اگر مسلمانوں میں فسادات پھوٹ پڑیں اور اسلامی حکومت کو یہ ڈر ہو کہ دشمن ان پر حملہ کر دے گا اور لوگ بھی اپنا اصل مرتبہ چھوڑ چکے ہوں تو کیا ایسی صورت میں حکومت کے لئے جائز ہو گا کہ دشمن کے ساتھ اس شرط پر معاہدہ کرلے کہ وہ دشمن کو ہر سال مقررہ مال دیا کرے گی، اور اس کا مقصد یہ ہو کہ کسی طرح مسلمانوں کی عزت اور جان و مال کو بچا لیا جائے؟ تو امام اوزاعیؒ نے جواب میں کہا کہ اگر حالات واقعی ایسے ہوجائیں تو میرے خیال میں ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ وہ یہ بھی کرسکتا ہے کہ اپنے سرحدی علاقے کے عامل کو لکھ بھیجے کہ دشمن کو کچھ دے دلا کے باز رکھے۔(۱)

اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضورؐ ایسے لوگوں کی تالیف قلبی کے لئے بھی دے دیا کرتے تھے جن کو دینے سے یہ امید ہوتی کہ انہیں دیکھ کر ان جیسے دوسرے لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔ جس شخص کو ایسی ادائیگی کرنے میں ملی مصلحت نظر آتی ہو اسے غنیمت کے پانچویں حصے، خراج، فئے اور جزیہ کی آمدن وغیرہ سے دے دیا جائے۔(۲) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر مصلحت کا تقاضا یہی ہو تو کافروں کو کچھ دے کر صلح کرنا بھی مسلمانوں کے لئے جائز ہے۔

معاہدات کے چند دیگر نمونے

ابو العباس احمد بن علی قلقشندی (م ۸۲۱ھ / مطابق ۱۴۱۸ء) نے اپنی مشہور کتاب صبح الأعشى في صناعة الانشاء کی تیرہویں اور چودھویں جلد میں چھ ابواب پر مشتمل نویں مقالے کو مسلمانوں کے اپنے درمیان اور ان کے اور کافروں کے درمیان معاہدات طے پانے اور ٹوٹنے کے تذکرے کے لیے مخصوص کیا ہے۔(۳)

۱۔ اختلاف الفقهاء، طبری، ص ۱۸

۲۔ القسطلاني، شرح البخاري ۵:۲۱۵

۳۔ شرعی طور پر تو مسلمان کو امان حاصل رہتی ہے لیکن حکمرانوں کی عام طور پر ایسے شخص کے لیے بھی امان لکھ کر دیتے ہیں جو حکمرانوں سے خوف زدہ ہو خصوصاً ایسے شخص کے لئے جو حکومت کی طاعت سے باہر نکلا ہو۔

اس مقالے میں انہوں نے عام معاہدات، امان، معاہداتِ ذمّہ اور جنگ بندی معاہدات کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ بعض مقامات پر انہوں نے غیر مسلموں کے لیے تیار کی گئی دستاویزات کے تذکرے میں ممدوح کی تعریف کچھ زیادہ ہی کردی ہے، جسے محض ان کے ادبی ذوق کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے حاکم حسب موقع اور حسب حال ایک یا زیادہ اوصاف کو اختیار کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مترادف اور غیر مترادف اوصاف کسی ایک دستاویز میں یکجا ذکر نہیں کیے جاتے۔(۱) جو معاہدات مؤلف نے نقل کیے ہیں، یہاں ان میں سے بطور نمونہ کچھ معاہدے پیش کیے جائیں گے۔ تاہم ہر معاہدے سے پہلے اس سے متعلقہ ضروری مقدمات کو کتبِ فقہ کی روشنی میں بیان کیا جائے گا جس سے ہر معاہدے کا ایک اجمالی خاکہ ذہن میں آجائے گا۔ قاری کو ان معاہدات اور آج کل لکھے جانے والے معاہدات میں بڑی حد تک مماثلت نظر آئے گی۔ معاہدہ کرنے والے فریقین کا تعین، ہجری تاریخ ثبت کرنے کا رواج، معاہدے کی نقول کا تبادلہ، معاہدے کی شرائط، اس کے مضمون کی تفاصیل، اسے قید تحریر میں لانے کا تذکرہ اور معاہدے سے پہلے مذاکرات اس کے اہم خدو خال ہیں۔ اس کی ایک مثال صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔ نیز معاہدے کو یک طرفہ طور پر یا دونوں اطراف سے توڑنے کی کیفیت، معاہدے پر گواہ بنانے، شرائط پر عملدرآمد اور اِس کے تقاضوں کی پابندی میں سستی کمزوری نہ دکھانے کے بارے میں حلف لیے جانے کا تذکرہ وغیرہ بھی اِس میں شامل ہے۔

۱۔ قلقشندی تقریباً ۷۹۱ھ میں سلطنت مصر میں شاہی منشی (State Drafts man) بنے۔ انہوں نے صبح الاعشی في كتابة الانشاء سرکاری دستاویزات تحریر کرنے کے لیے ایک رہنما کے طور پر تالیف کی۔ انہوں نے اس میں دورِ جدید کی Legal Drafting طرز کے اصول وضوابط بیان کیے ہیں اور نمونے کے طور پر کچھ دستاویزات نقل بھی کر دی ہیں۔ جن اوصاف کا تذکرہ یہاں مؤلف نے کیا ہے اِس سے مراد ایسی دستاویزات کے لیے استعمال ہونے والے القابات، الفاظ، محاورات اور جملوں کو یکجا کرنا ہے۔ اِن میں سے ہر شخص اپنی ضرورت کے الفاظ اور جملے منتخب کرکے اپنی دستاویز میں استعمال کرسکتا ہے۔ اکرام الحق یٰسین

اول: معاہدۂ امان(۱)

اس معاہدے کے بارے میں قلقشندی نے دو حصوں میں گفتگو کی ہے۔ پہلے حصے میں اس نوعیت کے معاہدات کے ثبوت، ان کی شرائط اور ان کی قانونی حیثیت کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہے اور دوسرے حصے میں ان دستاویز کی تشکیل وترکیب کا تذکرہ ہے۔

پہلے حصے کو انہوں نے الطرف الأول کا عنوان دیا، اور یہ لکھا: ''امان ان تین چیزوں میں سے پہلی چیز ہے جن کے ذریعے کافر کو قتل کرنے سے ہاتھ اٹھا لیا جاتا ہے۔ اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے: ﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ﴾[التوبة: ٦](اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے تاکہ اللہ کا کلام سنے تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کے محفوظ مقام تک پہنچا دو)۔ سنت سے اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے:المؤمنون تتكافأ دماؤهم و يجير عليهم أد ناهم وهم يد على من سواهم ۔(۲)(مومنوں کے خون برابر ہیں۔ ان کا کم حیثیت شخص بھی کسی کو پناہ دے سکتا ہے۔ وہ اپنے ماسوا پر یک دست ہیں)''۔

عقد اَمان کے تین بنیادی ارکان

رکن اول: امان دینے والا مسلمان ہو۔ اس امان کی دو صورتیں ہیں: ایک عام، ایک خاص۔عام یہ ہے کہ اتنی تعداد میں لوگوں کے لیے ہو جن کو شمار کرنا ممکن نہ ہو، جیسے ایک

۱۔ صبح الأعشى ۱۳:۳۲۱ وما بعد

۲۔ نيل الأوطار ۸:۲۸ بحوالہ احمد، ابو داوٗد، ابن ماجہ بروایت عمرو بن شعیب۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: يد المسلمين على من سواهم تتكافأ دما ؤهم و يجير عليهم ادناهم و يرد عليهم اقصاهم وهم يد على من سواهم.

پورے علاقے کے لوگوں کو امان دی جائے۔ اس قسم کی امان صرف مسلمانوں کا حاکم یا اس کا نائبِ مجاز ہی دے سکتا ہے، جیسا کہ جنگ بندی کے معاہدے کا اصول ہے ۔امانِ خاص یہ ہے کہ ایک شخص یا گنتی کے لوگوں کو امان دی جائے۔ ایسی امان کوئی بھی مکلّف مسلمان دے سکتا ہے، چاہے وہ جنگ کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ لہٰذا غلام، عورت، بوڑھا، کم عقل اور مفلس مسلمان بھی ایسی امان دے سکتا ہے، جب کہ اس کے برعکس نابالغ بچہ اور پاگل شخص یہ پناہ نہیں دے سکتا۔

رکن دوم: امان یافتہ

امان کا دوسرا رکن وہ فریق ہے جس کے لیے عقدِ امان کیا جارہا ہو۔ یہ عقد ایک فرد کے لیے بھی ہوسکتا ہے یا ایک سے زیادہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں، وہ مرد بھی ہوسکتے ہیں اور عورتیں بھی۔

رکن سوم: عقد امان کے الفاظ

اس سے مراد ہر ایسا لفظ ہے جس سے صریح طور پر یا کنایہ کے طور پر امان کا مطلب سمجھ میں آتا ہو۔ ایسا اشارہ بھی جس سے یہ مطلب لیا جا سکتا ہو، ان الفاظ کے قائم مقام شمار کیا جائے گا۔ جسے امان دی جارہی ہے اس کی طرف سے اِس پیشکش کو قبول کرنا بھی ضروری ہے، چناں چہ اگر کسی کافر نے بھی امان کی پیشکش کو قبول نہیں کیا تو یہ معاہدہ منعقد نہیں ہوگا۔ البتہ اگر وہ خاموشی اختیار کرے، تو اس کے انعقاد کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص مسلمانوں اور کافروں کے درمیان سفارتی کام سے داخل ہوا کہ کوئی پیغام وغیرہ پہنچانا ہو یا کلام اللہ سننے کے لیے آیا ہو تو اس کے لیے امان کے معاہدے کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ صرف اسی کام کی بناء پر اسے امان حاصل رہے گی۔ البتہ امان حاصل کیے بغیر اگر کوئی شخص کاروبار کرنے کے لیے اسلامی مملکت میں داخل ہوتو اسے خود بخود امان حاصل نہیں ہوجائے گی، اِلا یہ کہ مسلمان حاکم یا اس کا نائبِ مجاز یہ اِعلان کردے کہ جوکوئی تجارت کی غرض سے آئے گا اسے امان حاصل ہوگی۔

عقد امان کی شرائط

اس نوعیت کے معاہدے کی ایک شرط تو یہ ہے کہ جسے امان دی جا رہی ہو وہ مسلمانوں کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ چناں چہ اگر وہ جاسوس ہو یا دشمن کا مخبر ہو تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور اس بارے میں کوئی تردد نہیں کیا جائے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ امان کا عرصہ ایک سال سے زائد نہیں ہونا چاہیے۔ اَمن معاہدے کی صورت اس سے مختلف ہے۔ اگر مسلمان کمزور ہوں تو اس کی مدت دس سال تک بڑھائی جا سکتی ہے۔

عقدِ اَمان کی قانونی حیثیت

جب امان کا معاہدہ طے پا جائے تو اس کی پابندی لازمی ہو جاتی ہے، چناں چہ اگر پناہ یافتہ شخص کو کوئی مسلمان قتل کر ڈالے تو مقتول کی دیت واجب ہو جاتی ہے۔ کافروں پر اس عقد کی پابندی لازمی نہیں ہوتی، وہ جب چاہیں اسے اتار کر پھینک سکتے ہیں۔ مسلمانوں پر اس کی پابندی لازمی ہے اور وہ اپنی طرف سے اسے نہیں توڑ سکتے، سوائے اس کے کہ امان یافتہ شخص سے کسی نقصان کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ ایسے میں مسلمان بھی یہ مُعاہدہ توڑ سکتے ہیں، مگر امان یافتہ شخص کو اس کی جائے امن تک پہنچانا ہوگا۔

قلقشندیؒ نے دوسرے حصے میں دستاویز کی ساخت پر گفتگو کی ہے اور اسے الطرف الثاني: صورة مايكتب فيه کا عنوان دیا ہے۔ اس کی روشنی میں عہدِ امان کا تشکیلی نمونہ حسب ذیل ہے:

۱) رفاعہؓ بن زید خزاعی صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اِس نے آپؐ کی خدمت میں ایک غلام کا تحفہ بھی پیش کیا اور اِسلام بھی قبول کیا۔ پھر اپنے اِسلام پر خوب ثابت قدم بھی رہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قوم کے لیے اسے ایک مکتوب لکھوا کر دیا جس کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ مکتوب محمد رسول اللہ کی طرف سے رفاعہؓ بن زید کے لیے ہے۔ میں نے انہیں ان کی پوری قوم کی طرف اور جو بھی ان کی قوم میں شامل ہو، اس کی طرف بھیجا ہے۔ یہ ان سب کو اللہ تعالیٰ اور اِس کے رسولؐ کی طرف دعوت دیں گے۔ جس کسی نے یہ دعوت قبول کرنے کے لیے قدم بڑھایا وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی جماعت میں شامل ہو جائے گا اور جس نے منہ پھیرا اسے دو ماہ تک امان دی جائے گی۔ رفاعہؓ جس وقت اپنی قوم کے پاس آئے تو انہوں نے ان کی دعوت کو قبول کر لیا اور اسلام لے آئے۔(۱)

۲)۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فتح مصر کے بعد جو امان لکھی اس کا متن یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ تحریر ہے جو عمرو بن العاص نے مصر والوں کو امان کے طور پر دی ہے کہ:ان کی جانیں ان کا مذہب، ان کا مال، ان کی عبادت گاہیں، ان کی صلیبیں، ان کی زمینیں، ان کے سمندر سب محفوظ رہیں گے۔ نہ ان کی ان املاک میں دخل اندازی کی جائے گی، نہ ان میں کمی کی جائے گی۔ نیز یہ کہ نوبہ (مصر کے جنوبی علاقہ) کے لوگ ان کے ساتھ آ کر نہیں رہیں گے۔

مصر کے لوگ اگر سب کے سب اِس معاہدے پر متفق ہو جائیں اور اِن کے دریا کا اضافی پانی بھی ختم ہو جائے تو ان کے ذمے پانچ کروڑ کی رقم بطورِ جزیہ ادا کرنا ہوگی اور کسی بیرونی جارحیت کی صورت میں ان کی مدد کرنا عمرو بن عاصؓ کے ذمے ہوگا۔ اور اگر ان میں سے کچھ لوگ امان کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیں تو جتنے لوگوں نے انکار کیا ان کے حساب سے اہلِ مصر کا جزیہ کم کر دیا جائے گا، مگر انکار کرنے والوں کے تحفظ سے ہم بری الذمہ ہوں گے۔ اور اگر ان کے دریا کا پانی اپنی مقدار سے کم ہو گیا تو اس کا حساب لگا کر بھی اِن کا جزیہ کم کیا جائے گا۔

۱۔ صبح الأعشی ۱۳: ۳۲۳

اس معاہدے میں اہلِ مصر کے ساتھ جو رومی یا نوبہ والے شریک ہونا چاہیں، ان کے حقوق و فرائض بھی یہی رہیں گے۔ جو اس معاہدے کو تسلیم نہیں کرے گا اور جانا چاہے گا تو اس کو امان دی جائے گی، یہاں تک کہ وہ اپنے محفوظ مقام تک پہنچ جائے یا ہماری مملکت سے باہر نکل جائے۔ اس دستاویز پر اللہ تعالیٰ، اس کے رسولؐ اور امیرالمؤمنین اور تمام مسلمانوں کی ضمانت ہے۔ نوبہ کے جو لوگ اس معاہدے پر راضی ہوں، ان پر لازم ہوگا کہ وہ اتنی تعداد میں افراد اور گھوڑوں سے ہماری مدد کریں اور اس کے بدلے میں ان پر کوئی حملہ نہیں ہوگا اور نہ ہی انہیں درآمدی اور برآمدی تجارت سے روکا جائے گا۔ اس دستاویز کے گواہ زبیرؓ اور اس کے دونوں بیٹے عبداللہ اور محمد ہیں اور اسے وردان نے تحریر کیا ہے اور وہ بھی اس وقت موجود رہا۔(۱)

ملحوظ رہے کہ ان دونوں معاہدات کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے: یہ امان کی دستاویز ہے۔ یا یہ امان ہے۔ یاان جیسے دیگر الفاظ کے ساتھ۔

لیکن بعض اوقات معاہدے کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد سے بھی ہوتا ہے۔ اس کی مثال وہ تحریر ہے جو سلطان محمد بن قلاوون نے شمال کے عیسائیوں کے بادشاہ فرانس، اس کی بیوی اور متعلقین کو لکھ دی تھی جب انہوں نے بیت المقدس کی زیارت کے لیے امان کی استدعا کی۔ اس کے الفاظ یوں تھے: أما بعد حمد اللّٰه الذی أمّن بمهابتنا المناهج والمسالك ……(۲)(اس اللہ کی حمد کے بعد جس نے ہمارے دبدبے کے ذریعے راستے پرامن بنادیے……)

۱۔ صبح الأعشی ۱۳:۳۲۴۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی صاحب نے یہاں وعلیه ممن جنی نصرتهم لکھ کر حاشیے میں نصرة کا معنی سونے کا ڈھیلا کیا ہے اور اس کے ساتھ متصل عبارت فإن أبدی أحد منهم أن یجیب لکھی ہے جب کہ اصل کتاب میں فإن أبیٰ ہے اور اس کے بعد بھی ایک اہم جملہ ہے۔ ان سب تبدیلیوں سے اس معاہدے کے آخری حصے کا مفہوم بالکل ہی بدل رہا تھا، اس لیے یہاں ترجمہ اصل کتاب کی عبارت کے مطابق بنا دیا گیا ہے، واللہ اعلم۔ اکرام الحق یٰسین

۲۔ صبح الأعشی ۱۳:۳۲۷

دوم: عقدِ ذمہ

مسلمانوں کے حاکم کے حوالے سے یہ معاہدہ امان کے معاہدے سے کم درجے کا ہے، کیوں کہ وہ عقد ذمہ ایک معاوضے کے بدلے طے کرتا ہے جب کہ عقد امان بلامعاضہ طے کیا جاتا ہے۔ امام غزالیؒ نے الوسیط میں اس کا مطلب یوں بیان کیا ہے کہ : اس معاہدے میں غیرمسلموں کو اسلامی مملکت میں رہنے کی اجازت دی جاتی ہے، ان کی حفاظت کی جاتی ہے اور انہیں ہر حملہ آور سے بچایا جاتا ہے جس کے عوض وہ یا تو جزیہ دیتے ہیں، یا اپنی مرضی سے اسلام قبول کرتے ہیں۔

قرآن کریم سے اس کے جواز کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الآخِرِ......﴾ [التوبة: ۲۹](جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے......)

اِس آیتِ کریمہ کے مطابق غیرمسلموں سے آخری مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ جزیہ دے دیں۔ یہی ارشادِ ربانی انہیں اسلامی مملکت میں رہنے کی اجازت دینے کی دلیل ہے۔ سنت سے اس کی دلیل یہ ہے کہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو فرمایا:

> إنك سترد على قوم معظمهم أهل الكتاب، فاعرض عليهم الإسلام، فإن امتنعوا فاعرض عليهم الجزية، وخذ من كل حالم ديناراً، وإن امتنعوا فاقتلهم.
>
> تم ایسی قوم کی طرف جا رہے ہو جس کی اکثریت اہل کتاب ہے۔ تم ان کو اسلام کی دعوت دو، اگر وہ انکار کریں تو ان سے جزیہ طلب کرو اور ہر بالغ فرد سے ایک دینار وصول کرو۔ اگر وہ نہ مانیں تو پھر انہیں قتل کر دو۔

جزیہ ادا کرنے سے انکار کے بعد قتل کرنے کا حکم دینے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر وہ جزیہ دے دیں تو انہیں اسلامی مملکت میں برقرار رکھا جائے۔

عقد ذمہ کی پہچان کے لیے آٹھ چیزوں کا جاننا ضروری ہے:

ا۔ عاقد

یہ معاہدہ صرف مسلمانوں کا حاکم یا اس کا نمائندۂ مجاز ہی کر سکتا ہے کیوں کہ اس کے لیے وسعت نظر اور قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۔ معقود لہ

ضروری ہے کہ جس کے ساتھ معاہدہ کیا جائے وہ بالغ ہو، عاقل ہو، مرد ہو اور آزاد ہو۔ چناں چہ بچے، پاگل، عورت اور غلام کے ساتھ یہ معاہدہ طے نہیں کیا جا سکتا، بلکہ معاہدہ ہوجانے کی صورت میں یہ لوگ اپنی قوم کے تابع ہونے کی وجہ سے خود بخود اس میں شامل ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے ان لوگوں پر جزیہ دینا واجب نہیں۔ بوڑھے اور اپاہج وغیرہ، ایسے لوگ جو جنگ نہ کر سکتے ہوں ان کے ساتھ یہ معاہدہ کرنے کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں، مگر زیادہ صحیح رائے یہ ہے کہ ان کے ساتھ یہ معاہدہ طے کیا جا سکتا ہے۔

اس بارے میں یہ بھی دیکھا جائے گا کہ جن لوگوں کے ساتھ عقدِ ذمہ طے کیا جارہا ہے وہ اپنے تئیں کسی آسمانی کتاب کو ماننے کا دعویٰ رکھتے ہوں، جیسے یہودی تورات کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور عیسائی تورات و انجیل دونوں کو ماننے کے مدعی ہیں۔ توارت اور انجیل کے علاوہ صحائفِ ابراہیم علیہ السلام اور زبور داؤد علیہ السلام کو ماننے والوں کے بارے میں اختلاف ہے، مگر زیادہ صحیح یہ ہے کہ انہیں بھی ان کے ساتھ بھی عقدِ ذمہ طے کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح مجوسیوں کو بھی ذمی بنانا جائز ہے۔ اِس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے:سُنّوابهم سنة أهل الكتاب۔(۱)(ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کرو جو اہل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے)۔

ا۔ اس روایت کو امام شافعیؒ نے نقل کیا ہے۔ نیل الأوطار ۸:۵۶

سامری لوگوں کے عقائد اور اصول اگر یہودیوں سے ملتے جلتے ہوں تو انہیں بھی ذمی بنایا جا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ اسی طرح صائبین کا حکم ہے۔ اگر ان کے اصول عیسائی عقائد کے موافق ہوں تو انہیں بھی ذمی بنایا جا سکتا ہے۔

زندیق، بت پرست، ستارہ پرست اور فرشتوں کی پوجا کرنے والے لوگوں کو ذمی نہیں بنایا جا سکتا۔

مزید یہ کہ اگر وہ ساری شرائط پوری کرتے ہوں، تو پھر بھی یہ ضروری ہوگا کہ وہ لوگ ذمی بننے کو قبول بھی کرتے ہوں۔ چناں چہ اگر ایسا شخص کہہ دے کہ مجھے اپنی ریاست میں رہنے دیں اور سربراہ مملکت یا اس کا قائم مقام کہہ دے کہ ہاں تو عقد صحیح ہوجائے گا۔ اگر کوئی شخص مسلمانوں کے سربراہ سے ذمی بننے کی درخواست کرے تو لازم ہے کہ اسے منظور کر لیا جائے۔

یہ فقہاءِ شافعیہؒ کی رائے ہے۔ حنفیہؒ کہتے ہیں کہ عرب بت پرستوں کے ماسوا ہر طرح کے کافروں سے جزیہ لینا جائز ہے اور انہیں ذمی بنایا جا سکتا ہے۔ مالکیہؒ کی رائے یہ ہے کہ ہر طرح کے کافروں سے جزیہ لینا اور انہیں ذمی بنانا جائز ہے، چاہے وہ عرب ہوں یا غیر عرب، اہل کتاب میں سے ہوں یا بت پرست ہوں۔

۳۔ معاہدے کے الفاظ

اس سے مراد ایسے الفاظ ہیں جو سربراہ مملکت یا اس کے قائم مقام کی جانب سے کسی غیر مسلم کو اسلامی مملکت میں رہنے کی اجازت دینے کا مفہوم ادا کریں۔ مثلاً سربراہ یہ کہے کہ میں تم لوگوں کو اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دے رہا ہوں، بشرطیکہ تم اس قدر مال ادا کرو اور اسلامی حکومت کی اطاعت کرو۔

۴۔ معاہدے کی مدت

بنیادی طور پر تو اِس کے لیے مدت مقرر کرنا صحیح نہیں ہے، البتہ اگر عقدِ ذمہ کا فریقِ ثانی اپنے لیے کوئی مدت مقرر کرنا یا کروانا چاہے تو اسے اختیار ہے۔ سربراہِ

مملکتِ اسلامیہ کی مرضی سے مدت مقرر کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ اس معاہدے کا مقصد دوام ہوتا ہے۔ جہاں تک آپؐ کے اس فرمان کا تعلق ہے: أقركم ما أقرّكم الله (میں تمہیں اتنا عرصہ ٹھہرنے کی اجازت دوں گا جتنا تمہیں اللہ ٹھہرائے گا) تو یہ جنگ بندی معاہدے سے متعلق ہے، عقد ذمہ سے متعلق نہیں۔

۵۔ مقامِ اقامت

حجاز کے علاوہ ہر مقام پر ذمیوں کو رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے، مگر حجاز کے کسی بھی حصے میں انہیں نہیں رکھا جا سکتا۔ حجاز کا علاقہ مکہ، مدینہ، یمامہ اور ان شہروں کے مضافاتی قصبے اور دیہات ہیں، جیسے مکہ کے ساتھ طائف کا علاقہ ہے اور مدینہ کے ساتھ خیبر کا علاقہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس حکم میں دیہات اور ان کے درمیانی راستے سب شامل ہیں کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:أخرجوا اليهود من الحجاز (۱) (یہودیوں کو حجاز سے نکال دو)،نیز آپؐ کا ارشاد ہے: لئن عشت لاخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب حتى لا اترك فيها الا مسلماً (۲)(اگر میں زندہ رہا تو یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال باہر کروں گا، یہاں صرف مسلمان کو رہنے دوں گا)۔ جزیرۃ العرب سے مراد صرف حجاز کی سرزمین ہے،جیسا کہ حضرت عمرؓ کے عمل سے ثابت ہے۔

حجاز کے سمندر میں بھی غیر مسلم نہیں رہ سکتے، البتہ اس سمندر میں سفر کر سکتے ہیں۔ غیر مسلم لوگوں کا حرم شریف میں داخلہ ممنوع ہے چاہے رہنے کی نیت سے ہو اور چاہے کسی دوسرے مقصد کے لیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـٰذَا ﴾ [التوبة: ۲۸](مشرکین ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں)۔

۱۔ نیل الأوطار ۸:۴۶ بحوالہ احمد

۲۔ نیل الأوطار، حوالہ بالا، بحوالہ مسلم، احمد، ترمذی بروایتِ عمرؓ

فقہاءِ مالکیہؒ کے نزدیک پورے جزیرۃ العرب میں غیر مسلم لوگوں کو رہنے سے روکا جائے گا۔ اس لیے کہ حدیث شریف میں آیا ہے: **لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب**۔(۱) (جزیرۃ العرب میں دو دین اکٹھے نہیں ہو سکتے)

۶۔ عقدِ ذمہ کے بعد اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں

جب مسلمان حاکم غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ ذمہ کرلے تو اسے چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک کا نام، مذہب اور حلیہ ضبط تحریر میں لائے اور ہر گروہ کا ایک نگران مقرر کرے تاکہ ان میں سے اگر کوئی شخص مسلمان ہو جائے، یا کوئی فوت ہو جائے، یا بچہ جوان ہو جائے تو اس کے بارے میں اسے اطلاع حاصل رہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ کون ان کے پاس باہر سے آیا ہے اور کون سفر پر باہر چلا گیا ہے۔ سب کو جزیے کی ادائیگی کے لیے حاضر کرنا بھی نگران کی ذمہ داری ہو۔ اگر کسی ذمی پر کوئی مسلمان زیادتی کرے تو وہ اس کی شکایت بھی کرے اور اسی طرح کے دوسرے کام اس کے ذمے ہوں۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی جان و مال کا ہر طرح سے تحفظ کیا جائے تاکہ کوئی بھی ان پر زیادتی نہ کر سکے اور اگر ان میں سے کسی کا نقصان ہو جائے تو حکومت اس کی تلافی کرے۔ جب تک وہ اعلانیہ شراب کا دھندا نہ کریں ان کی شراب کو نہ بہایا جائے۔ اگر وہ اپنے خنزیروں کو چھپا کر رکھا کریں تو انہیں بھی تلف نہ کیا جائے۔ انہیں گرجا گھروں میں آنے جانے سے بھی نہ روکا جائے۔ البتہ اگر کسی ذمی کے گھر میں کوئی شخص داخل ہو گیا اور اس کی شراب بہا دی تو اسے تاوان نہیں دینا پڑے گا چاہے وہ بلا اجازت ہی داخل ہوا ہو، جب کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس پر تاوان عائد ہوگا۔

جب تک وہ لوگ اسلامی ریاست میں رہیں، انہیں دوسرے کافروں سے بچانا واجب ہوگا، البتہ اگر وہ دارالحرب چلے جائیں تو ان کی مدافعت ہم پر لازم نہ ہوگی۔

۱۔ فقہاءِ مالکیہ نے بیت الحرام کے سوا باقی حرم مکہ میں غیر مسلم کے داخلے کو تین دن تک، یا حسب ضرورت، جائز قرار دیا ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہؒ نے حرم مکہ میں بھی، بلکہ بیت الحرام میں بھی، غیر مسلم کو تین دن کے لیے داخل ہونے کو جائز ٹھہرایا ہے۔ از مؤلف بغیر حوالہ

۷۔ عقدِ ذمہ کے تحت ذمیوں کے فرائض

اس عقد کی رو سے اِن کے ذمے آٹھ کام ہوتے ہیں:

ا۔ جزیہ دینا

جزیہ اس مال کو کہا جاتا ہے جو غیر مسلم اسلامی ریاست میں رہنے کے بدلے ادا کرتے ہیں۔ ماوردیؒ نے کہا ہے کہ جزیے کا لفظ جزاء سے اخذ کیا گیا ہے، یعنی یا تو یہ اس معاوضے کا نام ہے جو اسلامی ریاست میں رہنے کے عوض ادا کیا جاتا ہے یا یہ ان سے کفر پر قائم رہنے کا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔(۱)

جزیے کی مقدار کے بارے میں ائمہ کی آراء مختلف ہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی کم از کم مقدار مقرر شدہ ہے۔اس طرح کم ازکم جزیہ ایک دینار ہے یا چاندی کے بارہ درہم ہیں جو سالانہ بنیاد پر ہر بالغ شخص کے ذمے ہیں۔ اسے ایک دینار سے کم کرنا کسی طرح جائز نہیں، البتہ اِس کی زیادہ سے زیادہ مقدار مقرر نہیں ہے۔ اگر ذمی لوگ راضی ہوں تو کم از کم سے زیادہ مقرر کرنا بھی جائز ہے۔مسلمان سربراہ کے لیے مناسب یہ ہوگا کہ اپنی صوابدید سے جزیے کی مقدار میں اضافہ کرتا رہے۔ ابن الرفعة نے امام شافعیؒ کے بعض شاگردوں کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ عقدِ ذمہ طے کرتے وقت اگر جزیہ کی کوئی حد مقرر کر دی گئی ہو تو اس سے کم کرنا جائز نہ ہوگا۔ تاہم مسلم حاکم کے لیے مناسب ہوگا کہ اس بارے میں فرق رکھے، یعنی غریب سے ایک دینار، متوسط سے دو دینار اور مالدار سے چار دینار وصول کرے۔

امام ابوحنیفہؒ نے اس لحاظ سے ذمیوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے: ایک قسم تو مالداروں کی ہے۔ ان سے اڑتالیس درہم وصول کیے جائیں۔ دوسری قسم متوسط لوگوں کی ہے۔ اِن سے چوبیس درہم لیے جائیں اور تیسری قسم غریب لوگوں کی ہے۔ اِن سے بارہ درہم لیے جائیں۔ یوں انہوں نے کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مقدار کا تعین کر دیا ہے اور اس مقدار کا تعین سربراہ مملکت کی صوابدید پر نہیں چھوڑا ہے۔

ا۔ الأحكام السلطانية، ص ۱۳۷

امام مالکؒ کا کہنا ہے کہ اس کی کم از کم یا زیادہ سے زیادہ مقدار مقرر نہیں بلکہ اس کا تعین فریقین کی صوابدید پر موقوف رکھا گیا ہے۔

۲۔ مہمان داری

حاکمِ وقت کو اِس بات کی اجازت ہے، بلکہ مستحسن ہے کہ ان میں سے غریب لوگوں کو چھوڑ کر بقیہ ذمیوں پر جزیے کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی عائد کرے کہ جب ان کے پاس سے مسلمان فوجی گزریں تو یہ لوگ ان کی مہمان داری بھی کریں۔ یہ مہمان داری زیادہ سے زیادہ تین دن تک ہوگی۔ نیز معاہدے کے اندر ہی مہمانوں کی تعداد اور انکی تفصیل بھی بتا دی جائے کہ بیک وقت اتنے سوار اور اتنے پیدل فوجیوں کی مہمان داری کرنا ہوگی۔ ان کے لیے یہ تعین بھی کردیا جائے فی کس کھانا اور سالن کتنا دینا ہوگا، جانوروں کا چارہ کتنا اور کیسا ہوگا اور مہمانوں کے ٹھہرنے کی جگہ کیسی ہوگی۔(۱)

۳۔ اسلامی عدالت کا فیصلہ ماننا

اگر وہ آپس کا کوئی مقدمہ ہماری عدالت میں لائیں گے اور ان میں سے کوئی ایک فریق بھی یہ چاہے گا کہ اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے تو پھر ہم ان کا فیصلہ اسلامی قانون کے مطابق کریں گے جس کو ماننا ان پر لازم ہو گا۔

۴۔ گھڑ سواری

ان کو گدھوں پر سواری کی اجازت ہوگی، مگر اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ پالان پر بیٹھ کر دونوں ٹانگیں ایک طرف لٹکا کر رکھیں۔ عمدہ خچروں پر سواری کے بارے میں البتہ

۱۔ بلا شبہ ماضی میں یہ انتظام نہایت مناسب تھا کیوں کہ اُس وقت مجاہدین رضا کارانہ طور پر جہاد کیا کرتے تھے۔ آج کل ان چیزوں کی ضرورت اس لیے نہیں کہ فوجیوں کو یہ ساری چیزیں قومی خزانے سے مہیا کی جاتی ہیں، از مؤلف۔

اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ امام غزالیؒ نے اسے ممنوع بتایا ہے مگر راجح یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ لگاموں کو سونے اور چاندی سے آراستہ نہیں کریں گے(۱)۔

۵۔ مجلس اور راستے میں مسلمانوں کو ترجیح دینا

اگر چلتے چلتے تنگ راستہ آجائے تو تنگ جگہ پر ذمیوں کو چلنا ہوگا اور ان کے اسلحہ اٹھانے پر پابندی ہوگی۔

٦۔ مسلمانوں سے الگ لباس

انہیں اپنے اوپر والے لباس میں مختلف رنگ کی سلائیاں لگوانی ہوں گی اور یہ شرط مرد وعورت سب کے لیے ہے۔(۲)

۷۔ پڑوسی مسلمانوں سے بلند یا ان کے برابر مکان بنانے پر پابندی

چاہے مسلمانوں کے مکان کتنے ہی نیچے کیوں نہ ہوں، کسی ذمی کو اپنے پڑوسی مسلمان سے اونچا یا اس کے مکان کے برابر مکان بنانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اگر پڑوسی مسلمان اسے اونچے مکان کی اجازت دینے پر راضی ہو پھر بھی انہیں ایسا کرنے سے روکا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ مذہبی استحقاق ہے، ہمسائیگی کا استحقاق نہیں۔ البتہ اگر وہ مسلمانوں کے محلے سے الگ تھلگ رہائش پذیر ہوں تو اونچے مکان بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ بنا بنایا بلند مکان خریدیں گے تو اسے بھی بحال رکھا جائے گا، ہاں اگر وہ مکان گر جائے اور پھر دوبارہ بنانا ہو تو پڑوسی مسلمانوں کے مکانوں کے برابر یا ان سے بلند نہیں بنا سکیں گے۔

۱۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انہیں فوجی تیاری والے کاموں سے روکا جائے گا کیوں کہ گھوڑے جنگ کا وسیلہ تھے۔

۲۔ اس بارے میں علاقائی عرف و عادت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اسی بنا پر فقہاء نے ان کے لیے اپنے اپنے عرف ورواج کے مطابق مخصوص رنگ اختیار کرنے کو مستحسن قرار دیا ہیں۔

۸۔ مسلمانوں کے نو آباد شہروں میں گرجا گھر بنانے پر پابندی

جیسے بصرہ، کوفہ، بغداد اور قاہرہ مسلمانوں کے آباد کیے ہوئے شہر ہیں۔ کسی ایسے شہر میں بھی انہیں نئے کلیسا اور گرجا گھر بنانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی جس کے باشندے مسلمان ہو گئے ہوں جیسے مدینہ اور یمن۔ چناں چہ اگر ایسے شہروں میں یہ لوگ اپنے عبادت خانے بنائیں گے تو انہیں گرا دیا جائے گا۔ البتہ اگر کوئی نامعلوم گرجا گھر یا عبادت خانہ دریافت ہو جائے تو اسے بحال چھوڑا جائے گا کیوں کہ دیگر عمارات بھی اس کے ساتھ جڑی ہوئی ہوسکتی ہیں۔ جو شہر اور علاقے بزورِ طاقت فتح کیے گئے ہوں وہاں پر بھی نئے کلیسا اور گرجا گھر وغیرہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں، نہ ہی وہاں موجود گرجا گھر بحال رکھے جائیں گے۔ اس لیے کہ یہاں مسلمانوں کو بزور فتح کرنے کی وجہ سے ملکیت حاصل ہوگئی ہے۔ البتہ جو شہر خراج کی شرط پر صلح سے حاصل کیے گئے ہوں اور وہاں کی اراضی معاہدۂ صلح کے تحت انہی کی ملکیت میں رہنے دی گئی ہو تو وہاں نئے گرجا گھر بھی بنائے جاسکیں گے اور پرانے بھی بحال رکھے جائیں گے۔ اس لیے کہ زمین ان کی ملکیت رہتی ہے۔ اگر یہ علاقے اس شرط پر بطور صلح حاصل کیے گئے ہوں کہ وہاں کی زمین مسلمانوں کی ملکیت ہوگی تو پھر اگر صلح میں یہ شرط رکھی گئی ہو کہ پرانے گرجا گھر بحال رہیں گے تو انہیں بحال رکھا جائے گا۔ اس صورت میں گویا انہیں مستثنیٰ رکھا گیا۔ ایسے علاقوں میں جو عبادت خانے منہدم ہو چکے ہوں انہیں دوبارہ تعمیر کرنے کی بھی اجازت ہوگی اور وہ ان کے بیرونی حصوں کی لپائی بھی کرسکیں گے، البتہ ان میں توسیع کی اجازت نہ ہوگی۔

۸۔ جن باتوں سے معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے

یہ باتیں حسب ذیل ہیں:

مسلمانوں سے بغیر کسی شک وشبہ کے جنگ کرنا، جزیے کی ادائیگی سے انکار کرنا، اپنے اوپر اسلامی احکامات کے نفاذ سے انکار کرنا، مسلمان عورت سے زنا کرنا،

نکاح کا نام بنا کر مسلمان عورت سے تعلق قائم کرنا،مسلمانوں کے راز معلوم کرنا اور دشمن کو معلومات فراہم کرنا، دشمن کے جاسوس کو اپنے ہاں ٹھہرانا، ڈاکہ زنی کرنا، مستوجب قصاص قتل کرنا، مسلمان پر جھوٹی تہمت لگانا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلانیہ توہین کرنا، اسلام یا قرآن پر طعنہ زنی کرنا بشرطیکہ اس کا تذکرہ نواقضِ معاہدہ میں کیا گیا ہو۔ اگر معاہدے کی شرائط میں یہ دفعہ شامل نہیں تو اس سے معاہدہ نہیں ٹوٹے گا۔ لیکن اگر ذمی نے اسلامی ریاست میں شراب، خنزیر اور ناقوس کی نمائش کی یا ان کا اعلانیہ استعمال کیا یا عزیر اور عیسیٰ علیہما السلام کے بارے میں اپنے عقائد کا اظہار کیا یا اپنے جنازہ کی نمائش کی یا مسلمان کو شراب پلائی تو ان صورتوں میں اس کو تعزیری سزا دی جائے گی۔ یہ فقہاءِ شافعیہؒ کی رائے ہے۔ دیگر فقہاء کی آراء معاہدات ختم ہو جانے کی بحث کے تحت ذکر کی جائیں گی۔

شام کے عیسائیوں کے ساتھ حضرت عمرؓ کا معاہدہ

عبدالرحمٰن بن غُنم کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے شام کے عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کیا تو اس کی یہ دستاویز میں نے تحریر کی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ مکتوب اللہ کے بندے امیرالمؤمنین عمرؓ کو فلاں فلاں شہر کے عیسائیوں کی طرف سے لکھا گیا، جس میں لکھا ہے: ''جب تم لوگ ہمارے ہاں آئے تھے تو ہم نے تم سے امان مانگی تھی، اپنے لیے، اپنی اولاد کے لیے، اپنی املاک کے لیے اور اپنے اہلِ دین کے لیے۔ ہم نے اپنے اوپر یہ شرط عائد کرلی ہے کہ اپنے شہر میں یا اس کے گرد و نواح میں نہ کوئی گرجا گھر بنائیں گے، نہ کسی راہب کی خانقاہ۔ اور اگر کوئی پرانی عبادت گاہ بوسیدہ یا خراب ہو جائے تو اسے نئے سرے سے تعمیر نہیں کریں گے۔ ہمارا جو کلیسا مسلمانوں کی زمینوں میں واقع ہو اسے نہیں چھپائیں گے۔ ہم اپنے گرجا گھروں میں کسی مسلمان کو تین دن تک ٹھہرنے سے نہیں روکیں گے اور اسے کھانا بھی کھلائیں گے۔ہم اپنے گھروں اور عبادت گاہوں میں کسی جاسوس کو پناہ نہیں دیں گے۔

ہم مسلمانوں کے ساتھ کسی طرح کا فریب نہیں کریں گے، اپنے بچوں کو قرآن نہیں پڑھائیں گے، اعلانیہ شرک نہیں کریں گے، نہ کسی کو شرک کی دعوت دیں گے، اور اگر ہمارا کوئی رشتے دار مسلمان ہونا چاہے تو اسے نہیں روکیں گے۔ ہم مسلمانوں کا احترام کریں گے اور اگر وہ مجلس میں بیٹھنا چاہیں تو ہم کھڑے ہو جایا کریں گے۔ ہم مسلمانوں جیسا لباس نہیں پہنیں گے، نہ ان جیسی ٹوپی اور پگڑی استعمال کریں گے، نہ ان کی طرح جوتے پہنیں گے، نہ ان کی طرح سر کے بال رکھیں گے اور نہ ہی ان کے محاورے میں بات کریں گے، نہ ان کی طرح کنیتیں اختیار کریں گے ، نہ گھوڑوں پر زین رکھ کر سوار ہوں گے، نہ تلواریں لے کر پھریں گے نہ کسی طرح کا اسلحہ رکھیں گے اور نہ لے کر چلیں گے۔ ہم اپنی انگوٹھیوں پر عربی نقوش نہیں بنوائیں گے، نہ شراب بیچیں گے ۔ ہم اپنی کمر پر زنار باندھ کر رکھیں گے، اپنے گرجا گھروں پر صلیب کا نشان کھڑا نہیں کریں گے، نہ مسلمانوں کے راستوں اور بازاروں میں اپنی کتابوں کی نمائش کریں گے۔ ہم اپنے گرجا گھروں میں ناقوس بلند آواز سے نہیں بلکہ دھیمی آواز سے بجائیں گے۔ ہم اپنے گرجا گھروں میں، یا جہاں مسلمان موجود ہوں، اپنی مذہبی کتابیں بلند آواز سے نہیں پڑھیں گے۔ ہم عید کے لیے یا بارش کی دعا کے لیے باہر نہیں نکلیں گے۔ ہم جنازے پر اونچی آواز سے نہیں روئیں گے، اپنے جنازوں کے ساتھ مسلمانوں کے راستوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے آگ روشن نہیں کریں گے۔ ہم مسلمانوں کے قبرستان کے قریب اپنا قبرستان نہیں بنائیں گے۔ ہم ایسے غلام نہیں رکھیں گے جو مسلمانوں کی تقسیم میں آتے ہوں اور مسلمانوں کے گھروں میں نہیں جھانکیں گے۔(۱)

۱۔ صبح الأعشى ۱۳: ۳۵۷ وما بعد۔ یہ خط امیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ کے نام اِن عیسائیوں کی طرف سے آیا تھا۔ آپؓ نے انھی کے الفاظ معاہدے میں لکھ دیے جیسا کہ متن میں ذکر کیا گیا ۔ اِس کے بعد آپؓ نے یہ اضافہ لکھوایا: "اور ہم کسی مسلمان کو ماریں گے نہیں۔ یہ شرط ہم نے اپنے اوپر اور اپنے اہلِ دین پر عائد کر لی ہے اور اسی پر ہم نے امان قبول کی ہے۔ اب اگر ہم نے ان شرائط میں سے جن کی ضمانت ہم دے رہے ہیں، کسی شرط کی بھی خلاف ورزی کی تو ہمارے لیے کوئی ذمہ باقی نہ رہے گا اور آپ لوگوں کو ہمارے ساتھ وہ سلوک کرنا جائز ہوگا جو دشمنی اور مخالفت کرنے والوں کے لیے ہوتا ہے"۔ اِکرام الحق یٰسین۔

سوم: جنگ نہ کرنے کا معاہدہ

اس کا رتبہ: جزیے کے معاہدے سے معقود لہ (غیر مسلموں) کی کمزوری کی عکاسی ہوتی ہے، جب کہ جنگ بندی معاہدے سے اس کی قوت کا پتہ چلتا ہے۔

لفظی مفہوم

عربی میں هُدنة ، مهادنة باہمی صلح کو کہتے ہیں۔ موادعة، مسالمة، مقاضاة اور مواصفة اس کے متبادل اور مترادف الفاظ ہیں۔

شریعت کی اصطلاح میں یہ ایک ایسا سمجھوتہ ہے جو کسی خاص وقت پر مخصوص شرائط کے ساتھ دو سربراہوں کے درمیان طے پا جائے۔(۱) اس کی بنیاد یہ آیت کریمہ ہے: ﴿فَسِيحُوا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ﴾ [التوبة: ۲](پس تم لوگ ملک میں چار مہینے چل پھر لو) نیز آیت کریمہ ﴿وَاِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ [الأنفال: ۶۱](اور اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ)۔ سنت نبوی سے اس کی دلیل بخاریؒ کی یہ روایت ہے کہ جب قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ میں آنے سے روک دیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے مقام پر تھے تو ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سہیل بن عمرو کو بھیجا تھا......۔ اس صلح نامے کا پورا متن پہلے ہی پیش کیا جا چکا ہے۔

ہدنہ کی شرائط

جنگ بندی معاہدے کے معتبر ہونے کے لیے درج ذیل چار شرائط ضروری ہیں۔ ان میں سے کسی ایک شرط کو بھی ملحوظِ خاطر نہ رکھا جائے تو یہ معاہدہ صحیح نہیں ہوتا:

اوّل: معاہدہ کرنے کا اختیار

اِس کا اختیار معاہدے میں شامل علاقے کے چھوٹا یا بڑا ہونے کے لحاظ سے

۱۔ صبح الأعشى ۱۴: ۳

بدلتا رہتا ہے۔ اگر معاہدہ پورے ملک یا خطے پر ہو رہا ہو جیسے ہندوستان یا روم وغیرہ، یا پوری کافر قوم سے بلا تخصیص ہو رہا ہو تو اس کا اختیار صرف حاکمِ اعلیٰ یا اس کے نائبِ اعلیٰ کو ہوگا جسے ریاست کے تمام معاملات کے بارے میں مذاکرات کرنے کا اختیار سونپا گیا ہو۔ اگر معاہدہ کچھ علاقوں یا بستیوں کے بارے میں کرنا ہو تو اس علاقے کے قریب موجود مسلم گورنر، یا والی، اس طرح کا معاہدہ کرنے کا مجاز ہوگا۔

دوم: معاہدہ مسلمانوں کے لیے مفید ہو

معاہدۂ جنگ بندی مسلمانوں کے لیے اس طرح مفید ہوسکتا ہے کہ مسلمان طاقت میں کمزور ہوں، یا مالی کمزوری کا شکار ہوں، یا اس بات کی توقع ہو کہ معاہدے کے نتیجے میں وہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہیں گے تو مسلمان ہو جائیں گے، یا یہ امید ہو کہ وہ لوگ لڑائی اور مالی اِخراجات اٹھائے بغیر جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اگر اس میں مسلمانوں کا کوئی فائدہ نہ ہو تو ایسا معاہدہ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ ان سے جنگ کی جائے گی یہاں تک کہ یا تو وہ مسلمان ہو جائیں یا جزیہ ادا کرنے پر راضی ہو جائیں۔

سوم: معاہدہ غیر شرعی شرائط سے پاک ہو

جیسے یہ شرط رکھنا کہ کسی مسلمان کی املاک ان کے پاس رہنے دی جائیں یا یہ کہ کوئی مسلمان قیدی ان سے چھوٹ کر آ جائے تو اسے لوٹا دیا جائے گا۔ یا معاہدے میں مسلمانوں پر یہ شرط رکھی گئی ہو کہ انہیں کچھ مال دینا پڑے گا جبکہ مسلمانوں کو کافروں کی طرف سے کوئی ڈر اور خوف بھی نہ ہو۔ یا یہ شرط ہو کہ کسی مسلمان عورت کو کفار کے حوالے کیا جائے گا۔ اس قسم کی شرائط کے ساتھ معاہدہ کرنا قطعاً جائز نہ ہوگا۔ ہاں اگر مسلمان مرد یا کافر عورت کو لوٹانے کی شرط ہو تو اس کے ساتھ معاہدہ کرنا جائز ہوگا۔ امام غزالیؒ کہتے ہیں: ''یہ دستور چلا آرہا ہے کہ ایسے معاہدے میں یوں لکھا جاتا ہے کہ تمہارے پاس جو مسلمان آئے گا تمہیں وہ لوٹانا ہوگا، اور ہمارے پاس جو مسلمان بن کر آئے گا ہم اسے لوٹا دیں گے''۔

اگر مسلمان کمزور ہوں اور انہیں دشمن سے خوف ہو تو اس صورت میں اگر کافروں کو کچھ مال دینے کی شرط مان لی جائے تاکہ نقصان اور خطرے سے بچا جائے تو یہ جائز ہوگا۔ اسی طرح مال دے کر مسلمان قیدی کو رہا کرانا جائز ہے جبکہ ہم اسے کسی دوسرے طریقہ سے چھڑا کر لانے سے قاصر ہوں۔

چہارم: مدتِ معاہدہ

جب مسلمان مضبوط اور طاقت ور ہوں اور کافروں سے بے خوف ہوں تو معاہدۂ جنگ بندی کا عرصہ چار ماہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ عرصہ کسی بھی صورت میں ایک سال تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ ایک سال سے کم اور چار ماہ سے زیادہ عرصہ کے بارے میں امام شافعیؒ کی دو آراء پائی جاتی ہیں جن میں سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔

ہاں اگر مسلمان کمزور ہوں یا کافروں کا خوف ہو تو دَس سال تک معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کے ساتھ دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا تھا جیسا کہ ابوداوٗد نے روایت کیا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ دس سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایک زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ اگر کوئی مجبوری اور مصلحت ہو تو اس سے زیادہ عرصہ کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔

اگر جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرتے ہوئے کوئی مدت معین نہ کی جائے تو امام شافعیؒ کے نقطۂ نظر کے مطابق صحیح تر رائے یہ ہے کہ ایسا معاہدہ فاسد ہوگا۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان کمزور ہوں تو اس معاہدے کو دس سال کے لیے سمجھا جائے گا اور اگر مسلمان طاقت میں ہوں تو ایک قول یہ ہے کہ اس کو کم از کم عرصہ سمجھا جائے گا جو چار ماہ کا عرصہ ہے، اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ زیادہ سے زیادہ عرصہ سمجھا جائے گا جو تقریباً ایک سال کا عرصہ ہے۔

اگر اِسلامی مملکت کا سربراہ اس سے زیادہ عرصے کے لیے جنگ نہ کرنے کا

معاہدہ کر لے تو دیکھا جائے گا: اگر مسلمان طاقت میں ہوں اور معاہدہ چار ماہ سے زائد کے لیے کیا گیا ہو، یا مسلمان کمزور ہوں اور معاہدہ دس سال سے زائد عرصے کے لیے کرلیا ہو تو شریعت کی رو سے مقررہ عرصے کے لیے تو معاہدہ درست سمجھا جائے گا، لیکن اس سے زائد عرصے کے لیے وہ معاہدہ باطل اور کالعدم ہوگا۔

اگر دس سال سے زیادہ عرصے تک معاہدہ کرنے کی ضرورت ہو تو معاہدہ دس سال کے لیے کیا جائے اور یہ عرصہ ختم ہونے سے کچھ پہلے ہی دوبارہ دس سال کے لیے اور اس کے ختم ہو جانے سے کچھ پہلے مزید دس سال کے لیے کرلیا جائے۔ یہ رائے فقہاءِ شافعیہؒ میں سے فورانیؒ کی ہے۔ امام مالکؒ کی رائے یہ ہے کہ ایسے معاہدے کے لیے عرصے کی تعیین سراسر سربراہ مملکت کی صوابدید پر موقوف ہے۔(۱)

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان طے پا جانے جنگ بندی معاہدات کے دیگر نمونوں کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے صبح الأعشی کی جلد ۱۴ صفحات ۱۷ تا ۷۱ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بداية المجتهد ۱: ۳۷۵

غیر جانبداری کا اصول

غیر جانب داری کا اصول قانونی نظام(۱) کے طور پر حال ہی میں متعارف ہوا ہے۔ البتہ ایک مادی اور سیاسی حقیقت کے طور پر قدیم زمانے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ جب دو یا زیادہ ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں دنیا دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک حصہ جنگ لڑنے والے ملکوں کا ہوتا ہے جس میں جنگ میں شریک ممالک شامل ہوتے ہیں۔ دوسرا حصہ نہ لڑنے والے ملکوں پر مشتمل ہوتا ہے جنھیں غیر جانبدار کہا جاتا ہے، اس میں عالمی برادری کے دیگر ملک شامل ہوتے ہیں۔

شریعتِ اِسلامیہ نے غیر جانبداری کے وجود کو ایک مادی حقیقت کے طور پر مانا ہے۔ اس کی ایک مثال دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان ایک تیسرے گھر، دارالعہد، کا اِسلامی تصور ہے۔ اس لیے کہ ہماری نظر میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی بنیاد امن پر ہے، جنگ پر نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی دو حصوں میں تقسیم بالکل ایک عارضی تقسیم تھی۔ یہ شریعت کی طرف سے مقرر کی ہوئی تقسیم نہیں۔ اس بات کی تائید اس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے:

۱۔ غیر جانب داری بحیثیتِ قانونی نظام سے مراد اس کی ایسی قانونی حیثیت ہے جس کی رو سے جنگ میں شریک نہ ہونے والے ممالک غیر جانب دار رہتے ہیں اور جنگ کے فریقین کے ساتھ ان کے پر امن تعلقات قائم رہتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ ایسے بین الاقوامی قوانین کا مجموعہ ہے جو برسر پیکار ممالک اور غیر متحارب ممالک کے آپس کے تعلقات کے اصول وضوابط متعین کرتا ہے۔ اگر کوئی دو ممالک یا زیادہ ممالک میں جنگ چھڑ جائے تو ان قوانین کے تحت کوئی بھی ملک جنگ سے علیحدہ رہ سکتا ہے اور اسے ان کی امداد کرنے کا پابند نہیں ہونا پڑتا۔ اِس طرح غیر جانب داری بحیثیت قانونی نظام کچھ حقوق وفرائض اور ریاستی خود مختاری سے متعلقہ کچھ امور پر مشتمل ہے۔

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ، وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيرًا. إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ أَوْ جَآؤُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَنْ يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلاً﴾ [النساء:۸۹–۹۰]

اور اگر وہ منہ پھیریں تو جہاں پاؤ انہیں پکڑو اور قتل کرو، اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ، البتہ وہ لوگ جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے یا وہ تمہارے پاس آئیں اس حال میں کہ لڑائی سے دل برداشتہ ہیں نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔ اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔

اس آیت کریمہ نے غیر مسلموں کے قتل کو اس صورت میں جائز ٹھہرایا ہے جب وہ ہم پر زیادتی کریں مگر درج ذیل دوصورتوں میں انہیں مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے :

پہلی صورت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں سے جا ملیں جنہوں نے مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا ہو۔ اس طرح وہ بھی معاہدین کے حکم میں شامل ہو جائیں گے۔

دوسری صورت یہ کہ وہ صلح کی غرض سے مسلمانوں کے سامنے آئے ہوں اور وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنی اور اپنی قوم کی جنگ سے تنگ ہوگئے ہوں اور غیر جانب ہو کر رہیں۔ اس طرح کی صورت حال حبشہ، نوبہ اور قبرص کے علاقوں میں پیش بھی

آ چکی ہے۔ اِن علاقوں کے لوگوں نے غیر جانب دار رہنے کو اختیار کیا، نہ مسلمانوں سے جنگ کی اور نہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کے دوران اسلام دشمنوں کا ساتھ دیا۔ وہ پر امن رہے، نہ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوئے، نہ کافروں کے ساتھ۔(۱)

معاہدات کا اختتام

بین الاقوامی قانون کے تحت معاہدات فریقین کی رضامندی سے بھی ختم ہو جاتے ہیں اور اس کے بغیر بھی۔(۲)

دو طرفہ رضامندی سے کوئی معاہدہ اس طرح ختم ہو جاتا ہے کہ معاہدے میں اس کا عرصہ طے کردیا گیا ہو، چناں چہ وہ عرصہ پورا ہوتے ہی معاہدہ ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی معاہدے میں ایسی شرط رکھی ہوتی ہے جس کے پورا ہونے پر وہ ختم ہو جاتا ہے۔ باہمی رضامندی کے بغیر یا یک طرفہ فیصلے سے معاہدے کا اختتام اس کے ٹوٹنے کی صورت میں، یا حالات بدلنے سے یا جنگ شروع ہونے سے ہوتا ہے۔

معاہدہ ٹوٹنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی فریق اس کی شرائط میں طے شدہ ذمہ داریوں کو پورا نہ کرے تو دوسرا فریق بھی باقاعدہ اعلان کردے کہ معاہدے کی ذمہ داریوں کو اب نہیں نبھایا جائے گا اور ہماری طرف سے معاہدہ ختم ہے۔

حالات کی تبدیلی یہ ہوسکتی ہے کہ زمینی حقائق یا سیاسی حالات میں جوہری تبدیلی واقع ہو جائے اور وہ حالات باقی ہی نہ رہیں جن کی وجہ سے معاہدہ کیا گیا تھا۔

جنگ کی صورت میں متحارب ملکوں کے حوالے سے بعض معاہدات پر عمل درآمد اس وقت تک رک جاتا ہے جب تک جنگ جاری رہتی ہے۔ یہ ایسے معاہدات ہوتے ہیں جو دو سے زیادہ ممالک کے درمیان ہوں اور ان میں سے کچھ ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ کچھ معاہدات حالت جنگ شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔

۱۔ آثار الحرب، وہبہ زحیلی، ص ۲۰۸ وما بعد، الحرب والسلم، مجید خضوری، ص ۲۵۱ وما بعد

۲۔ القانون الدولي العام، ڈاکٹر حافظ غانم، ص ۵۰۹-۵۱۶

یہ ایسے معاہدے ہوتے ہیں جو دو متحارب ملکوں کے درمیان روابط کی صورت میں کیے گئے ہوں جیسے دوستانہ تعلقات، حلیفانہ معاہدے اور تجارتی معاہدے۔

جنگ کے اثرات ایسے معاہدوں پر نہیں پڑتے جو بذاتِ خود جنگ ہی کے قواعد وضوابط پر مشتمل ہوں جیسے ۱۹۰۷ء کا ہیگ معاہدہ اور ۱۹۴۹ء کا جنیوا معاہدہ وغیرہ۔ اسی طرح جنگ ایسے معاہدات پر بھی اثرانداز نہیں ہوتی جو مستقل صورت حال کے قواعد وضوابط پر مشتمل ہو جیسے غیرجانبداری کے معاہدات یا سرحدوں سے متعلقہ معاہدات وغیرہ۔ اِس قسم کے معاہدات نافذ اور باقی رہتے ہیں۔

اِسلامی فقہ کی رُو سے معاہدے کا اختتام متعلقہ فریقوں میں سے کسی ایک کی خواہش پر بھی ہوتا ہے، جو خود اس کی قیود سے آزادی کا خواہش مند ہو۔ اسے فقہی اصطلاح میں نقضِ معاہدہ اور بین الاقوامی قانون میں تنسیخ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اَوّلاً: مسلمانوں کی طرف سے معاہدے کا اختتام

معاہدے میں اصل یہ ہے کہ اس کا نفاذ برقرار رہے، ہمارے ذمے اِس کی پاسداری کرنی ہے، یہاں تک کہ اس کی مدت پوری ہو جائے، یا دشمن خود ہی معاہدے کو توڑ دے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ [المائدۃ: ۱] (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو بندشوں کی پوری پابندی کرو)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: المسلمون عند شروطھم۔(۱) (مسلمان اپنی شرائط کے پابند ہیں)۔ وقتی اور عارضی معاہدے کی اصل بنیاد یہی ہے۔

جہاں تک دائمی معاہدات کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر مسلمان اس کو مفید سمجھیں تو اس کا توڑنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ دائمی معاہدہ ایک لازمی پیمان ہوتا ہے، اس لیے حاکم کو اسے اتار پھینکنے کا اختیار نہیں۔(۲)

۱۔ سبل السلام ۴:۵۹ بحوالہ حاکم، ترمذی، ابن حبان

۲۔ البدائع ۷:۱۰۹، فتح القدیر ۴:۳۵۲، الأم ۴:۱۰۸، المھذب ۲:۲۶۳، المغنی ۸: ۴۶۳

لیکن مسلمانوں کا سربراہ عارضی معاہدۂ امان اور معاہدہ صلح کو توڑ سکتا ہے جب معاہدہ کرنے والے دوسرے فریق کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو، جیسے اس کی طرف سے جارحیت کا منصوبہ ہو یا عملاً جارحیت شروع ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِيْنَ﴾ [الأنفال: ۵۸] (اور اگر تمہیں کسی قوم سے دغا کا اندیشہ ہو تو ان کا عہد اسی طرح ان کی طرف پھینک دو، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا)۔ مطلب یہ کہ مسلمان سربراہ جس وقت خیانت محسوس کرے یا قول وفعل کے قرائن سے معلوم ہو جائے کہ معاہدہ کرنے والی قوم معاہدے کو توڑنے والی ہے تو وہ ان سے معاہدہ توڑ سکتا ہے، مگر وہ ان کو واضح الفاظ میں بتا دے گا کہ معاہدہ ختم کر رہا ہوں، اس طرح کہ یہ بات دونوں فریقوں کو صاف صاف معلوم ہوجائے۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ معاہدہ ختم کرنے کی دھمکی دے کر انہیں خبردار کردے مگر اس وقت تک جنگ شروع نہ کرے جب تک انہیں توقع ہو کہ ابھی معاہدہ باقی ہے کیوں کہ ایسا کرنا خیانت کاری ہوگی جو حرام ہے۔

اسی بناء پر جمہور فقہاء نے مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہونے والے معاہدۂ امان کو اتار پھینکنے کی اجازت دی ہے،(۱) یعنی جب پناہ لینے والے کے غلط مقاصد سامنے آئیں۔ فقہاءِ حنفیہؒ کی رائے میں جب اس معاہدے میں مسلمانوں کے لیے کوئی فائدہ ہی باقی نہ رہے تو اسے اتار پھینکنا جائز ہے۔(۲) اس طور پر امان واپس لے لینے کو جدید اصطلاح میں ملک بدری کہا جاتا ہے۔

جنگ بندی کے معاہدے کے بارے میں جمہور فقہاء نے صرف یہ شرط رکھی ہے کہ معاہدہ کرتے وقت وہ مسلمانوں کے لیے مفید ہو۔ البتہ حنفی فقہاء کے نزدیک جب

۱۔ بداية المجتهد، ص ۳۷۵، الدسوقي والدردير ۲:۱۹۰، الخرشي ۳:۱۷۴، طبع اوّل، مغني المحتاج ۴:۲۶۹، المغني ۸:۴۶۱، المحرر في الفقه الحنبلي ۲:۱۸۲

۲۔ فتح القدير ۴:۲۹۳

تک معاہدہ قائم رہے اس وقت تک اس کا مسلمانوں کے لیے مفید رہنا ضروری ہے۔ چناں چہ احناف کا مذہب اس صورت حال کے مشابہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں حالات کے بدلنے سے معاہدے کا ٹوٹنا کہا جاتا ہے۔

یہاں بظاہر جمہور کا نقطۂ نظر زیادہ محفوظ دکھائی دیتا ہے، اس لیے کہ یہ قرآن وسنت میں دیئے گئے ایفائے عہد کے اصول کے مطابق ہے۔ قطع نظر اس کے اس میں مسلمانوں کا مفاد ہے یا نہیں۔ دراصل ایفائے عہد کا فائدہ عہد توڑنے کے وقتی فائدے سے بہت زیاد ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا عظیم دین زیادتی کرنے کو ممنوع قرار دیتا ہے جب کہ عہد کو اتار پھینکنا بذاتِ خود زیادتی ہے۔(۱)

فقہاءِ حنفیہؒ نے ہدنہ (جنگ بندی) اور اَمان کے معاہدے کو مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کی صورت میں توڑنے کا جو اختیار مسلم حاکم کو دیا ہے، تو ان کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ﴾ [الأنفال: ۵۸] (اور اگر تمھیں کسی قوم سے دغا کا اندیشہ ہو تو ان کا عہد اسی طرح ان کی طرف پھینک دو)۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مکہ والوں کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ ان کی طرف پھینک دیا تھا۔ نیز یہ کہ جب مصلحت بدل جائے تو معاہدے کو پھینک دینا جہاد ہے۔ جب کہ اِیفائے عہد ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے جہاد کو ترک کرنا ہوتا ہے۔

ثانیاً: غیرمسلموں کی طرف سے اِختتام

جب دشمن معاہدہ توڑ ڈالے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہر معاہدے کے حوالے سے مختلف حالات ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ نقضِ معاہدۂ ذمہ

یہ معاہدہ یا تو اس لیے ٹوٹتا ہے کہ اس کے تقاضوں کی خلاف ورزی کی جائے،

۱۔ العلاقات الدولية في الإسلام، محمد ابوزہرہ، ص ۸۰

یا اس لیے کہ بعض شرائط کی مخالفت کا ارتکاب کیا جائے۔ پہلی صورت کے بارے میں احنافؒ کے سوا جمہور فقہاءؒ کے نزدیک اگر ذمی جزیہ دینے سے انکار کر دے تو اس کا معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے، یا جب مسلمان حاکم کوئی فیصلہ دے اور ذمی اس اسلامی فیصلہ کو نہ مانے یا مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے ذمی لوگ اکٹھے ہو جائیں تو ان کا معاہدہ ٹوٹ جائے گا۔(۱) البتہ احنافؒ کے نزدیک اس سے ان کا معاہدہ نہیں ٹوٹتا، ہاں اگر ان کے پاس قوت و شوکت ہو جس کی بناء پر وہ مسلمانوں سے لڑتے ہوں پھر غیرمسلم ریاست میں چلے جاتے ہوں، یا بغاوت سے کسی مقام پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں سے لڑتے ہوں تو ان کا معاہدہ ٹوٹ جائے گا۔ (۲)

جہاں تک دوسری حالت کا تعلق ہے، یعنی معاہدے کی بعض شرائط کی خلاف ورزی کرنے کا، تو اس صورت میں مالکیہؒ اور حنابلہؒ کے نزدیک ان ذمیوں کا معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے، خواہ اس کی شرط رکھی گئی ہو یا نہ رکھی گئی ہو۔(۳) شافعیہؒ کے نزدیک زیادہ صحیح رائے یہ ہے کہ اس طرح ذمیوں کا معاہدہ نہیں ٹوٹتا، ہاں اگر خلاف ورزی کرنے پر عہد ٹوٹنے کی شرط رکھی گئی ہوگی تو پھر معاہدہ ٹوٹ جائے گا۔(۴)

احنافؒ کے نزدیک اگر ذمی لوگ اپنی ذمہ داریاں نہ نبھائیں تو ذمے کا معاہدہ نہیں ٹوٹتا، اِلّا یہ کہ وہ اتنی طاقت و شوکت رکھتے ہوں کہ کسی جگہ پر قبضہ کرلیں گے اور مسلمانوں سے لڑیں گے یا دارالحرب سے جا ملیں گے۔

۱۔ المدونة ۳:۲۱، الدسوقی والدردیر ۲:۱۸۸ وما بعد، الخرشي ۳:۱۴۹، طبع دوم، الأم ۴: ۱۰۹، مغني المحتاج ۴:۲۵۸، المهذب ۲:۲۵۷، المغني ۸:۵۲۵، المحرر فی الفقه الحنبلي ۲:۱۸۷، الأحکام السلطانية، ابویعلی، ص ۱۴۵

۲۔ فتح القدیر ۴: ۱۸۱ وما بعد، مجمع الأنهر ۱: ۵۱۹

۳۔ الفروق، القرافي ۳:۱۳، الدسوقي ۲: ۱۸۸، الخرشي ۳:۱۴۹، المغني :۵۲۵، الأحکام السلطانية، ابویعلی، ص ۱۴۲، کتاب الأموال، أبي عبید، ص ۱۷۸

۴۔ کتاب الأم ۴:۱۰۹، ۱۲۶، ۲۰۵، مغني المحتاج بحوالہ سابقہ، المهذب بحوالہ سابقہ

معاہدے کی خلاف ورزی کی مثالیں انہوں نے مسلمان عورت کے ساتھ زنا کرنا یا نکاح کرنا، مسلمانوں کی کمزوریاں دشمنانِ اسلام کو بتانا، انہیں خط و کتابت کے ذریعے مسلمانوں کی خبریں پہنچانا، دشمن کے جاسوس کو پناہ دینا اور مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کرنے کے لیے فتنہ بازی کرنا، مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرنا، مسلمان پر تہمت لگانا، مسلمان کو اپنے دین کی طرف دعوت دینا، مسلمان راہگیروں کو لوٹنا، اسلام یا قرآن پر طعنہ زنی کرنا، اللہ کی شان میں گستاخی کرنا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی دوسرے نبیؑ کی بدگوئی کرنا اور یہ کام کھلم کھلا کرنا بیان کی ہیں۔(۱)

نقضِ معاہدۂ امان

جن باتوں کی وجہ سے معاہدۂ ذمہ ٹوٹ جاتا ہے، ان کی وجہ سے امان بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر فریقین میں سے کوئی خود معاہدہ توڑ دے تب بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اَحنافؒ کے نزدیک یہ معاہدہ لازمی نہیں، جب کہ دیگر فقہاء کے نزدیک لازمی ہے۔(۲)

نقضِ معاہدۂ جنگ بندی

اگر دشمن جنگ کے ذریعے، یا مسلمانوں کے کسی دشمن کی مدد کرکے، یا کسی مسلمان کو قتل کرکے، یا کسی مسلمان کا مال چھین کر، یا اللہ تعالیٰ یا اس کے رسولؐ کی گستاخی کرکے، یا قرآنِ مجید کی بے ادبی کرکے، یا عقدِ ذمہ میں بیان کی گئی دیگر شرائط کی خلاف ورزی کرکے اِس معاہدے کو خود ہی توڑ دے تو جمہور فقہاء کے نزدیک یہ معاہدہ ٹوٹ جائے گا۔فقہاءِ حنفیہؒ کا نقطۂ نظر اِس سے کچھ مختلف ہے۔(۳)

۱۔ البحر الرائق ۵: ۱۱۵ ومابعد،فتح القدير بحوالۂ سابقہ، الدر المختار مع حاشیہ۳:۳۸۴، ۳۸۶، كتاب الخراج، ابویوسف،ص ۱۸۹، ۱۹۰

۲۔ فتح القدير ۴:۲۹۸، ۳۵۳، نهاية المحتاج ۷:۲۱۷، مغني المحتاج۴:۲۳۸، المهذب ۲:۲۶۴، تصحيح الفروع ۳:۶۲۷، شرح السير الكبير ۱:۲۰۵، المبسوط ۱۰: ۸۹

۳۔ الدسوقي والدردير، حوالۂ سابقہ، الأم، حوالۂ سابقہ، تحفة المحتاج ۸: ۱۰۲، المغني ۸: ۴۶۲، كشاف القناع ۳: ۸۸، الأموال،ص ۱۶۶

حنفیہؒ کے نزدیک جنگ بندی معاہدہ صرف اس وقت ٹوٹتا ہے جب سب دشمن متفقہ طور پر معاہدے میں خیانت کریں۔(۱) خیانت سے مراد ہر وہ اِقدام ہے جو معاہدے میں رکھی گئی شرائط کے خلاف ہو یا اس میں وہاں کے عرف و رواج کی خلاف ورزی پائی جائے، جیسے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا، یا مسلمانوں کے ساتھ لڑنے والوں کا ساتھ دینا وغیرہ۔ اِن تمام صورتوں میں معاہدہ تب ٹوٹے گا جب خلاف ورزی کرنے والا طاقت ور ہو، اگر وہ طاقت ور نہ ہو تو معاہدہ نہیں ٹوٹے گا۔

اگر وہ لوگ عہد توڑ بھی ڈالیں تو ہمارے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ ہم اپنے ہاں موجود ان کے یرغمالیوں کو قتل کر ڈالیں۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں جب رومیوں نے معاہدہ توڑ دیا تو اس وقت بھی مسلمانوں کے قبضے میں ان کے کچھ یرغمالی تھے۔ کسی مسلمان نے کسی یرغمالی کو قتل نہیں کیا، بلکہ یہ کہہ کر اِن سب کو رہا کر دیا کہ: ''غداری کے بدلے غداری سے بہتر ہے کہ غداری کے بدلے وفا کی جائے''۔(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: أدّ الأمانة إلٰی مَن ائتمنك ولا تخن من خانك ۔ (۳) (جس نے امانت تیرے سپرد کی، اس کی امانت ادا کر، اور جس نے تجھ سے خیانت کی اس سے خیانت نہ کر)

وَالْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِي تَتِمُّ بِنِعْمَتِهِ الصَّالِحَاتُ

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس کے فضل و کرم سے نیک اعمال پایۂ تکمیل تک پہنچتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

۱۔ شرح السیر الکبیر ۴:۶، الفتاویٰ الهندیة ۲:۱۹۷، تبیین الحقائق ۳:۲۴۶

۲۔ الأحکام السلطانیة، الماوردی، ص ۴۸

۳۔ التاریخ، بخاری، ابوداؤد، ترمذی، حاکم بروایت ابوہریرۃؓ۔ دیگر محدثین نے اسے حضرت انسؓ، ابو امامہؓ اور اُبی بن کعبؓ وغیرہ حضرات سے نقل کیا ہے۔ الجامع الصغیر ۱:۱۴

Silver Jubilee 1985-2010

شریعہ اکیڈمی کے علمی پروگراموں میں اس کے تین شعبہ جات نمایاں ہیں: اس کے شعبہ تربیت میں تحصیل اور ضلع کی سطح کے جج صاحبان، اور ملک بھر کے سول اور فوجی اداروں کے شعبہ ہائے قانون کے افسران، نیز عملی میدان میں مصروفِ کار وکلاء کو اسلامی قانون کے تعارفی کورس کروائے جاتے ہیں۔ یہ کورس قومی سطح کے بھی ہیں اور بین الاقوامی سطح کے بھی۔ اس کے دوسرے شعبے میں خط و کتابت کے ذریعے شریعہ (قانونِ اسلامی) کے ابتدائی اور ایڈوانس کورس پیش کیے جاتے ہیں۔ اکیڈمی کا تیسرا بڑا شعبہ اس کے تحقیقاتی اور طباعتی کاموں پر مشتمل ہے۔ اس میں قانونِ اسلامی کے بارے میں جدید وقدیم مطبوعہ مواد زیادہ تر اردو اور انگریزی میں پیش کیا جاتا ہے۔ کچھ کتب عربی میں بھی شائع کی گئی ہیں۔ شریعہ اکیڈمی کی مطبوعات میں رائج الوقت قانون کے موضوعات کی طرز پر قانونِ اسلامی کے لٹریچر کی نشر واشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے اشاعتی پروگراموں میں بلا تفریقِ مذہب فقہ و اصولِ فقہ کی امہات الکتب کے اردو تراجم، جدید قانونی موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر کی تحقیقی عربی کتب کے تراجم، جدید قانونی مسائل پر نئی تحقیقی تصانیف، ایل ایل بی، ایل ایل ایم اور پی ایچ ڈی کی سطح کی نصابی کتب، مختلف قانونی موضوعات پر یک موضوعاتی کتابچے اور مراسلاتی کورس کے لیے یونٹس کی تیاری اور اشاعت شامل ہے۔

زیرِ نظر کتاب مشہور معاصر فقیہ، ماہرِ قانونِ اسلامی اور **الفقه الاسلامي وأدلته** کے مؤلف ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی عربی تالیف **العلاقات الدولية في الاسلام** کا ترجمہ ہے۔ ترجمے کا کام ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے سابق رفیقِ کار مولانا حکیم اللہ مرحوم نے کیا۔ اس کی نظرِ ثانی اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق سربراہ تحقیق ڈاکٹر غلام مرتضیٰ آزاد نے کی اور اس کی مزید تنقیح اور ضروری حواشی کے اضافے کا کام نگران تحقیق ومنشورات ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین نے کیا۔

یہ کتاب نہ صرف جدید بین الاقوامی قانون کی طرز پر اسلام کے بین الاقوامی تعلقات کے نظام پر مشتمل ایک پیش کش ہے بلکہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے لے کر خلافتِ عثمانیہ کے اختتام تک اسلامی ریاستوں کے دیگر اقوام کے ساتھ رواداری، خود داری، خود اعتمادی اور وفاداری سے آراستہ تعلقات دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ درج ہیں، اسلام کے نظامِ بین الاقوامی تعلقات کے جدید بین الاقوامی قانون کے ساتھ تقابل کے دوران کہیں کہیں انسانی حوالے سے بین الاقوامی تعلقات کی تصحیح کی تجاویز بھی دی گئی ہیں۔ اس میں دارالحرب، دارالاسلام، دار الصلح اور دارالعہد کی اصطلاحات کی وضاحت جدید پیرائے میں انداز سے کی گئی ہے۔ اسلام کی دینی اور سیاسی خصوصیات، بین الاقوامی تعلقات کے اسلامی اصول، زمانۂ جنگ میں بین الاقوامی تعلقات، حالتِ اَمن میں بین الاقوامی تعلقات، اسلام اور معاہدات وغیرہ اس کے اہم موضوعات ہیں۔